نگاہِ طائرانہ
(تبصرے، دیباچے، تنقیدی اشارے)
مظہر امام
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

نگاہِ طائرانہ

(تبصرے، دیباچے، تنقیدی اشارے)

مظہر امام

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

تبصرہ

NIGAH-E-TAAERANA
(Critical Appreciation)

by

Mazhar Imam

Year of Ist Edition 2007
ISBN 81-8223-255-4
Price Rs. 200/-

نام کتاب : نگاہِ طائرانہ (تبصرے، دیباچے، تنقیدی اشارے)
مصنف : مظہر امام
: 176-B, Pocket-1, Mayur Vihar, Phase-1
: Delhi-110091
: Ph: (011) 22756049, 65818283
سنِ اشاعت اوّل : ۲۰۰۷ء
قیمت : ۲۰۰ روپے
کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)
Ph: 23216162, 23214465 Fax: 91-011-23211542
E-mail: ephdehli@yahoo.com

کلیم الدین احمد

آل احمد سرور

اور

اسلوب احمد انصاری

کے نام

(ذاتی مراسم کی بنا پر)

نگاہِ طائرانہ

تبصرے

دیباچے

رائیں

کچھ اور رائیں

یہ کتاب

ان تحریروں کو اس کتاب میں کسی منصوبے کے تحت شامل نہیں کیا گیا ہے۔ انھیں کتابی شکل میں پیش کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اپنی بہت سی نامکمل اور کچھ اپنے خیال میں غیر اہم خامہ فرسائیوں کو سمیٹتے وقت یہ تحریریں بھی فائلوں میں نکل آئیں، اور تبصروں اور تقریظوں پر مشتمل بعض معتبر لکھنے والوں کے مجموعے جو حال ہی میں شائع ہوئے ہیں، ان سے تحریک ہوئی کہ اپنی ایسی تحریروں کو بھی یکجا کر دیا جائے جن میں شاید کچھ ادب دوستوں کے لیے دلچسپی کا سامان ہو۔

اپنے برگزیدہ معاصرین کا ذکر نہیں کرتا، خود میرے پاس گذشتہ بارہ چودہ سال کے دوران دیباچوں، تبصروں اور گرد پوش کے لیے تاثرات کی اتنی فرمائشیں آتی رہی ہیں اور آتی رہتی ہیں کہ اب ان کی تعمیل کرنے کے خیال سے ہی طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ میرے ایک عزیز نے کئی سال پہلے ایسی فرمائشوں کی تعمیل سے احتراز کرنے کے میرے رویہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کو اس کام میں تکلف کیوں ہے جب کہ اس طرح نام تو چھپتا ہی ہے۔ گویا نام چھپنا وسیلۂ شہرت ہے اور اس سے احتراز ایک طرح کفرانِ نعمت ہے۔ مجھے یہ بات اس وقت اچھی نہیں لگی تھی، لیکن اب دیکھتا ہوں کہ خاصے معروف حضرات بھی اپنا نام چھپا ہوا دیکھنے یا تعلق نبھانے/بنانے کے لیے یہ کام کر رہے ہیں۔ ان کی تحریریں خلوص اور ایمانداری سے عاری ہیں۔

اب سے پورے پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ مئو (اعظم گڑھ) کے ایک ادبی اجتماع میں شاہد صدیقی نے فراق اور احتشام حسین پر اعتراض کیا کہ انھوں نے بعض معمولی درجے کی کتابوں پر اتنے مبالغہ آمیز دیباچے لکھے ہیں کہ دوسرے بلند پایہ ادیب اور شاعر اُن کے نزدیک حقیر نظر آتے ہیں۔ اس کے جواب میں احتشام حسین نے کہا کہ دیباچہ یا تقریظ مصنف کی حوصلہ افزائی کے لیے لکھا جاتا ہے، اسے صحیح تنقید سمجھنا غلط ہے۔ میرا اپنا تجربہ دونوں طرح کا ہے۔ میں نے اسی حوصلہ افزائی کے پیش نظر کچھ نوجوان لکھنے والوں کی کتابوں کے دیباچے یا فلیپ لکھے۔ ان کتابوں کی اشاعت کو دس بارہ سال ہو چکے ہیں۔ وہ ان کی پہلی اور آخری کتاب ثابت ہوئی، اور ان کی اشاعت کے بعد وہ

رسالوں میں بھی کہیں نظر نہیں آئے۔ لیکن چند ایک ایسے نوجوان بھی ہیں جن کی ہمت افزائی رائیگاں نہیں گئی۔ میرے چند جملوں اور فقروں نے ان میں چھپی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور بروئے کار لانے میں معاونت کی اور آج ان سے توقعات وابستہ کی جارہی ہیں۔ اس طرح کی کچھ تحریریں اس کتاب میں شریک ہیں۔

اپنے زمانے کے نئے پرانے لکھنے والوں پر میں وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی شکل میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتا رہا ہوں۔ اس سلسلے میں اپنے چار مضامین کا ذکر بطور خاص کرنا چاہتا ہوں:

(۱) بہار میں اردو افسانہ: ۱۹۴۶ء کے آس پاس

(۲) مغربی بنگال میں اردو شاعری: آزادی کے بعد

(۳) جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا نیا مزاج

(۴) اردو شاعری: ۱۹۹۷ء کی

ان میں سے پہلے دو مضامین میرے مجموعے ''ایک لہر آتی ہوئی'' میں اور آخر الذکر دو مضامین میرے مجموعے ''تنقید نما'' میں شامل ہیں۔ ان مضامین میں جن ادبی شخصیتوں کے بارے میں رائیں دی گئی ہیں، وہ بہت مختصر بھی نہیں ہیں۔ اور بعض احباب نے کچھ آراء کو اپنے مجموعوں میں شائع بھی کیا ہے۔ مندرجہ بالا مضامین میں جن شخصیات پر قرار واقعی گفتگو کی گئی ہے، ان کے نام بالترتیب یہ ہیں:

(۱) محمد مسلم، محمد محسن، الیاس اسلام پوری، جمیل احمد کندھائی پوری، ش۔ مظفر پوری، علی اکبر کاظمی، آفتاب حسن، جمیل مظہری، شبلی براہیمی، اختر قادری، جی۔ آر۔ قیس شیخ پوری، عارف سُنہساروی، قیصر عثمانی، نظیر جمیلی، شیدا کیوروی، خیالی مہدولوی، ح۔ م۔ اسلم، رضیہ رعنا، انور عظیم، بدیع مشہدی، حسن امام درد، ضیا عظیم آبادی، نشاط الایمان، گربچن سنگھ، غیاث احمد گدی، زکی انور اور کلام حیدری۔

(۲) رضا علی وحشت، عباس علی خاں بیخود، میر محمود طرزی، شاکر کلکتوی، جرم محمد آبادی، آرزو سہارن پوری، پرویز شاہدی، اشک امرتسری، ابراہیم ہوش، سالک لکھنوی، رضا مظہری، حسن نجمی سکندر پوری، مضطر حیدری، ناظر الحسینی، مظہر انصاری، حرمت الاکرام، احسان در بھنگوی، علقمہ شبلی، سہیل واسطی، قیصر شمیم، رونق نعیم، اویس احمد دوراں، اصغر راہی، وکیل اختر، حامی گورکھپوری، اعزاز افضل، شہود عالم آفاقی، ظہیر ناشاد، غلام حسین ایاز، کامل اختر، عین رشید، خالق عبداللہ، شمیم انور، شاہین بدر، فاروق شفق، منور رانا، نعیم اشفاق، کمال جعفری، نصر غزالی، حبیب ہاشمی، حسن اثر، وحید عرشی، یوسف تقی، احسن شفیق، حسن عرفی، نور پیکر، اشہر ہاشمی، ف۔ س۔ اعجاز اور شہباز نبی۔

(۳) حامدی کاشمیری، حکیم منظور، مظفر ایرج، ہمدم کاشمیری، فاروق نازکی، رفیق راز، شجاع سلطان، عرش صہبائی، عابد مناوری، محمد یٰسین بیگ، پرتپال سنگھ بیتاب، اقبال فہیم، رخسانہ جبیں، خالد بشیر، ترنم ریاض اور فاروق مضطر۔ (ان کے علاوہ ۳۲ شعراء اور شاعرات کے کلام کے حوالے ہیں۔)

(۴) عادل منصوری، بلقیس ظفیر الحسن، اختر الایمان، پروین شاکر، وزیر آغا، عرفان صدیقی، حکیم منظور، ظفر گورکھپوری، رفعت سروش، ستیہ پال آنند، قیصر شمیم، غوث محمد غوثی، شین۔کاف۔نظام، سلیم آغا قزلباش، غلام مرتضٰی راہی، انیس انصاری، فرحت قادری، ناز قادری، رام پرکاش راہی، چندر بھان خیال، نعمان شوق اور خالد عبادی۔

میرے کچھ دیباچے اور تبصرے میرے مضامین کے مجموعوں میں بھی جگہ پا گئے ہیں۔ زکی انور، امجد نجمی اور قیصر عثمانی کی کتابوں کے لیے لکھے ہوئے دیباچوں کو میرے تیسرے مجموعۂ مضامین ''تنقید نما'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مخمور جالندھری کے مجموعۂ کلام ''جلوہ گاہ''، ڈاکٹر ممتاز احمد کی کتاب ''کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر''، ''صنم'' پٹنہ کے ''بہار نمبر'' اور کرشن چندر کی فلم ''سرائے کے باہر'' پر تفصیلی تبصرے میرے مضامین کے پہلے مجموعے ''آتی جاتی لہریں'' میں شامل ہیں۔

ان دنوں اردو رسالوں میں جو تبصرے شائع ہو رہے ہیں، ان میں سے ۹۹ فیصد اس لائق نہیں ہیں کہ انھیں پڑھا جائے۔ ان سے کوئی روشنی نہیں ملتی۔ کتاب کے بارے میں ایسی معلومات نہیں ملتیں کہ اصل کتاب دیکھنے کے لیے تجسّس پیدا ہو۔ عموماً یہ تبصرے رواروی میں سرسری طور پر لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ سرکاری رسالوں میں تبصرے یافت کے لیے لکھے جاتے ہیں، اور اکثر ایسے طلباء کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں جنھیں اپنے ضروری اخراجات کی کفالت کے لیے کچھ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ تبصرے کن رسیدہ پیشہ ور مبصروں کے بھی ہوتے ہیں۔ عصری ادب کے بارے میں ان کی واقفیت اور بھی کم ہوتی ہے۔

اب تو سو سال سے زیادہ ہوئے، شبلی نعمانی نے اپنے ایک مکتوب (بہ نام ایم۔ مہدی حسن، مورخہ ۸/ مئی ۱۸۹۰ء) میں تبصرہ نگاری کے ضمن میں کچھ باتیں کہی تھیں، جن میں سے دو جملے خاص طور پر توجہ طلب ہیں:

''مصنف کی بڑی پست فطرتی ہے کہ وہ لوگوں سے ریویو لکھنے کا شائق ہو۔''

''اگر کوئی شخص کسی معقول کتاب پر ریویو لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے تو ہر حالت میں اس کو لکھنا چاہیے۔''

ساتھ ہی شبلی نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ ریویو کوئی آسان چیز نہیں ہے، یہ ایک طرح کی جانچ پرکھ، ایک نوع کی قدر شناسی ہے۔

قدر شناسی کے نام پر کچھ لوگوں نے حق گوئی اور بے باکی کی سند حاصل کرنے کے لیے مصنف کی تذلیل اور تحقیر کو ضروری قرار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تنقید صرف ذوق کا ہی نہیں، ظرف کا بھی تقاضہ کرتی ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آج کل توصیفی مضامین لکھنے کی ایک ہوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے لکھنے والے پر مدحیہ مضامین کے مجموعے لگاتار شائع ہو رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بعض لکھنے والے قلم اور کاغذ سنبھالے بیٹھے رہتے ہیں کہ کب ''واپسی ڈاک سے نثر میں قصیدہ بھجوانے کی فرمائش'' آئے اور وہ شروع ہو جائیں —— چل مرے خامہ بسم اللہ۔

اب تو صورت یہ ہے کہ مصنف کی ایک کتاب شائع ہوتی ہے، اور اس کتاب کی بنیاد پر مصنف کے ''گوشے'' بھی شائع ہوتے ہیں اور اس کی ''شخصیت اور فن'' (؟) پر لکھے اور لکھوائے ہوئے مضامین کا ایک مجموعہ بھی منصۂ شہود پر آ جاتا ہے۔ اس طرح کے مضامین مجبوری، مروّت یا اخلاق کے تحت بادلِ ناخواستہ بھی لکھے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں احباب قلم برداشتہ کیسے لکھتے ہیں۔ میں تو ایسی چیزیں دل برداشتہ لکھتا ہوں۔

اس مجموعے میں شامل اپنی تحریروں (جو ۱۹۵۱ء سے ۲۰۰۵ء کے درمیانی عرصے یعنی پورے پچپن سال کے دوران لکھی ہیں) کی بابت صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ میں نے حتی الامکان معروضیت سے کام لیا ہے اور مبالغہ آرائی سے اجتناب برتا ہے، یعنی جتنا تبصرے اور خصوصاً دیباچے میں برتا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تو میرا بیان ہے۔ اس سے اتفاق یا اختلاف کا حق آپ کا ہے!

OO

۱ احسان دربھنگوی
۲ احمد عظیم آبادی
۳ اختر پیامی
۴ اختر قادری
۵ ارمان نجمی
۶ اسلم بدر
۷ اسلم عمادی
۸ اعزاز افضل
۹ اقبال عظیم
۱۰ امجد نجمی
۱۱ امین اشرف، سیّد
۱۲ اویس احمد دوراں
۱۳ برج پریمی
۱۴ پرویز شاہدی
۱۵ پریمی رومانی
۱۶ تقی رحیم
۱۷ تیغ الہ آبادی
۱۸ جگن ناتھ آزاد
۱۹ جمیل اختر
۲۰ حامدی کاشمیری
۲۱ حرمت الاکرام
۲۲ حسن چشتی
۲۳ حمید الماس
۲۴ خورشید سمیع
۲۵ خیر بھوروی
۲۶ ذی شان فاطمی
۲۷ راشد آذر
۲۸ رضا نقوی واہیؔ
۲۹ زاہدہ زیدی
۳۰ زبیر رضوی
۳۱ سعید سہروردی / بھگوتی چرن ورما
۳۲ سلیمان ڈوپلے
۳۳ سلیم قدوائی
۳۴ شاہد احمد شعیب
۳۵ شکیل الرحمٰن
۳۶ شمس الدین عازم
۳۷ صابر دت
۳۸ صالحہ عابد حُسین
۳۹ عالم خورشید
۴۰ عبد الصمد
۴۱ علی جواد زیدی
۴۲ ف.س.اعجاز
۴۳ فصیح الدین بلخی
۴۴ فضا ابن فیضی
۴۵ فضیل احمد
۴۶ کرشن موہن
۴۷ کرناٹک اُردو اکیڈمی
۴۸ کلام حیدری
۴۹ کلام حیدری
۵۰ کلیم عرفی
۵۱ مبارزالدین رفعت
۵۲ مجتبیٰ حُسین
۵۳ محمد طفیل
۵۴ محمد منظور احمد
۵۵ مظفّر حنفی
۵۶ مظفّر مہدی
۵۷ معین شاہد
۵۸ نامی انصاری
۵۹ نثار احمد صدّیقی
۶۰ نجم الدین شکیب / عبدالمنعم النّمر
۶۱ نریش کمار شاد
۶۲ نریش کمار شاد
۶۳ نسیم اختر
۶۴ نظیر صدّیقی
۶۵ نظیر صدیقی
۶۶ نقی احمد ارشاد
۶۷ نقی احمد ارشاد
۶۸ نورجہاں ثروت
۶۹ وامق احمد مجتبیٰ (وامق جونپوری)
۷۰ ہربنس سنگھ دوست
۷۱ ہربنس سنگھ دوست

شہرِ آرزو
احسان دربھنگوی

احسان دربھنگوی ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنی بے نیازی کو لذّت اندوزی کا ذریعہ بنالیا ہے۔ انھیں کبھی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروانہیں رہی۔ شاعری اُن کے لیے اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرنے اور رُوحانی مسرّت حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ انھیں اس سے دلچسپی نہیں کہ وہ شاعری میں کوئی اپنا رنگ پیدا کریں یا اپنی انفرادیت منوانے کی کوشش کریں۔ یہی ان کی کمزوری ہے اور یہی ان کی طاقت بھی۔ کمزوری اس لیے کہ وہ اپنے استاد اور بزرگ جمیل مظہری کے رنگ میں کچھ اس حد تک رنگ گئے کہ خود ان کے کلام کا حسن بہت سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا، اور طاقت اس لیے کہ ان کی شاعری میں جو ایک فطری والہانہ پن، ربودگی، احساس کی شدّت اور جذبے کا خلوص ہے، وہ اسی لیے شاداب رہا کیونکہ انھوں نے ناقد اور قاری کی جانب غیر ضروری نیازمندی نہیں دِکھائی۔ ''شہرِ آرزو'' انھیں کا مجموعہ کلام ہے۔

احسان دربھنگوی ایک نہایت خوش گو شاعر ہیں۔ اچھی شاعری عموماً نقادوں کی نگاہ اور سر سے اُونچی جاتی ہے، اس لیے اگر احسان دربھنگوی کو وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ مستحق ہیں تو ہمیں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ احسان دربھنگوی کا یہ شعر اکثر میری زبان پر ہوتا ہے:

وقتِ رخصت نہ مجھے دیدۂ تر سے دیکھو
اِک مجاہد کو مجاہد کی نظر سے دیکھو

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شناخت کے لیے بس یہی ایک شعر کافی ہے۔ البتہ اس کا سنِ تخلیق مجموعے میں

۱۹۵۲ء بتایا گیا ہے جو درست نہیں معلوم ہوتا۔ اگر اس مطلع کی شانِ نزول بقول اویس احمد دوراں یہ ہے کہ اثر مجیدی کے کلکتہ سے ڈھاکہ جانے کے موقع پر کہا گیا تھا، تو پھر یہ ۱۹۵۴ء سے پہلے کا شعر نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح یہ غزل:

یہ سوچ رہا ہوں توڑ کے خُم بیدار کروں میخانے کو

جس پر سنہ تخلیق ۱۹۶۰ء درج ہے، دراصل ۱۹۵۵ء میں کہی گئی تھی۔

احساں دربھنگوی کے چھوٹے بھائی اویس احمد دوراں نے جو خود ایک معروف ترقی پسند شاعر ہیں، ''میرے بھیّا'' کے عنوان سے کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے جس سے احساں دربھنگوی کی شخصیت کے خدوخال اُجاگر ہوتے ہیں اور ان کی شاعری کے محرکات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ احساں دربھنگوی کی کسرِنفسی، دوست نوازی، بغیر لاگ لپیٹ کے زندگی کرنے کی روش، ان کی شخصیت کو دلکشی اور ان کی شاعری کو آب و رنگ عطا کرتی ہیں۔ جس مجموعے میں اس نوع کے اشعار ہوں، اس کے معتبر ہونے میں کسے کلام ہوسکتا ہے:

اے شمع میری طرح شرارے اُگل کے دیکھ
مجھ سے مقابلہ ہے تو دن کو بھی جل کے دیکھ

بڑی مشکلوں سے کاٹا، بڑے کرب سے گزارا
ترے بعد کوئی لمحہ جو ملا مجھے خوشی کا

اگرچہ صحرائے زندگی میں کوئی مرا ہم سفر نہیں ہے
مگر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ تم مرے ساتھ آرہی ہو

لاکھ تم بجُھا ڈالو اپنے سب شرر احساںؔ!
لوگ تو کریدیں گے، راکھ ہی سہی دل میں

اِک لڑائی تو بہرحال لڑوں گا اے دوست!
جان جائے یار ہے، جیت اِدھر ہو یا اُدھر

''شہرِ آرزو'' کی نظموں میں ''فسانۂ آدم''، ''داستانِ ناتمام'' اور ''التجا'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(''آجکل'' دہلی، مارچ ۱۹۹۰ء)

سازینہ

احمد عظیم آبادی

احمد عظیم آبادی کا نام خصوصی حلقوں میں جانا پہچانا ہے۔ ان کا کلام، ان کی طباعی اور ان کے فنی شعور کا غماز ہے۔ افسوس ہے کہ ان کی بے نیازی کے باعث ان کا کلام عام لوگوں تک نہیں پہنچ سکا، ہر چند کہ انھیں جمشید پور کارخانے کے مزدوروں کے محبوب شاعر ہونے کا فخر حاصل ہے۔

اب ان کی نظموں، غزلوں اور رُباعیوں کا ایک مجموعہ "سازینہ" کے نام سے شائع ہوا ہے جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ احمد عظیم آبادی ایک پُرگو شاعر ہیں اور ان کا سرمایۂ کلام اتنا مختصر نہیں ہے جتنا مختصر ان کا مجموعہ ہے۔

احمد عظیم آبادی کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نوجوان شعراء میں ایک ممتاز اور بلند مقام کے مستحق ہیں۔ آپ کے رجحانات صحت مندانہ ہیں اور آپ موجودہ دَور کے ایک مشہور مفکر کی اس رائے سے متفق ہیں کہ "فن کار انسانی رُوح کا معمار ہوتا ہے۔" آپ "مواد کی فن کارانہ پیشکش" پر زور دیتے ہیں۔ ہر چند آپ کے کلام میں فن اور زبان کی معمولی فروگذاشتیں موجود ہیں، لیکن فلسفیانہ اندازِ فکر اور شدّتِ احساس کی آمیزش ان کے کلام کو باوقار بناتی ہے۔ "شکستِ فریب"، "مجبوریاں"، "ٹوٹے ہوئے تارے"، "سپردگی" وغیرہ بہت کامیاب نظمیں ہیں۔ غزل کے چند اشعار دیکھئے:

اپنی موہوم تمنائیں بھی شاداب ہوئیں
ہم سرابوں سے چلے موجِ رواں تک پہنچے

قافلے زیست کے ہر سمت ہیں سرگرمِ سفر
دیکھنا اب ہے یہی، کون کہاں تک پہنچے

صاحبِ دار و رسن! دار و رسن کی سوگند
ہاتھ میرا نہ کہیں تیغ و سناں تک پہنچے

مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ شعر و شاعری کا عمدہ ذوق رکھنے والے افراد میں کافی مقبولیت حاصل کرے گا۔

(ماہنامہ "معاون" کلکتہ، مئی ۱۹۵۵ء)

تاریخ

اختر پیامی

اختر پیامی آزادی کے آس پاس ایک نہایت ہونہار ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے ادب میں اپنی جگہ بنا رہے تھے کہ بعض ذاتی حالات کی بنا پر وہ مشرقی پاکستان ہجرت کر گئے۔ وہاں وہ ریڈیو اور صحافت سے وابستہ رہے اور شعر و شاعری سے آہستہ آہستہ تائب ہوتے گئے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد انھیں دوسری ہجرت کرنی پڑی اور اب وہ کراچی میں انگریزی روزنامہ "ڈان" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

میرے نزدیک اختر پیامی کی نظمیں ترقی پسند شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ ان کی طویل نظم "تاریخ" سردار جعفری کی "نئی دُنیا کو سلام" اور ساحر لدھیانوی کی "پرچھائیاں" کی درمیانی کڑی ہے۔ ترقی پسند دَور کی یہ تین نظمیں مستقل اہمیت کی حامل ہیں۔ اختر پیامی کی نظم سردار کے بعد اور ساحر سے پہلے کہی گئی، اور یہ کتابی صورت میں ایک طویل عرصے تک شائع نہیں ہوئی۔ "مورچہ" گیا میں ۱۹۶۳ء میں کلام حیدری نے اسے قسطوں میں چھاپ کر محفوظ تو کر دیا لیکن یہ وہ دَور تھا جب ترقی پسندی اپنا وزن و وقار کھو چکی تھی، اور پھر ایک ہفتہ وار میں قسطوں میں نظم پڑھ کر کوئی کیا تاثر قائم کرتا! جابر حسین نے نظم کی تخلیق کے ۴۶-۴۷ سال بعد اس کی اشاعت کا اہتمام کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس نظم کا ایک حصہ میں نے بہار ریاستی اُردو کانفرنس کے مشاعرے میں اختر پیامی کی زبان سے سنا تھا جو پٹنہ میں ۱۹۵۱ء کے وسط میں منعقد ہوا تھا۔ یہ نظم اسی زمانے میں کہی گئی تھی جیسا کہ اختر پیامی نے مجھے بتایا تھا۔

سردار جعفری نے اپنی نظم "نئی دُنیا کو سلام" ۲۸ ستمبر ۱۹۴۶ء کو مکمل کی تھی۔ کتابی صورت میں ۱۹۴۷ء کے نصف آخر میں شائع ہوئی۔ اس نظم کے آخری حصے کا عنوان "حرفِ آخر" ہے۔ دراصل یہ اپنی جگہ مکمل نظم ہے اور پہلی بار "ادبِ لطیف" لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی — "شاہراہِ حیات" کے عنوان سے۔ یوں بھی یہ سردار جعفری کی پہلی نظم تھی جو تقسیم سے پہلے پنجاب کے کسی رسالے میں شائع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب واشگاف انداز میں لکھی ہوئی ترقی پسندانہ نظمیں، پنجاب کے ادبی رسائل چھاپنا پسند نہ کرتے تھے۔ ان رسائل میں فیض، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، ندیم، ساحر، ظہیر کاشمیری تو شائع ہوتے تھے مگر سردار جعفری، کیفی اعظمی وغیرہ کو ان میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ صرف مخدوم کی ایک نظم ۱۹۴۲ء میں "ادبِ لطیف" میں شائع ہوئی تھی۔ خیر، یہ بات تو ضمناً زیرِ تحریر آ گئی۔ سردار جعفری کی نظم "شاہراہِ حیات" یا "حرفِ آخر" کی زمین اور بحر میں اختر پیامی کی نظم "تاریخ" میں بھی اشعار ملتے ہیں

جو ظاہر ہے سردار کے زیرِ اثر ہے۔ لیکن آپ دونوں نظموں کے اشعار دیکھیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ سردار کے یہاں ایک براہِ راست اندازِ بیان اور ایک حد تک نثریت ہے لیکن اختر پیامی کے اشعار زیادہ بالیدہ شعری شعور کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ حسن آفرینی ہے۔ استعارہ اور پیکر کا تخلیقی استعمال بھی ہوا ہے۔ نظم پڑھتے ہوئے تاریخ سے زیادہ فطرت اور زندگی سے قربت و موانست کا احساس ہوتا ہے۔ مثالوں سے بات واضح ہو جائے گی۔

سردار جعفری

یہ آدمی کی گزرگاہ، شاہراہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اُٹھائے ہوئے
ادھر سے گزرے ہیں چنگیز و نادر و تیمور
لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلائے ہوئے
غلاموں اور کنیزوں کے کارواں آئے
خود اپنے خون میں ڈوبے ہوئے نہائے ہوئے
شکستہ دوش پہ دیوارِ چین کو لادے
سروں پہ مصر کے اہرام کو اُٹھائے ہوئے
سفید قوم کے عیار تاجروں کے گروہ
فریب و مکر سے اپنی دُکاں سجائے ہوئے

اختر پیامی

یہ آسماں کی بلندی ، زمین کی پستی
یہ ماہتاب سے انساں نظر بچائے ہوئے
قدم قدم پہ یہ گلچیں کی فاتحانہ نگاہ
کلی کلی کو سیہ پیرہن پنہائے ہوئے
یہ آبشار میں زندہ لہو کے فوارے
یہ شاہراہوں پہ انساں کے سر سجائے ہوئے
یہ زرد سکوں میں تلتی ہوئی متاعِ حیات
یہ موت زیست کی اُونچی دُکاں لگائے ہوئے
یہ زندگی کے سہمتے ہوئے اُداس دیے
مہیب و تند ہواؤں میں جھلملائے ہوئے

دونوں نظموں کا یا دونوں نظموں کے متعلقہ حصوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ شعری حُسن کس میں کتنا ہے!

سردار جعفری کی نظم میں ایک خوبصورت حصہ وہ سمجھا جاتا ہے جس کا عنوان ''زندگی کا ترانہ'' ہے اور جس میں ہر تیسرے مصرعے کے بعد اس شعرے کی تکرار ہوتی ہے:

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

اس کا پہلا بند دیکھئے:

ہوائیں مشک بار ہیں فضائیں زرنگار ہیں
اُفق کے کوہسار میں شفق کے آبشار ہیں
نجومِ شاخِ کہکشاں فلک کے برگ و بار ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

اور اب اختر پیامی کی نظم سے اسی بحر میں کہے ہوئے یہ چند اشعار دیکھئے۔ یہ ''زندگی کا رقص'' ہے:

یہ رقص جیسے زندگی چٹان سے اُبل پڑے
یہ رقص جیسے میکدہ پہ ابر جھومنے لگے
یہ رقص یا ہوا میں جیسے گیسوؤں کی برہمی
یہ رقص جیسے ڈوب کر اُبھر رہی ہو چاندنی
یہ رقص جیسے عرش کی طناب جھومنے لگے
یہ رقص جیسے جبرئیل راہ بھولنے لگے
یہ رقص، رقصِ زندگی، یہ رقص، رقصِ کائنات
یہ رقص صبحِ ضوفشاں، یہ رقص اِک سیاہ رات
یہ رقص ہے کہ اضطرابِ زندگی کا عکس ہے
یہ رقص ہے کہ روشنی میں روشنی کا عکس ہے

بقول شکیل الرحمٰن ''حرف وصوت کے حسن کی وجہ سے تجربہ کتنا دلکش، پُراثر اور پُرکشش بن گیا ہے۔'' جہاں سردآر کے یہاں ''اگر کوئی بہشت ہے......'' کی پندرہ بار تکرار گراں گزرنے لگتی ہے، وہاں اختر پیامی کی نظم میں ''یہ رقص'' کی تکرار ایک لطیف احساس جگاتی ہے۔

سردار جعفری کی طویل تمثیلی ڈرامائی نظم ''نئی دُنیا کو سلام'' سے اختر پیامی کی تمثیلی، تاریخی نظم ''تاریخ'' کا تقابلی موازنہ نہ میرا مقصد نہیں، ہر چند یہ تقابلی مطالعہ بھی اپنی جگہ دلچسپ ہے۔ سردار جعفری کی نظم متفقہ طور پر ایک بڑی نظم ہے۔ اس کے مقابلے میں ''تاریخ'' اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود ایسی نظم ہے جو قارئین کے بڑے حلقے تک پہنچی نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسے بھی اُردو کی بہت اچھی ترقی پسند نظموں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ اُردو میں ترقی پسند شاعری کی تاریخ اختر پیامی کی نظم ''تاریخ'' کے حوالے کے بغیر نامکمل ہے۔

(سہ ماہی ''روشنائی'' کراچی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء)

📖

سرودِ نو

اختر قادری

پروفیسر اختر قادری سے نہ صرف یہ کہ میں نے کالج میں تعلیم حاصل کی ہے، بلکہ اپنی شاعری کے ابتدائی دَور میں ان کے مشوروں سے مستفید بھی ہوا ہوں۔ اس لیے ان کے مجموعۂ کلام ''سرودِ نو'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جہاں یک گونہ مسرّت ہو رہی ہے، وہاں یہ خوف بھی دامن گیر ہے کہ شاید میں اپنی ''عصبیت'' کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکوں۔

اختر قادری ایک ذی علم شاعر ہیں۔ وہ فن برائے فن کے کبھی قائل نہیں ہوئے اور اپنے شعور کی رہنمائی میں شعر کہتے رہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''میں نے شعر گوئی کی طرف کبھی کوئی خاص توجّہ نہیں کی۔'' لیکن انھیں فن اور زبان پر ایسے متعدد شاعروں سے کہیں زیادہ قدرت حاصل ہے، جنھوں نے شعر و شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔

اقبالؔ کی شاعری نے ان کے افکار و خیالات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ:

افکار میں اقبالؔ کا شیدائی ہوں

اس اثر نے انھیں فائدہ بھی پہنچایا ہے اور نقصان بھی۔ ان کی چند نظمیں، جن میں اقبالؔ کا تتبع نمایاں ہے، بڑی گراں گزرتی ہیں اور ان کی انفرادیت کو مجروح کرتی ہیں۔ یوں بھی ایسی نظموں کی اپیل ایک خاص فرقے تک محدود رہ جاتی ہے۔

''سرودِ نو'' اختر قادری کے کلام کا ایک دلآویز مجموعہ ہے۔ اس میں ۳۱ نظمیں، ۳۳ غزلیں، ۵ رُباعیات

اور ۶ قطعات کے علاوہ کہیں کہیں متفرق اشعار بھی درج ہیں۔

اختر قادری کی توجہ مفرط سانیٹ کی طرف ہے۔ ۳۱ شامل شدہ نظموں میں سے دس سانیٹ ہیں۔ اُردو میں ایک تھوڑے عرصے کے لیے بحیثیت صنفِ سخن سانیٹ نے بھی کافی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ اکثر شعراء نے سانیٹ کی صنف میں طبع آزمائی کی لیکن خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ اختر شیرانی نے کافی تعداد میں سانیٹ لکھے جن میں سے اکثر ناکام ہیں، پھر بھی انھیں اُردو کا سب سے بڑا ''سانیٹ نگار'' سمجھنا چاہیے۔ شاید اختر شیرانی کے بعد اختر قادری ہی واحد شاعر ہیں جنھوں نے سانیٹ کی تکنیک کو کمال خوبی سے وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ کم از کم اسی لحاظ سے ''دو اختروں'' کو اُردو دُنیا یاد رکھے گی۔

''سرودِ نو'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اختر قادری کے اصلی جوہر نظموں میں ہی کھلتے ہیں۔ نظموں کے مقابلہ میں ان کی غزلیں زیادہ کامیاب نہیں ہیں، ویسے چند بہت اچھے اشعار بھی مل جائیں گے:

وائے تقدیر قفس کا بھی سہارا نہ رہا
آشیاں لٹنے پہ صیاد نے آزاد کیا

رُودادِ عشق اپنی عجیب و غریب ہے
دل اس کو ڈھونڈتا ہے جو دل کے قریب ہے

یا پھر یہ شعر جو محاکاتی شاعری کا دلکش نمونہ ہے:

جھجکے، کھنچے، کھڑے ہوئے، سن کر بیانِ شوق
پھر مسکرا کے بیٹھ گئے بانکپن سے دُور

اختر قادری کی کامیاب نظموں میں ''یہ دُنیا''، ''شیوۂ مردانہ گیر''، ''عزمِ منزل''، ''اے دوست''، ''ایک انگارہ'' اور ''نئی بہار'' قابلِ ذکر ہیں ـــ ''بوس و کنار'' غزل کی تکنیک میں لکھی ہوئی ایک ولولہ آفریں نظم ہے۔ مگر نامناسب عنوان نے تاثر کو کم کردیا ہے۔ ''کلیدِ آرزو'' دراصل ایک قطعہ ہے جسے بہرۂ نظم میں شامل کرلیا گیا ہے۔

اختر قادری کی نئی غزلوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بعض ترقی پسند شاعروں کی طرح سیاسی اور سماجی افکار کو ''براہِ راست'' غزل کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں کہی جاسکتی:

یہ رنگ و نسل و قوم و وطن کی کشاکشیں
انسانیت کہاں گئی، انساں کو کیا ہوا؟

ابنِ بشر میں اور یہ خوئے درندگی
خلق وکرم، مروّت واحساں کو کیا ہوا؟

اس پوری غزل میں اسی طرح کے اشعار ہیں۔ اگر اسے اور ایک دوسری غزل ''مژدہ اے اہلِ وطن! ہندوستان آزاد ہے'' کو بہرۂ نظم میں شامل کرلیا جاتا تو غلط نہ ہوتا۔

اثرؔ لکھنوی کا مقدمہ شاملِ کتاب ہے، جس میں انھوں نے اخترؔ قادری کی شاعری کی بابت اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ''تعارف'' میں عطاؔ کاکوی نے تفصیل کے ساتھ اخترؔ قادری کے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے بعد ان کے شعری محرکات ومہیجات اور ان کے شعور فن سے بحث کی ہے۔ پروفیسر محمد مسلم نے بھی اپنے مضمون میں ان کی شاعری کے خدوخال کو اُجاگر کیا ہے۔

مقدمہ اور دیگر مضامین ۵۶ صفحات کو محیط ہیں۔ کلام کا حصہ پورے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ دربھنگا سے چھپی ہوئی اس کتاب کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جِلد مضبوط اور عمدہ ہے۔ شاعر کی تصویر بھی زیبِ کتاب ہے۔ کاشانۂ ادب، لہریا سرائے، دربھنگا نے یہ مجموعہ شائع کیا ہے۔ ملنے کا پتہ بھی وہی ہے۔ قیمت ساڑھے تین روپے کچھ نامناسب نہیں، لیکن اگر تین روپے ہوتی تو بہتر تھا۔

یہ سطور اپنے ''خوف'' پر قابو پاکر لکھی گئی ہیں۔

(ماہ نامہ ''سہیل'' گیا، ستمبر ۱۹۵۷ء)

مُردہ خوشیوں کی تلاش

ارمانؔ نجمی

ارمانؔ نجمی نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ''مردہ خوشیوں کی تلاش'' بغیر کسی تعارف، تمہید یا مقدمہ کے پیش کیا ہے۔ اس سے شاعر کی خود اعتمادی کا اظہار ہوتا ہے اور ایک نوع کی بے نیازی کا بھی۔ یہ شاعر کے شعری کردار کے خلوص کی دلیل بھی ہے۔

مجموعے کا آغاز ایک دُعائیہ نظم سے ہوتا ہے جس کی اختتامی سطریں یوں ہیں:

تیرے ہاتھوں میں ارض وسما
خوف کی سلطنت سے بچا

مجھے میرے ہونے کا مژدہ سُنا

اے خدا!

اس دُعا کے علاوہ اس کتاب میں ۲۹ نظمیں اور ۴۳ غزلیں شامل ہیں۔ ''مُردہ خوشیوں کی تلاش'' ایک نظم کا عنوان ہے۔ یہ نظم ایک نجی واردات کا نوحہ ہے۔ ارمان نجمی کے اس ذاتی غم نے ان کے یہاں حزن و یاس کی ایک ایسی کیفیت پیدا کردی ہے جو ایک برقی رو کی طرح اُن کے سارے کلام میں جاری و ساری ہے۔ زندگی کی شکستوں کو سینے سے لگائے، خالی پن کا وار سنبھالے وہ رنج و محن کو فکر و فن کی نغمگی میں ڈھالتے رہتے ہیں۔

''منفعت بخش مصروفیت کے شکنجے'' میں رہنے کے باوجود ارمان نجمی جذبہ و احساس کی ایسی پُراثر شاعری کر لیتے ہیں جو فی زمانہ کم کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس مجموعے کی غزلیں قدم قدم پر تازگی اور سادگی میں پُرکاری کا احساس دلاتی ہیں۔ ان میں غزل کی مسلّمہ روایت کا پورا احترام بھی ہے، لیکن اسلوب جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

ارمان نجمی کی غزلوں کے بعض اشعار میں اکہراپن محسوس ہوتا ہے، ہر چند ایسے اشعار میں بھی معنوی تہیں دریافت کی جاسکتی ہیں۔ ارمان نجمی نے اپنے کلاسیکی سرمائے سے پوری طرح کسبِ فیض کیا ہے اور نئے احساس اور تجربے کو پیش کرتے ہوئے اُنھوں نے کہیں ایسی لفظیات کا سہارا نہیں لیا، جن سے صوتی آہنگ متاثر ہوتا ہو اور جو سماعت کی جمالیات کو مجروح کرتی ہوں۔ ان کی شاعری بنیادی طور پر جذبے اور احساس کی شاعری ہے، لیکن وہ اپنے آپ پر قابو رکھنا بھی جانتے ہیں۔ ایک خاص ضبط جو جذبے کے وفور کو اپنے دامن میں چھپالیتا ہے، ارمان نجمی کے کلام کو ایک سنجیدگی اور وقار عطا کرتا ہے۔ ان کے کلام میں پیچیدگی نہیں، غیر ضروری اشکال نہیں۔ اس لیے ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ آج کے کم کوش ناقدین جو بات بات میں ابہام، علامت، استعارہ سازی اور پیکر تراشی کی دُہائی دیتے ہیں، انھیں خوش کرنے کے لیے ارمان نجمی نے کوئی شعوری کوشش نہیں کی۔ ان کی زبان بول چال کی زبان سے قریب ہوتے ہوئے اور ظاہری آرائش سے بڑی حد تک عاری ہوتے ہوئے بھی شعری زبان ہے۔ ضبط، نرمی اور تفکر کے امتزاج سے ارمان نجمی کی شاعری بارآور ہوئی ہے۔ شعری مجموعوں کی بھیڑ میں ''مُردہ خوشیوں کی تلاش'' کو الگ سے پہچانا جاسکتا ہے۔

(''آج کل''، دہلی، جنوری ۱۹۸۹ء)

کُن فیکون

اسلم بدر

بہت دِنوں کے بعد ایک ایسا شعری کارنامہ معرضِ وجود میں آیا ہے جو فکر وفن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔
آج کے اکثر شعراء اُردو شاعری کی مسلّمہ اصناف سے غفلت برت رہے ہیں اور ان کی جگہ سہل پسندانہ طرزِ اظہار کو راہ دے رہے ہیں۔ مثنوی ہماری ایک نہایت قابلِ قدر صنف ہے اور اس سے ہمارے شعراء نے ماضی میں بڑا کام لیا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ جمیل مظہری کی مثنوی ''جہنم سے'' اور شمس عظیم آبادی کی مثنوی ''حیات وکائنات'' کے بعد کوئی قابلِ ذکر مثنوی منظرِ عام پر آئی ہو۔ ہاں، دورِ حاضر کے سرکردہ شاعر قاضی سلیم کی ایک طنزیہ مثنوی ''باغبان وگل فروش'' پندرہ سولہ سال پہلے ۱۹۸۷ء میں چھپی تھی، مگر ہمارے ناقدوں کی بے توجہی شاملِ حال رہی۔ شمس عظیم آبادی کی مثنوی کا تھوڑا بہت چرچا ہوا۔ جمیل مظہری کی مثنوی ''جہنم سے'' بہت کم لوگوں تک پہنچی، اور اب تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی ہے۔
اسلم بدر کی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کا میں ہمیشہ قائل رہا ہوں۔ وہ مشاعروں کے بھی بے حد مقبول شاعر رہے ہیں، اور شاید مشاعروں کی یہی مقبولیت ان کی ادبی شناخت میں حارج رہی۔ اس کی دوسری وجہ، میری دانست میں، ان کا اُردو کی مین اسٹریم (mainstream) سے دُور ہونا ہے۔ جمشید پور اُردو کی مین اسٹریم میں شامل نہیں ہے، اس لیے ادبی اشرافیہ (elites) کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی۔ اسلم بدر ہی نہیں، وہاں کے کئی اچھے شاعر ہمارے ناقدینِ ادب کی توجہ سے محروم رہے ہیں۔ بہر حال، تخلیق کار وقتی شہرت اور پذیرائی سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ اپنی آگ میں جلنے اور پگھلنے کو معتبر قرار دیتا ہے۔ اسلم بدر نے دو ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی ''کُن فیکون'' پیش کر کے بلاشبہ اُردو مثنوی کی تاریخ میں اضافہ کیا ہے۔

مثنوی ''کُن فیکون'' حیات وکائنات کے مسائل سے گفتگو کرتی ہے اور مختلف مذاہب اور ادیان کے فلسفہ اور پیغام کو زیرِ بحث لاتی ہے۔ اسلم بدر نے مذاہب کے عقائد اور نظریات کو بلا امتیاز وترجیح پیش کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اپنے سائنسی شعور کو ہر جگہ ہم قدم رکھا ہے۔ کوئی فلسفہ آخری اور حتمی نہیں ہوتا، لہٰذا فکر کی بھی کوئی منزل نہیں ہوتی۔

یہ مثنوی اس لائق ہے کہ اس پر مکالمہ قائم ہو، اس پر مذاکرے کیے جائیں۔ ہمارے یہاں شاعری

نے فکر منہا ہوتی جارہی ہے۔ اس اعتبار سے سے بھی اس مثنوی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ جسے ہم ''فکری شاعری'' سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا اعلیٰ معیار دیکھنا ہو تو مثنوی ''کُن فیکون'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اجنبی پرندے

اسلم عمادی

اسلم عمادی کے دوسرے مجموعہ کلام ''اجنبی پرندے'' کی ابتدا ایک نعت سے ہوتی ہے:

بزمِ ہستی میں جسم و جاں تجھ سے
وقت و آب و ہوا رواں تجھ سے
یا محمدؐ زبانِ اسلم میں
عشق تیرا ہے ہم زباں تجھ سے

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلم عمادی انجینئر ہونے اور سائنسی مزاج رکھنے کے باوجود مذہب سے بیگانہ نہیں۔ اس مجموعے کی دوسری نظم ''ہوائیں کھول خداوند'' سے بھی یہی تاثر قائم ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں ایک اور نظم بھی ہے — ''ایک ادھوری حمد'' اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلم عمادی خدا اور رسول کا احترام کرتے ہیں، ان سے اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں اور یہ مذہب سے ان کی قربت کا اظہار ہے، لیکن ان کی شاعری میں مذہب کے نام پر ماضی سے غیر ضروری رشتہ استوار کرنے کا کوئی رجحان موجود نہیں۔ چونکہ ان کا تعلق سائنس اور انجینئرنگ سے ہے، اس لیے ان کے کلام میں سائنسی عقلیت پسندی کی جھلکیاں صاف دِکھائی دیتی ہیں۔ سائنسی علامتوں اور اصطلاحوں کا استعمال بھی ان کے یہاں ملتا ہے، جس سے کبھی کبھی ثقالت پیدا ہوتی ہے:

پیلی کمانیں ٹوٹ کر ایسے تھرک اُٹھیں
کہ جیسے سنگریزوں میں
شعاعِ سبز در جائے!
کئی جوہر مثالِ آب ان کا انعطاف ایسے کریں
جیسے ہوا میں اور پانی میں

بھی کوئی سالماتی فصل ہے یا ربط ہے

اور:

مگر ہر ایک راہی، اِک خلائی پمپ ہے
خالی شدہ بوتل کی صورت
کھڑکھڑاتا — رہگزر پر
بس اسی صورت گزرتا ہے
کہ جس صورت میں آیا تھا

نظر پس ماندہ ہو کر
محدّب عدسے کے پانی میں کھو جائے

ان کی ایک نظم ''آرزو ٹوٹی ہوئی شاخ پر'' میں سائنس کا علم یوں جلوہ دِکھاتا ہے:

بے کار ہے عبادت خلا میں — نور خلا کی
خلا میں ذرّات ہیں نہ نور ریزے کہ اتصال سے پہلے کوئی لہر
بے چاری ایتھر نفی کا زہر پی کر نیلی
اور اگر کوئی باز گشت کہیں سے آتی ہوئی محسوس ہو
تو وہ کثافت ہے

شاعری نہ تو مذہبی عقیدت کا نام ہے اور نہ سائنسی عقلیت پسندی کا۔ الفاظ کو ذرا الگ ڈھنگ سے برتنے سے بھی شاعری کے تقاضے پورے نہیں ہو جاتے۔ میرا خیال ہے کہ اسلم عمادی اس نکتے سے ناواقف نہیں۔ اس لیے وہ کہیں کہیں اپنی نظموں کو درجۂ اعتبار بخشنے میں کامیاب ہوئے ہیں:

مجھے معلوم تھا
ہر راستہ تجھ تک ہی جائے گا

اسلم عمادی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں، لیکن اُنھوں نے غزلیں بھی خاصی تعداد میں کہی ہیں۔ ان کی اکثر غزلوں میں انھیں کی نظموں کی سی ثقالت اُبھر آئی ہے۔ اسلم عمادی اضافتوں سے بھی خصوصی دلچسپی دِکھاتے ہیں جبکہ آج شعری زبان زیادہ صاف اور سادہ ہوتی جا رہی ہے:

خیالِ موجۂ تندِ بہار لے آئے

یا

آنسو شریکِ گرمیٔ حرفِ دُعا رہے

کئی غزلوں کو پڑھتے وقت معاصرین کی غزلوں کے اشعار کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ کہیں کہیں خیال کی تکرار گراں گزرتی ہے:

تُو اگر چاند ہے اے نور نژاد — اپنے آنگن میں اُترتا دیکھوں
تُو اگر غنچہ ہے اے حسن مشام — اپنے باغیچے میں کھلتا دیکھوں
تُو اگر شعلہ ہے اے برق صفت — اپنے سینے میں اُترتا دیکھوں
تُو اگر شمع ہے اے بزم آرا — اپنے گھر میں تجھے تنہا دیکھوں

لفظ کی تکرار سے مزید تکدّر پیدا ہوتا ہے:

اب کوئی حرف میں کہوں بھی نہیں
اور کوئی بات اب سنوں بھی نہیں

ایسے شعر کم ہی ملتے ہیں، جن پر نگاہ رُک جائے۔ لیکن اچھے اشعار کی موجودگی سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا:

خدا سے میرا تعلق ہے گر تو اتنا ہے
کہ اس کو میں نے بھی دیکھا ہے پاس آتے ہوئے

نظر لگی ہے فلک سے نہ جانے کس لمحہ
ہمارا چاند شبِ انتظار لے آئے

ساحل پہ اُڑنے والے پرندے بھی کھو نہ جائیں
اے چشمِ پرامید ! ترا آسرا رہے

"کچھ نثر میں" کے عنوان سے اسلم عمادی نے مجموعے کے آخر میں مختصراً اپنی شاعری کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ تکلف بھی برتا ہے:

"اپنے فن کے بارے میں، اپنے پہلے مجموعے کی طرح، کچھ کہنے سے احتراز کروں گا۔"

مگر اپنی کتاب کے فلیپ پر اپنی شاعری کی بابت آٹھ ادیبوں اور شاعروں کی رائیں بھی دی ہیں۔ شاید اس لیے کہ خود جو کچھ کہنے سے احتراز کیا ہے، وہ دوسروں کی زبانی کہلایا جا سکے۔

اسلم عمادی شعر گوئی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہتر ہے وہ اپنا تیسرا مجموعہ شائع کرانے میں عجلت سے کام نہ لیں۔

("آج کل"، دہلی، اپریل ۱۹۸۱ء)

زخمِ صدا

اعزاز افضل

اعزاز افضل حوصلہ، اُمنگ، شوق اور ولولہ کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کا مجموعی آہنگ تیز اور بلند ہے۔ جدید تنقید کے فتووں کے باوجود اب بھی ایسی شاعری بے گھر نہیں ہوئی ہے۔ اعزاز افضل کی فکر کا رچاؤ اور فن کا رکھ رکھاؤ ان کی قوتِ کلام پر دلالت کرتے ہیں۔ ترقی پسند افکار و خیالات کا اظہار انھوں نے فنکارانہ آرائش کے ساتھ کیا ہے۔ پرویز شاہدی کے طرزِ سخن کے بہترین نقوش، اعزاز افضل کی شاعرانہ شخصیت کے خدوخال کو دلکشی عطا کرتے ہیں۔

فن صورت و معنی کے خوبصورت امتزاج کا نام ہے۔ اعزاز افضل کی زبان، ان کا لب ولہجہ، ان کے برتے ہوئے الفاظ اُن کے افکار و خیالات سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے "فروغِ طبع خداداد" کے ساتھ ساتھ "کسبِ فن کے لیے ریاض" بھی خوب کیا ہے۔ "زخمِ صدا" ان کی غزلوں کا ایک معتبر انتخاب ہے۔ اس منتخب کلام سے اشعار انتخاب کرنا نہ مناسب ہے، نہ ضروری۔ البتہ چند اشعار محض ان کے عمومی رنگِ سخن کے نمونے کے طور پر اور اپنی ذاتی پسند کے اظہار کے لیے پیش کر رہا ہوں:

نہ ٹوٹتے ہیں، نہ شاخوں سے توڑے جاتے ہیں
نہ جانے کون سے موسم میں پھل رہے ہیں ہم

میری بے سمتی ہے میرا مرکزِ فکر و نظر
غیر جانبدار ہوں ، میری طرف داری کرو

آئینہ خانے میں باہر کی ہوا آنے دو
زُلف بکھرے گی تو کچھ اور سنور جاؤ گے

اے نقش گرو ! لوحِ تحریر ہمیں دے دو
ہم اپنے مصوّر ہیں ، تصویر ہمیں دے دو

ٹھہری ہوئی ظلمت میں شعلوں کا تلاطم کیا
آواز ہمیں دینا جب رات ہو طوفانی

مجھے یقین ہے کہ تجربے اور ریاضت سے اعزاز افضل کے شعری نقش ونگار مزید آب ورنگ پائیں گے۔

(سری نگر، ۲۲ر مارچ ۱۹۸۰ء، مشمولہ سہ ماہی ''رابطہ'' کلکتہ، شمارہ ۱، اعزاز افضل نمبر، اپریل۔جون ۱۹۹۴ء)

مشرقی بنگال میں اُردو

اقبال عظیم

تقسیم ہند کے بعد تنقید وتحقیق کی جتنی کتابیں اُردو میں شائع ہوئی ہیں، ان میں بہت کم ایسی ہیں جنھیں ہماری زبان میں مستقل حیثیت حاصل ہونے کا امکان ہو۔ خوش قسمتی سے پروفیسر اقبال عظیم کی تالیف ''مشرقی بنگال میں اُردو'' ایسی کتابوں میں سے ایک ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں دیکھتے ہی دیکھتے مشرقی بنگال میں اُردو کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے اور مستقبل کے لیے بڑے روشن امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ اقبال عظیم کی یہ کتاب اس ''ترقی تیز رفتار'' کا کامیاب تذکرہ ہے۔ ویسے تقسیم ہند سے پہلے مشرقی بنگال نے اُردو کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کا مختصر تذکرہ بھی اس کتاب کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کو محیط ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں دورِ ماضی کے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہے۔ اور دوسرے حصے میں آج کے لکھنے والوں کا۔ تیسرے حصے میں مستقبل کے امکانات پر دلائل و براہین کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ مشرقی بنگال میں اُردو سے متعلق جتنی اور جس طرح کی معلومات فراہم کی جاسکتی تھیں انھیں اس کتاب میں محفوظ کردیا گیا ہے۔ مشرقی بنگال کے اُردو رسائل، کتابیں، لائبریریاں، کتابوں کی دُکانیں، ادبی انجمنیں — ان میں سے ہر ایک کا نام موجود ہے۔ لیکن اقبال عظیم نے کہیں کہیں حقائق کی دریافت میں غلطی کی ہے۔ چند اہم ادبی شخصیتوں کا ذکر نہ ہونا بھی گراں گزرتا ہے، خصوصاً اختر پیامی اور پروفیسر حنیف فوق کا۔ اُمید ہے آئندہ ایڈیشن میں یہ خامیاں دُور کردی جائیں گی۔ کتاب ڈھاکہ اور چٹاگاؤں میں چھپی ہے اور انتہائی خوبصورت چھپی ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں تفصیلی تبصرہ کا موقع نہیں پھر بھی یہ چند سطریں کتاب کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی

ہیں۔اقبال عظیم نے جس محنت، عرق ریزی اور جانفشانی سے اس تذکرہ کو ترتیب دیا ہے، اس کا صلہ یہی ہوسکتا ہے کہ ہر اُردوداں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرے۔کسی اُردو لائبریری کو اس کتاب سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔

(ماہ نامہ ''معاون''، کلکتہ، مئی ۱۹۵۵ء)

طلوعِ سحر

امجد نجمی

اُردو مراکز کے دعویداروں نے دانستہ یا نادانستہ اُردو کو قابلِ ذکر حد تک نقصان پہنچایا ہے۔انھیں اُردو کو ہمہ گیر، وسیع اور مقبولِ عام زبان بنانے سے اتنی دلچسپی نہیں رہی جتنی یہ ثابت کرنے کی کہ صحیح اور ''نجیب الطرفین'' اُردو تو صرف ان کے گھرانے کی جاگیر ہے اور ان کی ڈیوڑھی سے باہر جو زبان بولی یا لکھی جاتی ہے، وہ سب کچھ ہے مگر اُردو نہیں۔اپنے گردوپیش سے آنکھیں بند کر لینے کا یہ جنون اُردو کے خود ساختہ ''محافظوں'' پر بہت عرصے تک طاری رہا اور اب بھی اس کے نفسیاتی اثرات کسی نہ کسی طور پر بے نقاب ہونے سے باز نہیں آتے۔

اڑیسہ کی علاقائی زبان اُڑیا ہے۔لیکن اُردو نے یہاں بھی بہتوں کو اپنے حسنِ سادہ ورنگیں کا گرویدہ بنایا ہے۔اس سرزمین سے اُردو کے بعض اچھے لکھنے والے پیدا ہوئے۔ان میں سے ایک امجد نجمی ہیں جن کا مجموعۂ کلام ''طلوعِ سحر'' کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔امجد نجمی کا نام اُردو دُنیا کے لیے نیا ہے، لیکن وہ خود نئے نہیں ہیں۔ان کی عمر ساٹھ سال ہے اور چالیس سال سے زیادہ سے وہ گیسوئے اُردو کو سنوارنے کے لیے اپنے شانۂ فکروفن کو زحمت دے رہے ہیں۔زیرِ نظر مجموعے میں ۵۲ نظمیں شامل ہیں جو ۱۹۲۲ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان کہی گئی ہیں۔امجد نجمی کے کلام کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ وہ دقیانوسی، پیش پا افتادہ خیالات وموضوعات سے حتیٰ الامکان گریز کرتے ہیں۔ان کا کلام کسی بوڑھے مشاق شاعر کی لفظی بازی گری کا نمونہ نہیں ہے۔ان میں زندگی کے تازہ اور اہم مسائل سے آنکھیں چار کرنے اور انھیں شاعرانہ دیانت داری سے پیش کرنے کی لگن پائی جاتی ہے۔ان کی شاعری میں زندگی کی بھرپور توانائی اور فکروخیال کی سرشاری اور سربلندی جلوہ افروز ہے۔امجد نجمی ایک پُرگو شاعر ہیں۔انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں اپنے جوہر آزمائے ہیں اور ایک بڑے شعری سرمائے کے مالک

ہیں۔ ''طلوعِ سحر'' ان کی نظموں کا ایک عمدہ انتخاب ہے۔ ان کے مطالعے سے شاعر کے ذہنی رجحانات، اس کے فکری ارتقا اور جذباتی میلانات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ وہ اقبال، جوش، آغا حشر اور سیماب سے شعوری طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی حالیہ شاعری پر نسبتاً جدید شعراء کے اثرات بھی ملتے ہیں، خصوصاً ان کی تازہ ترین نظموں میں یہ اثر بہت نمایاں ہے۔ مثلاً 'کم نگہی'، 'چلیکا'، اور 'مون راکٹ' میں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امجد نجمی ترقی پسند ادب اور نئے ادب کی تحریک سے نا آشنا نہیں ہیں۔ میں انھیں اس لحاظ سے قابلِ صد آفریں سمجھتا ہوں، کیونکہ عام طور پر وہ شعراء جن کی مشقِ سخن پندرہ بیس سال سے تجاوز کر جاتی ہے، اپنے علاوہ کسی اور کا کلام نہیں پڑھتے اور پھر ایسے علاقوں میں جہاں اُردو کی نئی کتابوں اور رسالوں کے دستیاب ہونے کی صورتیں نہ ہونے کے برابر ہیں، عموماً لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ۱۸۵۷ء (۱۹۵۷ء نہیں) کے بعد بھی کوئی ادب پیدا ہوا ہے۔

امجد نجمی نے عصری میلانات کی روشنی میں اپنی شاعری کو پروان چڑھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''طلوعِ سحر'' میں جہاں ان کی وارداتی نظمیں یا فلسفیانہ رنگ کی نظمیں شامل ہیں، وہیں یہ مجموعہ خلافت تحریک سے لے کر اب تک کے ہندوستان کی ایک سیاسی دستاویز بھی ہے۔ ان کی سیاسی نظموں میں ''کف در دہاں چیخ'' کی بجائے شاعرانہ ضبط و توازن ملتا ہے۔ امجد نجمی کا ہیجان بھی سکون سے ہم آمیز ہے۔

امجد نجمی ایک پختہ کار شاعر ہیں، لیکن وہ اپنی پختہ کاری پر قانع نہیں، بلکہ ان کا فن رواں دواں زندگی اور تیز گام وقت کے شانہ بشانہ گرم رفتار ہے۔ ان کی شاعرانہ حیثیت کو متعین کرنے میں اس حقیقت کو ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اڑیسہ سے اُردو کی کوئی کتاب پہلے نہ شائع ہوئی ہو۔ دو چار ناول، چند دیوان اور کچھ مذہبی کتابیں پیراہنِ طباعت سے ضرور آراستہ ہوئی ہیں، لیکن ''طلوعِ سحر'' کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ یہاں سے اس سے پیشتر کوئی کتاب اس اہتمام سے شائع نہیں ہوئی اور نہ اس سے پہلے کسی اور کتاب نے اڑیسہ سے باہر اتنی دلچسپی پیدا کی۔ ''طلوعِ سحر'' کے آغاز میں نیاز فتح پوری، جمیل مظہری، احتشام حسین، آل احمد سرور، پرویز شاہدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ جیسے مشاہیرِ ادب کی رائیں شامل ہیں، جنھوں نے نجمی کے کلام کو سراہا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کہ امجد نجمی کا شاعرانہ مرتبہ کیا ہے، یہ امر بذاتِ خود اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے کہ اڑیسہ سے اُردو کی ایک کتاب پہلی دفعہ اس ایقان و اعتماد کے ساتھ اڑیسہ کے پہلے باقاعدہ اُردو پبلشر نے چھاپی ہے کہ یہ کتاب دوسرے صوبوں کے ادیبوں، شاعروں اور ادبی ذوق رکھنے والوں سے خراجِ تحسین وصول کرے گی۔

کرامت علی کرامت جنھوں نے نظموں کی ترتیب کے فرائض انجام دیئے، اور اڑیسہ اُردو پبلشرز جنھوں نے کتاب خوبصورتی اور پاکیزگی سے چھاپی، ہمارے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجموعے کی قیمت صرف دوروپے رکھی گئی ہے، جو کتاب کی ضخامت اور ظاہری ومعنوی خوبیوں کے پیشِ نظر بہت کم ہے۔

امجد نجمی کا پہلا مجموعۂ کلام ''طلوعِ سحر'' اُڑیسہ کی جانب سے اُردو دُنیا کو ایک ایسا جمیل تحفہ ہے جس کی پذیرائی سے جی چُرانا اپنے ذوق کی توہین کرنا ہے۔

(''رفتارِنو'' دربھنگا، شمارہ ۱۲، مئی ۱۹۶۱ء)

جادۂ شب

سیّد امین اشرف

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ غزل جتنی مشکل صنفِ سخن ہے، اتنی ہی آسان بھی ہے۔ غزل گویوں کے جمِ غفیر کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ ایسی بے رس، بے رنگ، سپاٹ اور سطحی غزلوں کے ''خالقوں'' پر پابندی لگا دی جائے۔ میں آل احمد سرور کی طرح اس بات کا قائل ہوں کہ اُردو شاعری کا مستقبل نظم سے وابستہ ہے۔ مگر یہ ہم سب جانتے ہیں کہ اُردو نظم کی موجودہ صورتِ حال حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اس کے برعکس اچھی غزل اب بھی بار بار اپنا جلوہ دِکھاتی ہے، اور انھیں اچھی غزلوں کی بنا پر ہم کمزور اور معمولی غزلوں کو برداشت کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔

آج کی اچھی غزل کا ایک نہایت معتبر نمونہ سیّد امین اشرف کا مجموعۂ کلام ''جادۂ شب'' ہے۔ اس وقت اچھے غزل گویوں کی تعداد شاید بیس پچیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ بلاشبہ اس مختصر فہرست میں ایک نمایاں نام سیّد امین اشرف کا ہے۔

سیّد امین اشرف میرے ہم عمر اور ہم عصر ہیں۔ ہم عصر اِن معنوں میں کہ ہم دونوں کی ابتدائی تحریریں کم وبیش ایک ہی زمانے میں اشاعت پذیر ہورہی تھیں۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اپنے امکانات واضح اور ثابت کرنے کے بعد وہ اچانک ادبی شعری منظر نامے سے غائب ہوگئے اور جدیدیت کی چہل پہل میں وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ کبھی کبھی علی گڑھ کے کسی دوست سے ان کا ذکر آتا تو یہی پتہ چلتا کہ وہ اپنی تدریسی اور خانگی ذمہ داریوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔

پھر یکا یک غیر متوقع طور پر وہ اپنی نئی اور منوّر غزلوں کے ساتھ "شب خون" کے صفحات میں نمایاں ترجیح کے ساتھ نمودار ہوئے اور نئے رنگ و آہنگ کی ان خلاّقانہ تخلیقات نے سب کو سرشار بھی کیا اور دلوں میں جذبۂ رشک بھی پیدا کیا۔ سیّد امین اشرف کی غزلیں اپنی لفظیات، اپنے طرزِ بیان، اپنے رموز و علائم، اپنی تراکیب، اپنے التزام لفظی و معنوی کے اعتبار سے موجودہ غزل گوئی کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

میں غزل میں خوش آہنگی کو سب سے پہلے تلاش کرتا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ فکر و اظہار کی سطح پر کوئی غزل اپنے قاری کو کتنی ذہنی آسودگی عطا کرنے کی استطاعت رکھتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ سیّد امین اشرف کی زبان فارسی آمیز ہے۔ اُردو شاعری میں فارسی کی خوبصورت آمیزش آج کل کم ہی دیکھنے میں آتی ہے، کیوں کہ آج کی غزل میں "بیانیہ" اور "زبانی اظہار" کا چلن زیادہ ہے۔ لیکن سیّد امین اشرف کی فارسی ترکیبیں یا الفاظ ایسے نہیں جو لغات سے رجوع کرنے پر مجبور کریں۔ ان میں علمیت کے چٹانوں تلے قاری کو کچلنے کی کوئی کوشش نہیں ملتی۔

سیّد امین اشرف کے طرزِ اظہار میں کوئی بناوٹ نہیں۔ ان کی تراکیب کی سجاوٹ بھی نمائشی نہیں ہے۔ ان کے یہاں نئی بات کہنے کی بہ ظاہر کوئی شعوری کوشش نہیں ملتی، مگر ہر شعر پھر بھی تازگی کا احساس دلاتا ہے:

چلے تو لے کے چلے شانِ بے نیازی بھی
وہ قحط ہے کہ یہ جنسِ گراں ملے نہ ملے

اسی لیے ہیں سزِ برقِ بے اماں کچھ لوگ
چمن میں اور کہیں آشیاں ملے نہ ملے

یہ لہجہ تہذیبی اقدار کی پاسبانی کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے!

سیّد امین اشرف انتخابِ الفاظ میں خاصے جمال پرست ہیں۔ ان کے یہاں ایسے الفاظ نہیں ملیں گے جن میں کسی نوع کی کرختگی یا سختی ہو۔ ان کے برتے ہوئے الفاظ نرم، سجل، شگفتہ اور شاداب ہیں۔ ان کے لہجے میں ایک گداز اور نزاکت ہے، لیکن اس میں اتنا دھیما پن بھی نہیں کہ انفعالیت کا دھوکا ہو۔ یہ وہ شاعری نہیں ہے جو بیس پچیس الفاظ کے اُلٹ پھیر سے کی جاتی ہے۔

سیّد امین اشرف کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار احساس ہوا ہے کہ ذہن و دل کی ناآسودگیوں، عشق کی محرومیوں، زمانے کی بے التفاتیوں اور ہجر کی تنہائیوں کے باوجود زندگی کی بابت ان کا رویہ اثباتی ہے۔ وہ شکوہ شکایت نہیں کرتے، دنیا سے نفرت نہیں کرتے اور نہ اس سے انتقام لینے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

سیّد امین اشرف نے ہماری شعری روایت کی تمام نیرنگیوں کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے۔ ان کے اظہار میں معنی و مفہوم کی طرفہ کاری، جمال آفریں تراکیب کے جھلملاتے رنگ اور ان کا صوتی آہنگ حواسِ خمسہ کو متاثر کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ کسی کوشش کے بغیر کچھ اشعار پیش ہیں:

مجھے تو شوخیٔ زنجیرِ در نے روک لیا
قدم جو اُٹھتا تو بالائے کہکشاں ہوتا

ہزار تشنگی و خستگی و تنہائی
گلاب رختِ سفر باندھ کر روانہ ہوا
ہوا کی قہر پسندی، شجر کی زندہ دلی
رفاقتوں میں تصادم کا شاخسانہ ہوا

یاد آتی ہے اِک شاخچۂ نخلِ طرب ناک
آواز کی شوریدہ سری یاد نہیں ہے
رقصاں تھی کوئی تتے صفتِ نکہتِ سیّال
خوشبو تھی کہ شیشے کی پری، یاد نہیں ہے

داخلی احساسات اور خارجی تجربات کے اعتبار سے سیّد امین اشرف اُردو غزل کے خصوصی مزاج سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی غزل لطافت، نزاکت اور جمالیاتی رچاؤ سے عبارت ہے۔ نیکی، شرافت اور زندگی کی مثبت قدروں پر ایمان کے بغیر ایسی شاعری معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ یہ ظاہر اور باطن کی یکسانی اور ہمواری سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ شاعری ہمارے ذہن کے تاروں کو مرتعش کرتی ہے اور ہماری جوابی صلاحیتوں کو مہمیز دیتی ہے!

(''شب خون'' الٰہ آباد، شمارہ ۲۵۸، جولائی ۲۰۰۲ء)

ابابیل

اویس احمد دوراں

''لمحوں کی آواز'' کے بعد ''ابابیل'' اویس احمد دوراں کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ دوراں ایک طباع، ذہین اور مخلص شاعر ہیں۔ اپنے نظریات، مشاہدات اور محسوسات کو بے تکلفی کے ساتھ غیر پیچیدہ اسلوب میں پیش کرنا اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔

اویس احمد دوراں بہ قول خود ''ذہنی عیاشی کرنے والوں اور سماج کا خون چوسنے والوں'' کے شاعر نہیں ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھتے وقت بین الاقوامی حالات و واقعات اور ان کے پس منظر کو دھیان میں ضرور رکھا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں نقاد تخلیق کاروں کے بارے میں گمراہیاں پھیلاتا ہے، وہاں تخلیق کار بھی اکثر اپنے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے، جس سے خود اُس کی ادبی حیثیت متاثر ہوتی ہے۔ اویس احمد دوراں کا المیہ یہ ہے کہ ناقدین نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ''لمحوں کی آواز'' اس زمانے میں منظرِ عام پر آیا، جب جدیدیت اپنے عروج پر تھی اور ترقی پسندانہ خصوصاً خطیبانہ لب ولہجہ اپنی توقیر کھو چکا تھا۔ ناقدین کے پاس کچھ سکہ بند الفاظ اور فقرے ہوتے ہیں، جنھیں وہ تخلیقی فن کاروں کی تحسین یا تنقیص کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اُنھیں اس کی فرصت کہاں کہ وہ دوراں کی شاعری کے خوبصورت پہلوؤں کی نشان دہی کر سکتے۔ (اختر اورینوی کے مضمون کی حیثیت استثنائی ہے۔)

''ابابیل'' کی کچھ نظموں میں ''برہنہ گفتاری'' نمایاں ہے جس کا دفاع دوراں نے اپنے 'پیش لفظ' میں کیا ہے، جو قطعی متاثر کُن نہیں ہے۔ ظالم اور مظلوم کی کشمکش میں، ظاہر ہے، شاعر ہمیشہ مظلوم کے ساتھ ہوگا اور اس کی شاعری اگر عصر کے تقاضوں سے آنکھیں بند نہیں کرتی تو اس درد و کرب کا اظہار ضرور ملے گا جو مظلوم کا مقسوم ہے۔ لیکن ''خبردار'' اور ''للکار'' کی وہ آواز جو میدانِ کارزار میں سنائی دیتی ہے، اگر شاعر کو عزیز ہے تو اسے بلا تکلف قلم چھوڑ کر تلوار اُٹھا لینی چاہیے۔ شاعر پر واجب نہیں ہے کہ وہ خلوت میں ہی اپنے احتجاج کو لباسِ حریر پہناتا رہے۔ اگر اس کا دِل غیظ و غضب سے بھرا ہوا ہے تو اسے تلوار اُٹھانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن شاعری کو چیخ و پکار کا بدل بنا دینا شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہے، اور اس کے منصب کے منافی ہے۔ ''ابابیل'' میں جو نثری اور آزاد نظمیں ہیں، وہ کمزور ہیں اور میں سمجھتا ہوں انھیں مجموعے میں شامل کر کے شاعر نے اپنے ساتھ زیادتی کی۔ پابند نظموں میں

''رشتوں کا اتحاد'' اور ''بشارت'' بھی اسی نوع کی نظمیں ہیں۔ لیکن ان کے یہاں ''جستجو''، ''التہاب''، ''سفر جاری ہے''، ''دشتِ تپاں''، ''گلاب کی موت''، ''تہہِ خنجر''، ''نئی پود'' جیسی دلکش نظمیں بھی ہیں جہاں فکر کا خلوص شعری پیکر میں ڈھل گیا ہے۔ دراصل یہی نظمیں دوراںؔ کی شاعری کا شناخت نامہ ہیں۔ میں نے جن نظموں کی بابت اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، ان میں سے ''گلاب کی موت'' اور ''تہہِ خنجر'' کے سوا سب دوراںؔ کے پہلے مجموعے ''لمحوں کی آواز'' میں شامل ہیں۔ ''ابابیل'' کی ۲۲ نظموں میں سے ۱۳ ''لمحوں کی آواز'' میں موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''وفاداری بہ شرطِ استواری'' ان کی تخلیقی قوتوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

اویس احمد دوراںؔ کی غزلوں میں سادگی اور صفائی ہے اور عموماً ان کا لہجہ نرم ہے۔ حزنیہ لے نے اُن کے اکثر اشعار کو سوز و گداز عطا کیا ہے۔ ظالم اور مظلوم، دولت اور ناداری کی کشاکش کا اظہار ان کی غزلوں میں بھی برملا ہوا ہے، لیکن صنفِ غزل کا حق ادا کرنے کی کوشش انھوں نے دلجمعی کے ساتھ کی ہے۔

دوراںؔ شعر اور موسیقی کے ربط باہم کا عرفان رکھتے ہیں، اور جب جب وہ شعر کی دیوی کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں، ان کی شاعری میں ایسی لطیف غنائیت اور تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ خود ہم اپنے دل کی دھڑکن ان کے اشعار میں سننے لگتے ہیں۔ دوراںؔ کو ڈیڑھ مصرعوں یا تین ہم وزن ٹکڑوں کو ایک مصرعے میں ڈھال کر ایک خاص نغمگی اور آہنگ پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔ مثلاً فاعلن مفاعیلن کی تکرار سے:

تُو نے کچھ سنا اے دِل/ درد کی دوا لے کر/ کوئی آنے والا ہے

یا

تیرگی کے پردوں سے/ لاکھوں چاندُ گاتی ہے/ آدمی کی بیداری

یا فعلن فعولن کی تکرار سے:

پہلے پہل جب/ امبر کے نیچے/ ہم تم ملے تھے

اس کوشش میں شکست ناروا کے اعتراض کا خطرہ بھی رہتا ہے:

صحرا کے دردواغم کے مسافر/ محوِ سفر ہیں
مقتل سجانے/ والوں کے خیمے/ زیروزبر ہیں

حرف کے دبنے کی مثال بھی ان کے یہاں مل جاتی ہے:

فردا کی شیریں داستاں تیرے ہی پاس ہے

بحیثیت مجموعی ''ابابیل'' ایک قابلِ توجہ مجموعہ ہے جو عصری شاعری کے ایک رُخ کو اُجاگر کرتا ہے۔

(''آج کل''، دہلی، مارچ ۱۹۹۰ء)

📖

سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے

برج پریمی

یادش بخیر، سعادت حسن منٹو چاہتے تھے کہ کسی رسالے کا منٹو نمبر شائع ہو اور اُسے وہ خود ایڈٹ کریں۔ منٹو یہ حسرت لیے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی زندگی میں ان پر کسی رسالے کا کوئی نمبر، کوئی خصوصی شمارہ، کوئی گوشہ، کوئی تفصیلی مطالعہ شائع نہیں ہوا، لیکن ان کے انتقال کے بعد انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک Legend بن گئے تھے۔ ان کے افسانوں پر مقدمے، ان کی کثرتِ شراب نوشی، اُن پر جُنوں کے حملے، ان کا ایک بوتل تھرّے یا وہسکی کے اَدّھے کے لیے ایک نشست میں افسانہ لکھ کر ایڈیٹر کے حوالے کر دینا — یہ ساری باتیں ادبی بیٹھکوں یا چائے خانوں میں موضوعِ سخن ہوا کرتی تھیں۔ منٹو کے مرتے ہی دوستوں، عزیزوں، شناساؤں نے اپنی اپنی یادداشتیں جمع کر دیں۔ مضامین ہی نہیں، ابو سعید قریشی اور محمد اسد اللہ کی کتابیں بھی آ گئیں۔ ''نقوش''، ''افکار''، ''شاعر'' اور ''پگڈنڈی'' نے منٹو کے انتقال کے فوراً بعد منٹو نمبر شائع کر دیے۔ کئی سال تک یہ ہما ہمی رہی۔ پھر ٹھنڈے دل سے منٹو کی فن کارانہ حیثیت کے تجزیے شروع ہوئے۔ یہ کام ممتاز شیریں ''نوری یا ناری'' کے ذریعے کر چکی تھیں۔ دوسروں نے کام کو آگے بڑھایا۔ عام طور پر پریم چند کے بعد اُردو افسانے کے عناصر اربعہ کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت (اسی ترتیب کے ساتھ) تسلیم کیے جاتے تھے۔ منٹو کی بازیافت اس طرح ہوئی کہ اُنھیں اُردو افسانے کا سب سے بڑا فن کار مانا گیا۔ بیدی اپنے فن کارانہ خصائص کی بنا پر کبھی دوسرے، کبھی پہلے نمبر پر لائے گئے۔ کرشن چندر کے لیے تیسرا نمبر بھی مشکوک قرار پایا۔ خیر اس سے قطع نظر کہ منٹو، پریم چند کے بعد اُردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں یا نہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ایک نہایت بلند پایہ افسانہ نگار ہیں اور انھیں فحش نویس کہہ کر معتوب کرنے کی جو کوششیں ہوتی رہی ہیں، وہ سب کی سب ناکام ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی نے پی ایچ ڈی کے لیے لکھا ہوا اپنا تحقیقی مقالہ ''سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے'' کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ یوں بھی منٹو سے برج پریمی کو خاص شغف ہے اور وہ منٹو کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں سے متعلق مضامین کی صورت میں نئی معلومات فراہم کرتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کم لوگ منٹو کے ہمہ جہت فنی اور شخصی پہلوؤں پر اتنی نظر رکھتے ہوں گے جتنی ڈاکٹر

برج پریمی رکھتے ہیں۔

یہ تحقیقی مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب جو ۱۳۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، منٹو کی سوانح حیات اور اُن کی شخصیت کے ترکیبی عناصر سے متعلق ہے۔ اس حصّے میں منٹو کی گھریلو زندگی، ان کے مذہبی رویے، سیاسی مسلک، خوراک، لباس، نفاست پسندی اور دوسرے خصائص پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں ان مقدموں کا بھی ذکر ہے جو منٹو کے افسانوں پر چلائے گئے۔ "کھول دو" کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ برج پریمی نے لکھا ہے: "اس افسانے کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس پر مقدمہ چلایا گیا یا نہیں۔" دراصل یہ غلط فہمی "نقوش" کے منٹو نمبر کی پیدا کردہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "کھول دو" پر کبھی کوئی مقدمہ نہیں چلا۔ البتہ یہ صحیح ہے (جیسا کہ برج پریمی نے بھی لکھا ہے) کہ اس افسانے کو شائع کرنے کی پاداش میں "نقوش" کی اشاعت پر حکومتِ پاکستان نے چھ ماہ کے لیے پابندی عائد کردی تھی۔ منٹو کے سارے مقدموں کی تفصیل "دستاویز" (مرتبہ: بلراج مین را) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

برج پریمی کے تحقیقی مقالہ کے دوسرے باب میں اُردو کے مختصر افسانے کی تاریخ منٹو سے پہلے تک، سوا سو صفحات میں بیان کی گئی ہے۔ تیسرا باب بھی جو منٹو کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کا بہت تفصیلی اور عمدہ تنقیدی جائزہ ہے، تقریباً سوا سو صفحات پر محیط ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مقالے کا سب سے اہم حصہ یہی ہے۔ چوتھے باب میں منٹو کے مضامین، انشائیوں اور خاکوں پر اور پانچویں باب میں ان کے خطوط پر اظہارِ خیال ہے۔ آخری باب میں منٹو کی ان نگارشات سے بحث کی گئی ہے جو ڈرامہ، ناول، تراجم اور صحافت کی ذیل میں آتی ہیں مختصر یہ کہ منٹو کی زندگی، شخصیت اور ان کی ادبی، صحافتی، اور فلمی سرگرمیوں کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر برج پریمی نے محققانہ اور ناقدانہ نظر نہ ڈالی ہو۔ برج پریمی کا سارا رویہ علمی اور معروضی ہے۔ یہ تحسین شناسی تو ہے لیکن اسے قصیدہ خوانی سے دُور کا بھی علاقہ نہیں۔

چونکہ تحقیقی مقالے کے مختلف ابواب اور ان کے حصّے مختلف مواقع پر لکھے جاتے ہیں، اس لیے ان میں کچھ باتوں کا اعادہ (Repetition) ہونا ایک حد تک ناگزیر ہے، مگر مقالے کو کتابی صورت میں پیش کرتے ہوئے نظرِ ثانی کے وقت اس عیب کو دُور کیا جاسکتا تھا۔ مجھے اس کتاب میں یہی ایک کمزوری نظر آئی۔ یہ تحقیقی مقالہ برج پریمی کی عرق ریزی اور محنت کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ منٹو پر لکھی ہوئی دوسری تحریروں سے بے نیاز کردے گا۔

("آج کل"، دہلی، ستمبر ۱۹۸۹ء)

رقصِ حیات

پرویز شاہدی

ترقی پسند ادب کا نام لے کر جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے، اس کا ایک بڑا حصہ غیر اہم، بے کار اور حقیر سہی، لیکن ترقی پسند ادبی تحریک نے اُردو کو جو سرمایہ بخشا ہے، اس کی قدر و قیمت کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ بلند پایہ لکھنے والوں کا ایک بڑا کارواں اس تحریک کی پشت پناہی میں آگے بڑھا ہے۔ فیض، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی اور مخدوم محی الدین کی صف کے ترقی پسند شعراء میں ایک اور اہم نام پرویز شاہدی کا ہے۔ اپنی اور اپنی شاعری کی عمر کے لحاظ سے مذکورہ بالا شعراء میں سے بعض پرویز شاہدی کے مقابلے میں "کم سن" ہی کہے جائیں گے، لیکن پرویز شاہدی کی ملک گیر شہرت اور مقبولیت کچھ ہی عرصے کی مرہونِ منت ہے۔ اُردو ادب کے اس دَور میں جب پبلسٹی کے وسائل بہت وسیع ہو گئے ہیں، پرویز شاہدی نے ناقدوں کی "علاقائی عصبیت" سے کم اور اپنی بے نیازانہ فطرت سے زیادہ نقصان اُٹھایا ہے۔ لیکن اچھا ادب بہر حال اپنے آپ کو "منوا" کر رہتا ہے۔ آج جو اُردو داں پرویز شاہدی کے نام اور کام سے واقف نہیں، اس کا ادبی ذوق محلِ نظر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہنوز انھیں وہ مقام حاصل نہیں ہوا، جس کا وہ استحقاق رکھتے ہیں۔

پرویز شاہدی بلاشبہ اس دَور کے ایک قادر الکلام شاعر ہیں جنھیں ادبی اور فنی قدروں کے شعور کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی شعور کی دولت بھی عطا ہوئی ہے۔ ان کی شاعری کی عمر تیس سال سے کم نہ ہوگی۔ وہ تقلید کے قائل نہیں، اس لیے انھوں نے شروع سے ہی اپنے لیے نئی راہ نکالنے کی کوشش کی۔ ان کی ابتدائی شاعری میں معنی آفرینی اور فکری توانائی کے بڑے واضح نقوش ملتے ہیں۔ رفتہ رفتہ تاریخی اور سماجی شعور میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں وزن، وقار، گیرائی اور گہرائی کی صفات بھی پیدا ہوتی گئیں۔ عملی اشتراکیت سے وابستگی نے ان کے کلام میں بلند آہنگی، زور اور حرارت پیدا کی، لیکن ان کی کئی نظمیں اسی "فارمولے" کا شکار ہو گئیں جو "جماعتی وفاداری" کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ ان کی چند نظموں میں وہی "کف در دہاں چیخ"، "گھن گرج" اور "پروپیگنڈے" کا عنصر موجود ہے۔ جس سے عارضی اشتعال تو پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ ہماری نفسیات کی جوابی صلاحیتوں کو چھونے سے قاصر رہتا ہے۔ ان کی تاثیر بھی محدود ہو جاتی ہے اور ہم فیض کی ہمنوائی کرتے ہوئے انھیں بھی "انقلاب کا ڈھونڈورچی" کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مقامِ مسرّت ہے کہ پرویز کے یہاں ایسی نظموں کی تعداد

بہت کم ہے۔ انھوں نے عام "اشتراکی" شاعروں کے علی الرغم جذبات و محسوسات کو حسین شعری جامہ پہنانے کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ زبان و بیان پر انھیں حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔ لفظی و معنوی التزام اور صحت فن کے باب میں شاید ہی کوئی دوسرا ترقی پسند شاعر ان کے حریف ہونے کا مدعی ہو سکے۔ اس وصف کی قدر و قیمت سے انکار نہیں، لیکن میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ زبان و فن کی بابت ان کا "کٹر پن" اکثر ان کے کلام کے تاثر و تخیل دونوں کو مجروح کرتا ہے۔

"رقصِ حیات" پرویز شاہدی کے منتخب کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں ۳۵ نظمیں، ۳۰ غزلیں اور ۱۴ رُباعیاں شامل ہیں۔ رُباعیات کا انتخاب کافی اچھا ہے۔ سازِ مستقبل، میرا فن کار، تضاد، ماضی کا قید خانہ، بر ربطِ دل، خوش آمدید، دعوت، استالن، ضیافت اور شیروانی، اُردو کی بہت اچھی نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ بنتِ ہمالہ، یانکسی کو سلام، ایلچی کو بوٹیما کی بیوہ کے نام، محرکات، اندھیرے اُجالے، آخری ملاقات اور کلچیں بھی عمدہ نظمیں ہیں۔ پال رابسن کے نام، اُجالا، جوانی ہمارے وطن میں اور تجدید سفر نمایاں طور پر اس "فارمولے" کا شکار ہیں جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔

پرویز شاہدی ان چند خوش قسمت شاعروں میں ہیں جو نظم و غزل دونوں اصناف پر قدرت رکھتے ہیں۔ "رقصِ حیات" کے دیباچہ میں ل۔ احمد اکبر آبادی نے لکھا ہے:

> "ان کی غزل کے لیے کوئی موضوع غیر مناسب نہیں۔ موضوع کی خشکی و کرختگی ان کے جمالیاتی اظہار و بیان میں کھو جاتی ہے۔ میرے لیے ان کی نظم اور غزل میں امتیاز دُشوار ہے اور زبان ان سے تنگ دامانی کا عذر کرتی نظر آتی ہے۔"

میرا خیال ہے کہ کہیں کہیں ان کی غزلوں میں "جمالیاتی اظہار و بیان" پر "موضوع کی خشکی اور کرختگی" غالب آجاتی ہے اور واقعی ان کی نظم اور غزل میں امتیاز دُشوار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ امتیاز باقی رہنا چاہیے۔

"رقصِ حیات" کی کتابت اور طباعت بے حد معمولی ہے۔ مشہور اشاعتی ادارے مکتبہ شاہراہ، دہلی نے اس باب میں غیر معمولی بے توجہی اور لاپروائی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ظاہری شکل و صورت پر جان دینے والوں کے لیے "رقصِ حیات" میں کوئی کشش نہیں ہو سکتی۔ لیکن اچھی شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اُردو کے شعری سرمائے میں یہ مجموعہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ آخر میں پھر ل۔ احمد اکبر آبادی کی رائے پیش کرنا چاہوں گا:

> "بلاشبہ بہ اعتبار فن پرویز پہلی صف کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں شعریت کی رُوح سمٹ آتی ہے۔ ان کا احساس گہرا ہے اور ان کا بیان حد درجہ دل نشیں، جو خیال کو دلہن بنا کر رکھ دیتا ہے!"

(ماہ نامہ "سہیل" گیا، اکتوبر ۱۹۵۷ء)

جدید اُردو شاعری: چند مُطالعے

پریمی رُومانی

ہر ادب اپنے وقت میں جدید ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد جو ادیب اور شاعر سامنے آئے، خواہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہوں یا ادب برائے ادب کے، وہ اپنے آپ کو جدید یا نیا کہتے اور ان کا ادب نئے ادب کے زمرے میں شامل تھا۔ ۱۹۵۳-۵۴ء تک ان کا ادب پرانا ہوگیا اور ایک نئی نسل سامنے آئی اور جدید کہلائی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کے فروغ کے ساتھ ایک اور نسل اُبھری۔ اس نسل کی رہنمائی اور ہمسفری کی سعادت اس نسل کو حاصل ہوئی جو ۱۹۵۴-۵۵ء کے آس پاس اپنے وجود کو منوا چکی تھی۔

۱۹۵۱-۵۲ء کے اُردو شعراء بلند آواز میں گفتگو کرتے تھے۔ شاید انھیں اپنی بات سامعین تک پہنچانے کے لیے اس کی ضرورت بھی تھی۔ پھر جب انھیں محسوس ہوا کہ قاری اور سامع دونوں ان سے مخاطب ہیں، ان سے قریب ہیں تو پھر اُونچی آواز میں باتیں کرنا ضروری نہ رہا۔ نرم سُروں اور مدھم لہجے میں ہی نہیں، سرگوشیوں میں بھی باتیں ہونے لگیں۔ ۱۹۵۴-۵۵ء کے بعد کی شاعری میں لہجے کا یہ فرق واضح ہے۔

جدید شاعری میں کئی رنگ ہیں — چکا چوند پیدا کرنے والے، شوخ، نرم، ہلکے۔ ان سب کا اپنا حسن ہے۔ اس دوران پیکر تراشی اور علامت نگاری کا رجحان اُبھرا ہے۔ دوٹوک، واشگاف، براہِ راست طرزِ اظہار سے اجتناب برتا جاتا ہے، کیوں کہ یہ اسلوب مطبوع نہیں رہا۔ اب اکہری حقیقت نگاری، ڈکشن کی مرصّع کاری، اضافتوں سے بھرپور فارسی آمیز ترکیبوں کا دَور نہیں رہا۔ البتہ ہیئتی تجربات کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ بحروں میں تصرف یا نئی بحریں ایجاد کرنے کا رجحان بڑھا۔ پرانے علائم کی جگہ نئے علائم نے لے لی۔ ترقی پسند دَور کے مخصوص علائم — سحر، خورشید، شمع، طوفان، مے وغیرہ کلیشے (Cliche) بن گئے۔ بے چہرگی اور تنہائی خصوصی موضوعات قرار پائے۔ اس وقت اگر کوئی شاعری قابلِ اعتنا ہے تو وہ وہی ہے جسے جدید شاعری کہا جاتا ہے اور جس کی ابتدا ۱۹۵۵ء کے آس پاس ہوئی تھی اور جو ۱۹۶۰ء کے بعد محترم اور معتبر بن گئی۔ اس کے نمائندہ شاعروں میں (ہندوستان کی حد تک) خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، کرشن موہن، شاذ تمکنت، وحید اختر، باقر مہدی، حسن نعیم، عمیق حنفی، محمد علوی، زبیر رضوی، مخمور سعیدی، حامدی کاشمیری، بانی، بشیر بدر، شہریار، کمار پاشی، بمل کرشن اشک اور ندا فاضلی سرِفہرست

ہیں۔ان شاعروں کے خصوصی مطالعے الگ الگ مضامین کی صورت میں رسائل کے اوراق میں کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔لیکن جدید شاعروں کے انفرادی مطالعوں پر مبنی کوئی باقاعدہ کتاب ہمارے یہاں موجود نہیں تھی۔سبھاش چندر ایمہ پریمی رُومانی ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کمی کو پورا کیا۔ان کی کتاب ''جدید اُردو شاعری: چند مطالعے'' یقیناً اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔حامدی کاشمیری نے اس مجموعۂ مضامین پر مختصراً رائے دیتے ہوئے اس کی تصدیق ان لفظوں میں کی ہے:

''نئے شعراء پر اس نوع کا یعنی انفرادی شعراء کا مطالعہ پہلی بار اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔''

اس مجموعے میں دس شاعروں کے مطالعے پیش کیے گئے ہیں: خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، کرشن موہن، مخمور سعیدی، شہریار، مظہر امام، زبیر رضوی، بمل کرشن اشک، حامدی کاشمیری اور ندا فاضلی۔ ابتدا میں پریمی رومانی کا ایک مضمون ''اُردو شاعری کی نئی جہتیں'' شامل ہے۔ضروری نہیں کہ ایک تنقید نگار ہر قابلِ توجہ نئے شاعر کو لازمی طور پر اپنے مطالعے کا موضوع بنائے۔یوں بھی اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں جدید اُردو شاعری کے صرف چند مطالعے ہی پیش کیے گئے ہیں۔پریمی رومانی نے اپنی پسند کے جدید شاعروں کے نام اپنے کئی مضامین میں لیے ہیں۔شاید وہ انھیں بھی آگے چل کر اپنے خصوصی مطالعے کا موضوع بنائیں۔زبیر رضوی نے اس کتاب کے دیباچے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ: ''مجھے کمار پاشی، محمد علوی، باقر مہدی اور وحید اختر پر مضامین نہ ہونے کا احساس ہوا۔'' میں اس فہرست میں شاذ تمکنت، حسن نعیم، بانی، بشیر بدر اور عمیق حنفی کا بھی اضافہ کرنا چاہوں گا۔لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کسی ایک کتاب میں ہر نمائندہ شاعر پر باقاعدہ مضمون شامل ہونا ضروری نہیں اور پھر یہ پریمی رومانی کی اس نوع کی آخری کتاب بھی نہیں ہے۔واضح رہے کہ میں نے اُوپر نمائندہ شاعروں کی جو فہرست دی ہے، وہ ہندوستان سے ہی متعلق ہے۔اگر پاکستان کے شعراء کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ فہرست کافی طویل ہو جائے گی۔علاوہ ازیں جو فہرست میں نے پیش کی ہے، اس میں بھی اضافے کی گنجائش موجود ہے۔

پریمی رومانی ایک نوجوان نئے شاعر اور ناقد ہیں۔شاعر ہونے کی وجہ سے انھیں شاعری کے مطالعے میں آسانی ہوئی ہے۔انھوں نے شاعروں کو ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھا ہے۔شاعر کے نظریات اور اس کی شاعری کے خصوصی اوصاف تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے شاعروں سے براہِ راست رجوع بھی کیا ہے، جس کا ثبوت ان خطوط کے اقتباسات ہیں، جو کتاب میں جا بجا استعمال کیے گئے ہیں۔پریمی رومانی میں جدید شاعری کے مطالعے کی ایک لگن ہے۔ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔شاعروں کا مطالعہ اُنھوں نے معروضی

طور پر کیا ہے۔ پریمی رومانی نے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں، اپنے تعصبات نہیں۔

گذشتہ چند برسوں سے ہماری تنقید کی توجہ شاعری پر نہیں، افسانے پر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری تنقید ایک عرصے تک نثر اور افسانے کی تنقید سے گریز کرتی رہی ہے اور افسانے کی جانب ہماری تنقید کا جھکاؤ مناسب بھی ہے اور ضروری بھی۔ لیکن اگر اُردو افسانے پر لکھی ہوئی حالیہ تنقیدوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ مہدی جعفر اور شہزاد منظر کو چھوڑ کر باقی لکھنے والے دوسرے ناقدین کی باتوں کی جگالی کر رہے ہیں۔ ایسے وقت میں پریمی رُومانی کی تنقیدی کتاب "جدید اُردو شاعری: چند مطالعے" کی اشاعت ایک فال نیک ہے۔ شاعری اور خصوصاً نئی شاعری پر تنقیدی محاکے کی اب بھی ضرورت ہے۔ جدید شاعروں کا انفرادی مطالعہ جو کچھ ہوا ہے، وہ بہت کم ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ پریمی رُومانی جدید شاعری اور جدید شاعروں پر اسی طرح اپنے مطالعوں کے نتائج پیش کرتے رہیں گے۔ زیر نظر کتاب کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کا حق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری نے اس کتاب کے مختصر لیکن عالمانہ دیباچے میں کشمیر کے اس نوجوان ناقد کو ان لفظوں میں داد دی ہے:

> "پریمی رُومانی نئی اُردو شاعری کے مزاج آشنا ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ وہ عصری ادب اور نئے ادب کے فرق و امتیاز سے واقف ہیں۔"

اُردو ادب کے جدید شاعروں کے انفرادی مطالعے کا یہ پہلا مجموعہ ہے جسے وادیٔ کشمیر کے ایک ہونہار تنقید نگار نے پیش کیا ہے۔ "جدید اُردو شاعری: چند مطالعے" بلاشبہ ایک ایسی کتاب ہے جو آج کی شاعری کے خط و خال کو اُجاگر کرتی ہے۔ نئی شاعری کے تعلق سے جو غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں، اُن کو دُور کرنے میں بھی یہ کتاب بالواسطہ مدد دیتی ہے۔ پریمی رُومانی نے مفتی کا نہیں ادب کے سنجیدہ طالب علم ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اچھی تنقید کے لیے اسی کی ضرورت ہے۔

("شیرازہ" سری نگر، نومبر ۱۹۸۲ء، "اوراق" مجموعہ مضامین پریمی رومانی، ۱۹۸۷ء میں بھی شامل ہے)

تحریکِ آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصّہ

تقی رحیم

ہم نے بڑی جد وجہد اور بڑی قربانیوں کے بعد برطانوی استعمار سے آزادی حاصل کی۔ افسوس ہے کہ ہم اس آزادی کا خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھا سکے اور فرقہ پرستی، مذہبی عصبیت، غریبی اور بے روزگاری

کو مٹانے کا ہم نے جو تہیہ کیا تھا، وہ اب بھی محض خواب و خیال ہے۔ ملک کے سارے عوام آزادی کی اس جدوجہد میں برابر کے شریک رہے۔ مسلمانوں نے بھی بڑی قربانیاں دی ہیں اور وطن کی راہ میں شہید ہوئے ہیں۔ لیکن آج کل بعض فرقہ پرست عناصر مسلمانوں کی قربانیوں کو نظر انداز کرنے کے درپے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ملک کی آزادی اور تعمیر و ترقی میں مسلمانوں کا جو غیر معمولی حصہ رہا ہے، اسے صحیح تناظر میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔

صوبہ بہار کے مسلمانوں نے بھی جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ اس سلسلے میں اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں آئی تھی جو اس سرزمین کے جاں بازوں اور جاں سپاروں کے کارناموں کو نئی نسل سے روشناس کرائے۔ ملک کی آزادی کے لیے بہار کے مسلمانوں نے جو صعوبتیں اور اذیتیں اُٹھائیں، اُنھیں یاد رکھے بغیر ہم اپنی تاریخ سے انصاف نہیں کر سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ بہار کے مسلمانوں نے جنگِ آزادی میں ایک تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

''تحریکِ آزادی میں بِہار کے مُسلمانوں کا حصّہ'' کے نام سے خدا بخش لائبریری نے چھ سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب حال ہی میں شائع کی ہے۔ اس کتاب کے مصنف اور مؤلف تقی رحیم ہیں، جو بہار کے سیاسی حلقوں میں قائدانہ حیثیت کے مالک رہے ہیں۔ اپنے علم، اپنی باخبری اور اپنی دانش وری کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق بائیں بازو سے رہا ہے۔ جے پرکاش نرائن کے آندولن میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ تقی رحیم نے یہ کتاب بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ لکھی ہے۔ وہ بیش از بیش ضروری دستاویزوں کو بروئے کار لائے ہیں اور استناد کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ تقی رحیم نے انگریزی کی کئی مستند تاریخی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، جن میں مشہور تاریخ داں کے۔ کے۔ دتہ کی کتاب ''بہار میں جنگِ آزادی'' (Freedom Movement in Bihar)، ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خودنوشت ''منقسم ہندوستان'' (India Divided) ''بہار میں انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر و نفوذ بہار اور بنگال میں بہت پہلے ہوا اور ان کے لوٹ کھسوٹ کا سب سے پہلا شکار یہی علاقہ ہوا، جس نے یہاں کی معیشت پورے طور پر تباہ کر دی۔ تقی رحیم نے اپنی کتاب کا آغاز بہار پر کمپنی کے تسلط سے کیا ہے۔ اُنھوں نے نواب میر قاسم کو جس نے اپنا دارالحکومت مرشد آباد (بنگال) سے مونگیر (بہار) منتقل کر دیا تھا، بہار کا پہلا مجاہدِ آزادی کہا ہے۔ اس نے انگریزوں سے لڑائیاں لڑیں۔ شاہ عالم اور اَودھ کے نواب شجاع الدولہ سے بھی انگریزوں پر فوج کشی کرائی، لیکن میر قاسم کو انگریزوں کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ تقی رحیم نے

وہابی تحریک، خلافت تحریک، تحریک عدم تعاون، رولٹ ایکٹ، نہرو رپورٹ وغیرہ کا جائزہ لیتے ہوئے بہار کی سیاسی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ بہار میں کانگریس اور مسلم لیگ کی تنظیم، کانگریس کا رام گڑھ سیشن، ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک، شملہ کانفرنس، کیبنٹ مشن، عبوری حکومت، انتقال اقتدار، گویا ہندوستانی سیاست کا کوئی گوشہ ایسا نہیں، جسے تقی رحیم نے ادھورا چھوڑ دیا ہو۔ ہندوستان کے پورے سیاسی منظرنامے پر ان کی نگاہ ہے۔

۱۸۵۷ء میں پہلی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد جب ہر طرف خوف و ہراس کا عالم طاری تھا، علمائے صادق پور پٹنہ، انگریزی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی خفیہ تحریک چلا رہے تھے۔ بہار میں آزادی کی جدوجہد شروع سے ہی نیشنلسٹ مسلمانوں کی مرہونِ منّت رہی۔ بہاری مسلمانوں میں سامراج مخالف جذبات کی شدّت تھی اور تقی رحیم کے الفاظ میں:

> ''ملک بھر میں بہار ہی وہ واحد صوبہ ہے جہاں شروعاتی دَور سے لے کر خلافت و عدم تعاون کی تحریک تک کانگریس کی سربراہی مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہی۔''

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ ہر چند بہار کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کا حوالہ ترجیحی طور پر آیا ہے، لیکن یہ پوری کتاب ان لوگوں کے لیے بھی معلومات کا خزانہ ہے جو تقسیم ہند سے پہلے کی سو سالہ تحریکِ آزادی کے نشیب و فراز کو صحیح تناظر میں دیکھنا چاہیں۔ ایسی غیر جانب داری اور حقائق کی ایسی چھان پھٹک اس طرح کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں میں خال خال ملتی ہے۔ یہ صرف بہار کے مسلمانوں کی ہی نہیں، بلکہ ہندوستان کی پوری تحریکِ آزادی کی مستند تاریخ بھی ہے۔ اتنی گراں قدر کتاب میں ''کتابیات'' اور خصوصاً ''اشاریہ'' کا نہ ہونا ایک بڑی کمی ہے۔

کتاب کے آخر میں بہار کے چند مقتدر مسلم رہنماؤں کی عمدہ اور صاف تصویریں چھاپی گئی ہیں۔ ان میں مولانا مظہر الحق، مولانا شفیع داؤدی، مسٹر حسن امام، مسٹر عبد العزیز، مسٹر محمد یونس، مولانا عبد الباری اور کرنل محبوب احمد جیسے اکابرین شامل ہیں۔

''تحریکِ آزادی میں بِہار کے مُسلمانوں کا حصّہ'' اُردو میں اپنے موضوع پر پہلی اور صحیح معنوں میں وقیع کتاب ہے۔ یہ معلومات کا ایک ذخیرہ ہے جسے تقی رحیم نے نہایت خوش اسلوبی سے یکجا کیا ہے اور طرزِ اظہار ایسا دلنشیں کہ ایک لمحے کو گراں باری کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ اس کتاب کو حرزِ جاں بنا کر اپنے بک شیلف میں محفوظ رکھنا چاہیے۔

(''آج کل''، دہلی، مئی ۱۹۹۹ء)

روشنی

تیغ الٰہ آبادی* (مصطفیٰ زیدی)

اُردو شاعروں کی جدید ترین پود میں تیغ الٰہ آبادی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ ہر چند ابھی تیغ کو بہت زیادہ ناموری حاصل نہیں ہوئی، لیکن اس کی رفتار کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ فکر و تخئیل کی بہت سی سرحدیں عبور کرنے پر قادر ہے۔ تیغ کے زیرِ نظر مجموعۂ کلام "روشنی" میں اس کی چند غزلیں اور رُباعیاں بھی شریک ہیں، مگر ان کا درجہ بلند نہیں۔ وہ نظموں کا شاعر ہے اور شدّتِ احساس اور جوشِ جذبات اس کی نظموں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

("نئی کرن" دربھنگا، شمارہ ۳، اشاعت: فروری ۱۹۵۱ء)

بیکراں

جگن ناتھ آزاد

"بیکراں"، جگن ناتھ آزاد کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ آزاد، حضرت تلوک چند محروم کے صاحبزادے ہیں اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے والد کی حسین روایات کو آگے بڑھانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ آزاد کے اصلی جوہر غزلوں ہی میں کھُلتے ہیں۔ اُردو غزل کو نیا لباس اور نئی رُوح عطا کرنے والوں میں ان کی حیثیت مستحکم ہوتی جارہی ہے۔ ان کی نظمیں بھی نئے حالات کی اچھی ترجمانی کرتی ہیں۔ "بیکراں" کی نظموں اور غزلوں میں ضبط، نرمی اور تفکر کا عمدہ امتزاج ہے۔

("نئی کرن" دربھنگا، شمارہ ۳، اشاعت: فروری ۱۹۵۱ء)

---

* تیغ الٰہ آبادی بعد میں مصطفیٰ زیدی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا یہ شعر ان کی شناخت بن گیا ہے:

انہیں پتھروں سے ہوکر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اشاریہ "آج کل"

جمیل اختر

اشاریہ سازی کا کام ایک محنت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ اس کا تجربہ خود مجھے گزشتہ دِنوں ہوا، جب میں نے پچیس سال کے دوران چھپی ہوئی تمام آزاد غزلوں اور اس صنف سے متعلق ہر طرح کے شائع شدہ مواد کا اشاریہ تیار کرنے کی کوشش کی۔ اُردو والے اس نوع کا کام کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ کیوں کہ آرام طلبی کا تقاضا ہے کہ شعر کہے جائیں اور تنقید لکھی جائے۔

"آج کل" اُردو کا ایک تاریخ ساز رسالہ ہے۔ مختلف اوقات میں اس کے ادارے سے آغا یعقوب دواشی، وقار عظیم، جوش ملیح آبادی، معین احسن جذبی، شان الحق حقی، جگن ناتھ آزاد، بلونت سنگھ، عرش ملسیانی، شہباز حسین، مہدی عباس حسینی اور راج نرائن راز جیسے ادیب، شاعر اور صحافی وابستہ رہے ہیں۔ "آج کل" کا پہلا شمارہ ۲۵ نومبر ۱۹۴۲ء کو شائع ہوا تھا۔ اس وقت یہ حکومتِ ہند کے پشتو جریدے "تن پرون" کے اُردو ایڈیشن کی حیثیت سے نکلا کرتا تھا۔ یکم جون ۱۹۴۳ء سے یہ پشتو جریدے کا اُردو ایڈیشن نہیں رہا بلکہ باضابطہ اُردو کا "پندرہ روزہ باتصویر رسالہ" بن گیا اور اس کے پہلے مدیرِ اعلیٰ آغا محمد یعقوب دواشی مقرر ہوئے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۴۲ء سے دسمبر ۱۹۸۶ء تک ۴۴ سال کے دوران شائع شدہ تیس ہزار صفحات پر مشتمل چھ سو شماروں کا مکمل اور مبسوط اشاریہ مرتب کر کے جمیل اختر نے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ اُردو اکادمی دہلی تعریف کی مستحق ہے کہ اس نے اس وقیع کام کا منصوبہ تیار کیا اور اس کے لیے ایک مناسب ادبی خدمت گزار کا انتخاب کیا۔ میری دانست میں کم از کم ہندوپاک میں اُردو کا اتنا ضخیم کوئی اشاریہ شائع نہیں ہوا۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اشاریہ سازی عرق ریزی کے حوصلے کے ساتھ ایک مخصوص ذہن، مزاج اور ڈسپلن کا تقاضا کرتی ہے۔ جمیل اختر اس پل صراط سے بہ استقامت گزرے ہیں۔ ان کا طریقۂ کار سائنٹفک ہے اور اُنھوں نے اشاریہ سازی کے جدید ترین اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ خامیاں اور کوتاہیاں کہاں نہیں ہوتیں، اور اس طرح کے بڑے کام میں اس سے مفر بھی نہیں۔ لیکن جمیل اختر ہر چند اس میدان میں نو وارد ہیں، لیکن انھوں نے رہ نوردی کے آداب سے اپنی واقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

''آج کل''میں شائع شدہ مشمولات کو مختلف اصناف کے تحت تقسیم کر کے ان کے عنوانات کو حرفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ''آج کل'' کے ''اشاریہ'' کی جلد اوّل ہے۔ (دوسری جلد میں مشمولات کی ترتیب مصنف وار کی گئی ہے۔ دوسری جلد زیرِ اشاعت ہے) صرف اداریوں کا اشاریہ عنوان کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ جس طرح وہ ہر ماہ شائع ہوئے، اُسی ترتیب سے اشاریہ میں شامل ہیں۔ اسے ایک طرح ماہ بہ ماہ شائع ہونے والے اداریوں کی فہرست سمجھنا چاہیے۔ اداریوں کے سلسلے میں یہی ترتیب مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اداریوں کے اشاریہ میں ان تصاویر کے بھی حوالے ہیں، جو ان شماروں میں شائع ہوئیں۔

کتاب کی ابتدا میں ''حرفے چند'' کے تحت جمیل اختر نے اپنے طریقۂ کار کی وضاحت کر دی ہے۔ اس سے طالب علموں اور تحقیقی کام کرنے والوں کو اپنی پسند کے موضوع اور مشمولات کو تلاش کرنے میں آسانی ہوگی۔ ''آج کل'' میں شائع شدہ مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کے عنوانات ''مضامین'' اور ''مقالے'' مقرّر کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے اس سے بعض مضامین کی تلاش میں دُشواری ہو، مگر مرتب نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ ''مقالات'' کے حصے میں ادبی مضامین کا اشاریہ ہے اور ''مضامین'' کا حصہ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات سے متعلق ہے۔ البتہ اس میں ہلکے پھلکے مضامین بھی شامل ہیں، جن کی اہمیت مرتب کے خیال میں خالص ادبی مضامین کے مقابلے میں کم ہے۔ بہتر تھا کہ اس نوعیت کے مضامین اس حصے میں شامل نہ ہوتے۔

تقریباً سات سو صفحات کی اس کتاب میں کتابت کی غلطیاں نہیں کے برابر ہیں۔ سرسری طور پر دیکھنے میں دو تین غلطیاں سامنے آئیں۔ مثلاً صفحہ ۸۴ پر معین احسن جذبی کا دورِ ادارت یکم اگست ۱۹۴۳ء تا یکم فروری ۱۹۴۳ء چھپا ہے۔ یہ یکم فروری ۱۹۴۴ء ہونا چاہیے۔ صفحہ ۱۳۴ پر ''آج کل'' کے اداریوں کی فہرست میں ایک عنوان ہے: ''ممتاز مفتی کی وفات''۔ یہاں کوئی اور نام ہوگا، کیوں کہ ممتاز مفتی ماشاءاللہ ہنوز بقیدِ حیات ہیں۔ صفحہ ۳۷۹ پر ''سہیل نمبر'' نومبر ـ نومبر ۱۹۸۱ء چھپا ہے۔ غالباً یہ اکتوبر ـ نومبر ۱۹۸۱ء ہے۔ یوں صفحہ ۳۷۹ پر غلطی سے صفحہ نمبر ۳۸۹ چھپ گیا ہے۔

کتاب عمدہ چھپی ہے اور اُردو اکیڈمی دہلی کے معیار کے مطابق ہے۔ ۶۸۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۷۷ روپے مناسب ہے۔

''اشاریہ آج کل'' ایک ایسی ڈائرکٹری ہے جس سے ۴۶ سال کے دوران ''آج کل'' میں شائع شدہ ہر نوع کے مواد کی مفصل معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اور حوالے کی اس کتاب سے کئی تحقیقی کتابیں معرضِ وجود میں آ سکتی ہیں۔ یہ اشاریہ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے، جس میں مختلف النوع مضامین

نظم ونثر اور ان کے مصنّفین کے چہرے زیادہ روشن نظر آتے ہیں، اور ان کی شناخت بے حد آسان ہو جاتی ہے۔ ادب کا کوئی قاری اس "اشاریہ" سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

("آج کل" دہلی، ستمبر ۱۹۹۰ء)

اکتشافی تنقید کی شعریات

حامدی کاشمیری

اپنی تازہ کتاب "اکتشافی تنقید کی شعریات" میں حامدی کاشمیری نے جس طرح بعض ادب پاروں کی تحسین شناسی کا فریضہ انجام دیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بیشتر ناقدوں کی طرح اندھیرے میں تیر نہیں چلائے بلکہ ادب پارے کے بطون میں پہنچ کر ان کو صحیح تناظر میں پرکھنے اور ان کی داخلی خوبیوں کو آشکار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں شعر، نظم، مثنوی اور افسانے کے مطالعے پیش کر کے جس تجزیاتی طریق کار کا مظاہرہ کیا گیا ہے، وہ تجزیے کا اکتشافی عمل ہے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے تخلیق اور تنقید کے درمیان کوئی دوئی باقی نہیں رہتی بلکہ دونوں "من تو شدم تو من شدی" کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔

اس امر کا اعادہ غیر ضروری ہے کہ نفسیاتی تنقید فن کار کی باطنی زندگی کی گہرائیوں میں اُتر کر تخلیق کے بنیادی محرک کا اندازہ لگاتی ہے۔ جو تنقید بشریاتی نقطۂ نظر پر اصرار کرتی ہے وہ جہدِ حیات کو فن پارے کا محرکِ اوّل قرار دیتی ہے۔ اسی طرح مارکسی تنقید سماجی، اقتصادی اور تاریخی صورتِ حال کو فن پارے کی تفہیم و تحسین میں ترجیحی حیثیت دیتی ہے۔ یہ سارے نقاطِ نظر اپنی جگہ غیر اہم نہیں، لیکن یہ سچائیاں جزوی ہیں، کیوں کہ فن پارہ اتنا سادہ اور یک رُخی نہیں ہوتا جتنا وہ نظر آتا ہے۔ تخلیق اپنے قائم بالذات وجود میں مضمر توانائی کے ذریعے حیات و کائنات کے اسرار و رموز کے انکشاف کا تقاضہ کرتی ہے۔

اکتشافی تنقید کسی نظریۂ نقد کی حریف نہیں، بلکہ سب کو اپنے وسیع دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ یہ نہ کسی نظریہ کا جبر برداشت کرتی ہے اور نہ کسی نظریۂ نقد پر اپنا جبر مسلّط کرتی ہے۔

حامدی ایسا محسوس کرتے ہیں کہ روایتی تنقید ادب کی اصل قدر و قیمت متعین کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اکتشافی تنقید جن نکات پر زور دیتی ہے ان کی مدد سے ادب کی ایک معروضی لیکن بصیرت افروز

تعینِ قدر ممکن ہے۔

حامدی کا کہنا ہے کہ معنی کی ترسیل تخلیق کا بنیادی مسئلہ نہیں، بلکہ وہ تجربے کی کثیر الجہتی سے پیدا شدہ تجسس اور تحیّر کی جمالیات سے سروکار رکھتی ہے، اور اسی لیے حامدی نے اپنے تجزیاتی طریقِ کار میں اکتشافی عمل کو اہمیت دی ہے۔ انھوں نے بائیس تیئس سال پہلے ہی اپنی کتاب "اقبال اور غالب" (۱۹۷۸ء) کے ذریعے اس طریقِ تجزیہ کی ابتدا کر دی تھی۔ ناصر کاظمی اور میرؔ پر ان کی جو دو کتابیں ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئیں، ان میں اس طریقِ نقد کے خط و خال کچھ اور نمایاں ہوئے، اور انھوں نے تنقید کے اکتشافی کردار کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں میرؔ اور پھر معاصر تنقید سے متعلق اپنی کتابوں میں اظہارِ خیال کیا۔

ہمارے یہاں نئے خیال، نئے نظریہ اور نئے نقطۂ نگاہ کو ہمیشہ نہ صرف شک کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے بلکہ اسے منفی تنقید اور طنز و تضحیک کا نشانہ بھی بنایا گیا ہے۔ حامدی کاشمیری کے نظریۂ اکتشافی تنقید کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اس کی معنویت (Relevance) سے انکار کیا۔ ڈاکٹر سیّد محمد عقیل نے اپنی خودنوشت "گئو دھول" میں اکتشافی تنقید کا ذکر تحقیری انداز میں کیا اور ڈاکٹر فضلِ امام نے اسے "تعصباتی تنقید" سے تعبیر کیا۔ وہ اہلِ ادب جو اکتشافی طریقِ نقد کو فکر انگیز قرار دیتے ہیں، وہ بھی معترض ہیں کہ یہ طریقِ نقد فن پارے میں معنی کی حیثیت کو مشکوک بناتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ حامدی کاشمیری نے اپنا یہ موقف واضح اور معروضی طور پر پیش کرنے کی بجائے تاثراتی انداز اختیار کرتے ہوئے شاعری کو "طلسم کارانہ تخلیقِ فن" سے تعبیر کیا ہے۔ اور انھوں نے مصنف کی بجائے متن کو مرکزِ توجہ بنا کر "ہیئتی تنقید" کا طریقِ کار ہی اپنایا ہے۔

حامدی کاشمیری اصرار کرتے ہیں کہ شعر تجربے سے سروکار رکھتا ہے نہ کہ معنی سے، اور تنقید اسی شعری تجربے کی قدر و قیمت واضح کرتی ہے۔ شاعری سے زندگی کا تعلق بھی بالواسطہ ہے۔ شاعری زندگی کے اسرار کا جمالیاتی اکتشاف ہے۔ لہٰذا تخلیق معنی سے بے تعلقی کے باوجود زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتی۔ حامدی کاشمیری یہ بھی کہتے ہیں کہ پس ساختیاتی تنقید تخلیق کی کثیر المعنویت پر زور دیتی ہے، یعنی تخلیق میں معنی کی اہمیت کو قبول کرتی ہے۔ اکتشافی تنقید تخلیق کو کثیر المعنی قرار دینے کے بجائے اسے کثیر الجہت قرار دینا زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔

حامدی کاشمیری کا کہنا ہے کہ "افلاطون سے لے کر عہدِ حاضر تک کتنے ہی نقادوں نے فن کے طلسم کارانہ عمل کی وکالت کی ہے" اور فن کو "غیبی یا وہبی سرچشموں" سے جوڑا جاتا رہا ہے، اس لیے اگر وہ شاعری کو "طلسم کارانہ تخلیقِ فن" قرار دیتے ہیں تو کوئی عجیب و غریب بات نہیں کہتے۔

ہیئتی تنقید کی طرح اکتشافی تنقید بھی مصنف کی بجائے متن کی مرکزیت کو قائم کرتی ہے، لیکن بقول حامدی "وہ متن کے رگ وریشے میں مصنف کے گردش کرتے ہوئے لہو کی موجودگی کے منکر نہیں ہیں۔" کیوں کہ "یہی وہ لہو کی حرکت اور گرمی ہے، جو کلامِ میر کو میر سے منسوب کرتی ہے۔" لیکن "لہو کی موجودگی"، تخلیق کو مصنف کا نعم البدل نہیں بناتی۔

اکتشافی تنقید کے نظریہ کو تعصب کی عینک لگا کر نہیں، بلکہ کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے۔ یہ حامدی کاشمیری کا معمولی کارنامہ نہیں کہ انھوں نے ایک جدید تر نظریۂ تنقید وضع کیا ہے، جو اُردو میں بالکل نیا اور منفرد ہے۔ اور صرف نظریہ ہی پیش نہیں کیا، بلکہ اس کی روشنی میں عملی تنقید کے نہایت عمدہ نمونے بھی پیش کیے ہیں!

(سہ ماہی "مژگاں" کلکتہ، سالگرہ نمبر، جنوری تا جون ۲۰۰۴ء)

📖

اُجالوں کے گیت

سیّد حرمت الاکرام

سیّد حرمت الاکرام "جدید تر" شاعروں کی صف سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کلام جس میں مختلف اصنافِ سخن شامل ہیں، اچھے اور برے ہر طرح کے رسائل اور اخبارات میں چھپتا رہا ہے۔ اس لیے ان کا نام جانا پہچانا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں ناقدوں نے وہ مقام نہیں بخشا جس کے وہ مستحق ہیں۔ کیوں کہ آج کل جن "جدید تر" شاعروں کا نام اُچھالا جا رہا ہے، اُن میں سے اکثر کی بہ نسبت فنّی اور فکری شائستگی کے لحاظ سے حرمت الاکرام کا کلام زیادہ قابلِ توجہ ہے۔

"اُجالوں کے گیت" میں حرمت الاکرام کی پچیس منتخب نظمیں شامل ہیں اور خود شاعر کے قول کے مطابق ان کی "سولہ سالہ شاعری کے سمندر کے چند موتی ہیں۔" سمندر اور موتی کی بحث سے قطع نظر، بلاشبہ ان میں سے بیشتر نظمیں کشش انگیز اور ستائش کی مستحق ہیں۔

پرویز شاہدی نے اس مجموعہ کے دیباچے میں درست لکھا ہے کہ "حرمت صاحب بیان کی تازگی، اسلوب کی پاکیزگی، فنّی احتیاط، تشبیہوں اور استعاروں کی دلکشی کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں کوئی ایسی غلطی نظر نہیں آتی جو بہت نمایاں ہو۔ زبان بہت پیاری اور سلیس استعمال کرتے ہیں۔"

حرمت نے زندگی کی صحت مند اقدار کو اپنایا ہے۔ ان کے کلام میں فکری بلند پروازی اور فلسفیانہ گہرائی نہیں ملے گی، لیکن ان کے یہاں سقیم جذبات کو کہیں بھی دخل نہیں ہے۔ ''اُجالوں کے گیت'' بحیثیت مجموعی ایک عمدہ انتخاب ہے جن میں 'پیچ وخم'، 'فسانہ ناتمام'، 'مدّوجزر'، 'نیا سال'، 'عرضِ حال' اور 'حوصلہ' خاص طور پر وقیع نظمیں ہیں۔ لیکن ایک نظم ''یہ اعلان کردو'' کسی طرح بھی مجموعہ میں شامل کرنے کے لائق نہیں تھی کیوں کہ اس میں ایک خاص فرقے کے جارحانہ جذبات کو اشتعال انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہے، جو ادب کے صحت مند نظریہ کے منافی ہے۔

کتاب کے آخر میں چند اشتہارات شامل ہیں جو ذوقِ لطیف پر گراں گزرتے ہیں۔ کتابت و طباعت بہت عمدہ ہے اور کلکتہ میں چھپائی کے عام معیار کو دیکھتے ہوئے اس مجموعہ کے کاتب اور طابع دونوں کے لیے دل سے دُعائیں نکلتی ہیں۔

(ماہنامہ ''سہیل'' گیا، ستمبر ۱۹۵۷ء)

مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں حسن چشتی (مرتب)

مجتبیٰ حسین ہمارے تسلیم شدہ سربرآوردہ مزاح نگار ہیں۔ جو اُن کی تحریروں سے آشنا نہیں، اُس کا ادبی ذوق ہی نہیں، اُس کی اُردو دانی بھی محلِ نظر ہے۔ مجتبیٰ حسین فنِ مزاح نگاری کے مزاج شناس اور آداب آشنا ہیں۔ وہ زندگی اور معاشرے کی ناہمواریوں کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مزاح اور طنز کے محدّب شیشے سے اپنے اِردگرد پھیلی ہوئی نامعقولیت، بوالعجبی اور بے ڈھنگے پن کو نمایاں کرتے ہیں، مگر اس عمل میں اُن کے اندر برہمی یا خشونت کا رنگ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ جہاں نشتر چلاتے ہیں، وہاں مرہم کا پھایا بھی رکھتے ہیں۔ ان کا طنز کسی کو شرمندہ یا خجل کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ ان کی تحریر کی کاٹ اس زہر سے تہی ہوتی ہے جسے ہم آسانی کے لیے ''سادیت'' یعنی اذیت پسندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

طنز کو مزاح سے منہا کردیں تو وہ گالی بن سکتا ہے، یا اگر طنز بہت تیز ہو جائے تو وہ ہجو کہلاتا ہے۔ بنیاد دونوں کی بہر حال برہمی ہے۔ مجتبیٰ حسین طنز نگار سے زیادہ مزاح نگار ہیں۔ انھوں نے انسانی خامیوں، کمزوریوں اور تضادوں کا گہرا مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ کیا ہے جس نے ان کے اندر وہ بصیرت

پیدا کی ہے، جو معیاری فنی اظہار کے لیے ضروری ہے۔ ان کے طنز و مزاح سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی۔ وہ قاری کو اپنا ہمراز بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی ظرافت میں حزن اور درد کی جو ایک زیریں لہر موجود ہوتی ہے وہ انسان اور انسانی فطرت سے ان کی گہری ہمدردی کی غمازی کرتی ہے۔

طنز و مزاح نگار زبان کے پیچ و خم سے پوری طرح آگاہ ہوئے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کوزہ گر جس طرح مٹی کو مختلف شکل و صورت عطا کرنے پر قادر ہوتا ہے، اسی طرح طنز و مزاح نگار بھی الفاظ کو نئی شباہتوں سے معنوی آب و تاب بخشنے کی قدرت رکھتا ہے۔ رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شفیق الرحمٰن، کنہیا لال کپور، ابن انشاء، کرنل محمد خاں، خامہ بگوش اور سب سے بڑھ کر مشتاق احمد یوسفی سامنے کی مثالیں ہیں۔ مجتبیٰ حسین بھی اسی قبیلے اور اسی صنف میں اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ زبان و بیان پر ان کی غیر معمولی دسترس کے بھی قائل ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ مزاح نگار کا صرف ظریف ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی ضروری ہے۔ باظرف ہونے سے مراد یہی ہے کہ تحریر میں چھچھورانہ پن نہ ہو، مصنف میں قوتِ برداشت ہو، تمکین ہو، ورنہ مزاح اور طنز دونوں کو مبتذل پھکڑ پن بننے میں کیا دیر لگتی ہے! مجتبیٰ حسین کے مضامین سے عموماً اور ان کے خاکوں سے خصوصاً ان کے اس بیان کی توثیق ہوتی ہے۔ ان کی خاکہ نگاری پر ان کی انفرادیت کی مہر ہے اور خاکہ نگاری کے باب میں شاید اس وقت کوئی ان کا حریف نہیں۔ مجتبیٰ حسین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اُنھوں نے بیشتر خاکے "خود اپنا خاکہ لکھنے کی چاٹ میں" لکھے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کا خاکہ لکھتے لکھتے اپنا خاکہ بھی اُڑانے لگتے ہیں۔ یہ بھی ان کے "باظرف" ہونے کی دلیل ہے۔ ان کے مزاج میں مزاح اور فطرت میں تبسم شامل ہے۔ شگفتگی کے ساتھ برجستگی اور بے ساختگی ان کے اسلوب اور اندازِ بیان کا خاص جوہر ہے۔

مجتبیٰ حسین زندگی کے ہجوم میں نہ صرف خود شامل ہوتے ہیں بلکہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ وہ آدمی کو آدمی کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لیے صاحبِ خاکہ کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے قاری کے دِل میں ایک ہمدردانہ جذبہ پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی ظرافت میں طنز فطری طور پر شریک ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ بیان واقعہ کے ساتھ اکثر لطیفہ بھی تخلیق کر لیتے ہیں اور اسے اس طرح اپنی تحریر میں شامل کر لیتے ہیں کہ ان کے بیان واقعہ کا فطری جز و نظر آنے لگتا ہے۔ ان کی تحریروں میں کہیں کہیں باقاعدہ افسانوی فضا بھی ملتی ہے۔ ان کے اسلوب کا یہ بھی اعجاز ہے کہ وہ ہنستے ہنساتے اچانک قاری کی آنکھوں کو نم کر دیتے ہیں!

مجتبیٰ حسین کا ادبی سفر چالیس برس پر محیط ہے۔ وہ چودہ کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے

اکثر اب دستیاب نہیں ہیں۔ان میں سے چار شخصی خاکوں کے مجموعے ہیں۔ سات مجموعے مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ان کے اخباری کالموں کا بھی ایک مجموعہ ہے۔ان کے علاوہ سفرنامے ہیں جن میں سے ایک ''جاپان چلو، جاپان چلو'' غیر معمولی شہرت کا حامل ہے۔امریکہ میں مقیم معروف شاعر اور ادیب جناب حسن چشتی نے مجتبیٰ حسین کے بارہ مجموعوں سے ان کے مضامین اور خاکوں کا ایک نہایت عمدہ انتخاب ''مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں'' کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔ ان میں کچھ ایسی تحریریں بھی شامل ہیں جو کسی مجموعے میں موجود نہیں ہیں۔جلد اوّل میں ۴۶ مضامین شامل ہیں اور جلد دوم میں ۴۱ خاکے۔مضامین میں ''اُردو کا آخری قاری''، ''ڈاکٹر کا کتا''، ''میں نہیں آؤں گا''، ''حیدرآباد کا جو ذکر کیا''، ''سندباد جہازی کا سفرنامہ'' اور خاکوں میں مخدوم محی الدین، فیض، راجندر سنگھ بیدی، سلیمان اریب، عمیق حنفی اور مغنی تبسم کے خاکے بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ان انتخابات میں شامل تحریریں واقعی مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں ہیں اور ہر چند ان کی دوسری تحریروں کا بھی ایک الگ ذائقہ، ایک الگ لطف ہے، لیکن حسن چشتی کے محنت سے کیے ہوئے یہ انتخابات مجتبیٰ حسین کی بارہ کتابوں کا گویا عطر ہیں۔ یہ دونوں جلدیں اُن کے مداحوں کو اُن کی دیگر تصانیف سے بے نیاز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

جلد دوم کے آخر میں مجتبیٰ حسین کا ایک ''خود وفاتیہ'' ہے۔بطور نمونہ یہ سطریں دیکھیے اور مجھے اجازت دیجیے:

> ''عمر کے آخری حصے میں انھیں پتہ چل گیا تھا کہ طنز و مزاح وہ بالکل نہیں لکھ سکتے، کیوں کہ اندر سے وہ بہت غمگین آدمی تھے۔دوستوں کی محفلوں میں جی کھول کر ہنستے بولتے اور قہقہے لگاتے تھے۔لیکن جب تنہا ہوتے تو یہاں تک سوچتے کہ کیوں نہ خودکشی کر لیں۔ اس معاملے میں دوستوں سے مشورہ بھی کیا۔ایک دوست نے کہا کہ انھیں خودکشی کر لینی چاہیے۔وہ اس کے لیے تیار بھی ہو گئے تھے، لیکن ٹھیک اسی وقت دوسرے دوست نے انھیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔دوستوں کی بات وہ کبھی نہیں ٹال سکتے تھے، اس لیے دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا کہ ان کی خودکشی کے معاملے میں پہلے وہ متفق ہو جائیں۔ دونوں دوست اس مسئلے پر برسوں تبادلۂ خیال کرتے رہے اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔لہٰذا انھیں بے کار ہی زندہ رہنا پڑا۔آخر میں دونوں دوست تبادلۂ خیال کرتے کرتے خود اللہ کو پیارے ہو گئے۔''

(ماہ نامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد، فروری ۲۰۰۳ء)

جوئے سبز

حمید الماس

حمید الماسؔ کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جو زندگی کی تلخ و ترش حقیقتوں کو بھی رومان کی شیرینی سے ہم کنار کرنے کا فن جانتے ہیں۔ الماسؔ ایک عرصے سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کی شاعری ترقی پسند ادبی تحریک کے زیرِ اثر پروان چڑھی، لیکن انھوں نے اپنی شاعری کو ایک مخصوص سیاسی جماعت کی پالیسی کا آلہ کار بننے نہیں دیا۔ وہ جدیدیت کے بھی قریب آئے، مگر مقصدیت سے دامن بچانا انھوں نے ضروری نہیں سمجھا۔ وہ انسان دوست اور وطن پرست شاعر ہیں۔ ان کی پرورش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی ہے جس نے آزادی کی خاطر قربانیاں دی ہیں۔ ان کے نئے مجموعۂ کلام ''جوئے سبز'' کے انتساب سے معلوم ہوتا ہے کہ حمید الماس کے والد نے آزادی کی جنگ میں شہادت کا درجہ پایا:

خلاؤں سے کبھی تم جھانک کر دیکھو
تمھاری شمع روشن ہے
تمھاری بات جاری ہے
تمھارے خون کے چھینٹوں سے
یہ نظمیں مزین ہیں

حمید الماس کو اپنی دھرتی سے پیار ہے۔ اس کی نرمی، لطافت اور مٹھاس ان کی شاعری میں رچی بسی ہے:

مری زمیں بھی مقدس ہے میری ماں کی طرح
مری زمیں وہ تراشیدہ شعر ہے میرا
جو بے مثال بھی ہے اور لازوال بھی ہے

آج کا دَور موضوعاتی نظموں کے لیے سازگار نہیں ہے۔ آج زور اس بات پر ہے کہ ذات کے وسیلے سے کائنات، اس کے مظاہر اور مسائل تک رسائی حاصل کی جائے۔ براہِ راست اظہارِ بیان، مطبوع اور مقبول نہیں رہا۔ الماس نے اس خطۂ وطن پر نہ صرف ایک نظم لکھی ہے، بلکہ ایک فارسی نظم کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ آزادی، گاندھی، نہرو، راکھی کا تہوار، ہندو پاک جنگ — جیسے موضوعات پر، جو میری طرح بہتوں کو پیش پا اُفتادہ معلوم ہوں گے، حمید الماس نے نظمیں لکھی ہیں، اور انھیں مجموعے

میں شامل کیا ہے۔ اس مجموعے میں دو غنائیے بھی ہیں، جو شاید ریڈیو کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اور کچھ نہ سہی تو انھیں دو غنائیوں کی بنا پر اس مجموعے کو پڑھے جانے کی سفارش بے تکلفی سے کی جا سکتی ہے۔ ان غنائیوں میں موسیقی کا جو آہنگ ہے وہ دامنِ دل کھینچ لیتا ہے۔ مثلاً ایک غنائیہ ''پھر ہمارے خون سے تازہ ہوا رخسارِ وقت'' کی ابتدا اس گیت سے ہوتی ہے:

اے ارضِ وطن ، اے ارضِ وطن
تو رنگِ جہاں ، تو نورِ زمن
اے ارضِ وطن
اے ارضِ وطن
روشن ہے جبیں تاروں کی طرح
محبوب ہے تو پیاروں کی طرح
بازو ہیں ترے یاروں کی طرح
ہے صبح تری پھولوں کا بدن

ایسے وقت میں جب ہماری شاعری سے رجائیت کا عنصر کم سے کمتر ہو گیا ہے، حمید الماس کی نظمیں عزم و حوصلہ کا پیغام دیتی ہیں اور اُمید و یقین کی شمع جلاتی ہیں۔ ہمارا ملک ان دنوں جس دور سے گزر رہا ہے، اس میں یہ لے، یہ لہجہ خوش آئند ہے۔

(''آج کل'' دہلی، اپریل ۱۹۸۱ء)

نئی سمتوں کا شعور

خورشید سمیع

ڈاکٹر خورشید سمیع کے اکثر مضامین رسائل میں شائع ہو کر مرکزِ توجہ بنتے رہے ہیں۔ اب اُنھوں نے اپنے آٹھ مضامین کا ایک انتخاب ''نئی سمتوں کا شعور'' کے نام سے کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔ خورشید سمیع اپنی آراء کی پشت پناہی کے لیے مناسب دلیلیں لاتے ہیں اور موزوں حوالے پیش کرتے ہیں۔ وہ علم کیمیا کے اُستاد ہیں، سائنسی ذہن رکھتے ہیں، نفسیاتی تنقید کے اُصولوں پر نظر ہے، لیکن اپنی تنقیدوں کو عالمانہ مزعومات سے گراں بار نہیں کرتے۔

ہر چند خورشید سمیع نے نئی شاعری پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے، ادب وفن میں جنس کے عمل دخل اور تنقید کے نفسیاتی دبستان پر بھی گفتگو کی ہے، لیکن میرے خیال میں اس مجموعے میں سب سے اچھے مضامین ''نئی کہانیاں: ایک بازدید'' اور ''نئی افسانوی روایت'' ہیں جو اس کتاب کے ایک تہائی حصے کو محیط ہیں۔ ان مضامین سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو کے نئے افسانوی ادب کا مطالعہ اُنھوں نے سنجیدگی، دل جمعی اور ہمدردی سے کیا ہے۔ ان کے بعض نتائج سے اختلاف کے خاصے مواقع موجود ہیں، لیکن ان مضامین کی کامیابی یہی ہے کہ وہ فکر کو انگیز کرتے ہیں اور اپنے طور پر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔

''نئی سمتوں کا شعور'' ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نئے نقّاد کا پہلا تحفہ ہے جو معروضی مطالعے کا متقاضی ہے۔

(''آج کل'' دہلی، جولائی ۱۹۹۵ء)

مرقعِ غالب

خیر بہوروی (مرتّب)

اُردو کے ایک خاموش خدمت گذار کی حیثیت سے خیر بہوروی کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ ایک عرصہ تک انجمن ترقی اُردو ہند کے مرکزی دفتر سے وابستہ رہے اور کسی زمانے میں مولوی عبدالحق مرحوم کے دست راست سمجھے جاتے تھے۔ انجمن کی تنظیم اور اس کے لائحۂ عمل کی نشر و اشاعت نے خیر بہوروی کو اس حد تک مصروف رکھا کہ وہ تصنیف و تالیف کی جانب دلجمعی سے متوجہ نہ ہو سکے، ہر چند وہ اس کے پوری طرح اہل تھے۔ تاہم ''غالبیات'' کے سلسلے میں ان کی تحقیقی کاوشیں ایسی نہیں جنھیں فراموش کر دیا جائے۔ غالبؔ کی تصویروں سے متعلق انھوں نے خاص طور پر تحقیق و جستجو کی ہے۔ غالبؔ کی تصویریں جو مختلف کتابوں کی زینت ہیں، ایک دوسرے سے شباہت میں اس قدر بے تعلق ہیں کہ غالبؔ کی اصلی شکل و صورت کا تعین کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

''مرقعِ غالب'' دیوانِ غالب کا چغتائی ایڈیشن نہیں ہے، بلکہ خیر بہوروی کی مرتّب کردہ وہ کتاب ہے، جس میں غالبؔ کی دس تصویریں شامل ہیں۔ ان میں وہ متداول تصاویر تو ہیں ہی، جو دراصل مصوّروں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ان کے علاوہ غالبؔ کی اصل تصویر بھی ہے۔ خیر بہوروی نے ہر تصویر کے ساتھ نوٹ دے دیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فلاں تصویر کس طرح غالبؔ سے

منسوب ہوگئی اوران تصویروں میں معتبر اور مستند تصویر کون سی ہے۔ ''مرقع غالب'' سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ''دیوانِ غالب'' کے جرمنی ایڈیشن میں جو تصویر شامل کی تھی، وہ بھی اصلی نہیں تھی، حالانکہ اسی تصویر کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ غالب کی تصویروں کے سلسلے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے بھی ایک مضمون میں دادِ تحقیق دی ہے، لیکن خیر بہوروی کی پیشکش مختلف نوعیت کی ہے۔ اس میں غالب کی جو رنگین و سادہ، مستند اور غیر مستند تصاویر شامل ہیں، ان سے نقل و اصل کی تمیز میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ کتاب بڑے سائز پر اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ آرٹ پیپر کے ۴۴ صفحات ہیں۔ پوری کتاب بلاک سے چھپی ہے۔ اِدھر جو کتابیں حسنِ طباعت کے لحاظ سے خاص طور پر متاثر اور مرعوب کرتی ہیں، اُن میں ''مرقعِ غالب'' کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

قیمت پانچ روپے ہے جو اس کتاب کی اہمیت اور مرتب کی محنت کے پیشِ نظر زیادہ نہیں ہے۔

(سہ ماہی ''رفتارِ نو'' دربھنگا، سالگرہ نمبر، جنوری ۱۹۶۲ء)

بہارِ ینہ — ذی شان فاطمی

میں 'کھوئے ہوؤں کی جستجو' کو فی نفسہٖ ایک وقیع کام سمجھتا ہوں۔ ملک کے ہر علاقے میں خود اُردو کے حوالے سے بہت سی نابغۂ روزگار ہستیاں گزری ہیں جو اپنی بے نیازی یا امتدادِ زمانہ کا شکار رہیں، اوران کے کارنامے ہماری نگاہوں سے روپوش رہے۔ شاہ محمد ہاشم بہارؔ حسین آبادی بھی ایسی ہی مغتنم ہستیوں میں تھے جنھیں غزل، مرثیہ اور قصیدہ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انھیں اُردو دُنیا کے وسیع حلقے سے روشناس کرانے کا سہرا ذی شان فاطمی کے سر جاتا ہے۔ 'بہارِ ینہ' ہے تو تحقیقی مقالہ جو پیشہ ورانہ ضرورت کے تحت لکھا جاتا ہے، لیکن یہ اس نوعیت کا تحقیقی کام نہیں ہے جس پر آئے دن ہماری یونیورسٹیاں ڈگریاں نچھاور کرتی رہتی ہیں۔ ذی شان فاطمی نے نہ صرف شاہ محمد ہاشم بہارؔ کے کلام کے حصول میں بڑی جانفشانی کی ہے بلکہ فراہم کردہ مواد کو نہایت سلیقے سے پیش کر کے اپنی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ خود انھیں کے الفاظ مستعار لے کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے صوبۂ بہار کی اس تہذیبی کڑی کو، جو بیچ بیچ سے ٹوٹتی ہوئی نظر آتی ہے، جوڑنے کا نہایت اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

(''ترجمان''، عظیم آباد، شمارہ ۲، نومبر ۱۹۹۹ء)

خاکِ انا

راشد آذر

راشد آذر نے اپنے ایک مضمون "ایک شاعر، ایک نقطۂ نظر" (مطبوعہ "عصری ادب" دہلی، شمارہ ۱۸-۱۷، ۱۹۷۴ء) میں لکھا تھا:

"میرا نقطۂ نظر مارکسی ہے...... مارکسی فلسفہ میرے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ میرے لیے سانس لینا اہمیت رکھتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ان دونوں باتوں کی ضرورت ہے۔ جس طرح سانس لیتے وقت میں ہر لحظہ تازہ ہوا کو قبول کرتا اور آلودہ ہوا کو رد کرتا ہوں، اسی طرح مارکسی فلسفہ بھی مجھے یہ سکھاتا ہے کہ نئی حقیقت سے تازہ نتائج اخذ کروں اور پرانے نتائج ترک کروں۔"

راشد آذر اس دور کے ان خوش فکر شاعروں میں ہیں جنھوں نے اب تک مارکسی نقطۂ نظر اور ترقی پسندی سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ ان کے نئے مجموعۂ کلام "خاکِ انا" میں ایک شعر ہے:

یہ ہے مقام مرے غم کی آزمائش کا
جو میرے واسطے گھر بھی ہے اور دار بھی ہے

شاید اس شعر سے بھی ان کے ترقی پسندانہ طرزِ فکر کی شہادت مل سکے، لیکن عام طور پر ان کے زیرِ نظر مجموعے میں ایسی ہی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو محض ان کے ذاتی اور نجی احساسات و جذبات کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ ان میں کسی مخصوص نظریے کی تلاش تحصیل حاصل ہوگی۔ لب و لہجہ کے اعتبار سے یہ نظمیں اور غزلیں اس مزاج کی نشان دہی کرتی ہیں، جو ترقی پسندی کے زوال کے بعد اور جدیدیت کے فروغ سے پہلے ہماری شاعری پر حاوی تھا۔

"خاکِ انا" ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۸ء کے درمیان لکھی ہوئی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ایک نظم ۱۹۷۴ء کی بھی شامل ہے۔ تقریباً چالیس نظموں میں بہ مشکل تین چار آزاد نظمیں ہیں، ورنہ ساری نظمیں یا تو پابند ہیں یا معریٰ۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو نظم کے کسی خاص فارم پر اصرار کریں، لیکن لب و لہجہ کی تازگی اور بھیڑ سے ذرا الگ ہو کر کچھ کہنے کی اہمیت کا قائل ہوں۔ راشد آذر کے یہاں لب ولہجہ بالکل الگ یا منفرد نہیں ہے، لیکن اسے روایتی یا تقلیدی بھی نہیں کہہ سکتے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ باتیں ہیں اور ان کے پاس آراستہ و پیراستہ، فنی اسقام سے پاک طرزِ ادا ہے۔ وہ زبان و بیان

کے رمز سے آشنا ہیں۔ ان کے یہاں احساس کی لے تیز ہے اور ایک شکستہ دل گداختہ سے نکلی ہوئی آوازیں ہیں جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہیں:

یہ تیرے چہرے پہ پرچھائیاں اُداسی کی
عجیب لگتی ہیں ، ایسی تو کوئی بات نہیں
کہ شام ہوتے ہی میرا خیال آتا ہے
غرورِ حسن ترا شرمسار ہے ، اور تُو
بچھڑ کے مجھ سے، مرے واسطے پریشاں ہے
اگر یہ سچ ہے تو الزامِ بے وفائی دے
میں جرمِ بے گنہی کی سزا بھگت لوں گا

(نظم: جرمِ بے گنہی)

"خاک انا" کی نظمیں پڑھنے کے بعد مجھے شاعر کی نفاست پسندی کا قائل ہونا پڑا۔ ایسی نفاست پسندی، جس پر حیدر آباد کی تہذیب کا نقش ہے۔ عدمؔ کا مشہور شعر ہے:

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

اس میں ربودگی کے ساتھ ساتھ ایک ندیدہ پن بھی ہے۔ راشد آذر جب اسی خیال کو نظم کی صورت میں پیش کرتے ہیں تو ان کی فطری تہذیب اور شائستگی عود کر آتی ہے:

میں اُٹھ کے آتو چکا تیری بزم سے لیکن
اس ایک تشنۂ دیدار روح کی مانند
کہ تیرا درد جسے زندگی سے پیارا ہے
بھٹک رہا ہوں ترے گھر کے آس پاس کہیں
اس آس میں ، کہ کبھی اتفاق سے تجھ کو
مری وفا کی ، مرے پیار کی ضرورت ہو

(نظم: آس)

میں سمجھتا ہوں، راشد آذر بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں ارتکازِ خیال بھی ہے اور حسنِ تعمیر بھی۔ فکری اعتبار سے "خاکِ انا" کی نظمیں وارداتِ دل اور ان سے پیدا شدہ کیفیات سے عبارت ہیں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کا دائرۂ فکر محدود ہے، لیکن اس محدود دائرے میں

انھوں نے جس ضبط و نظم سے کام لیا ہے، اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

غزلیں اس رمز و کنایہ سے آشنا نہیں ہیں، جو غزل کے اشعار کو تہہ داری بخشتے ہیں۔ لیکن صاف اور سیدھے لب ولہجہ میں کہے ہوئے اچھے اشعار کی یہ مثالیں قابلِ توجہ ہیں:

میں عزم ترکِ وفا کر کے چل پڑا جس پر
مجھے یہ ڈر ہے کہیں وہ بھی تیری راہ نہ ہو
تمھارے خالِ سیہ کے جنوں میں خوف یہ ہے
ہمارا نامۂ اعمال بھی سیاہ نہ ہو

اس کے ملنے کا بھلا راز کہوں کس کس سے
لوگ کیا جانیں کہ ایسا بھی ہو جائے ہے
اس پہ تجدید تمنا کا نہیں ہے الزام
دل کی عادت ہی دھڑکنا ہے، دھڑک جائے ہے

ہم اپنی زندگی بھی تجھے سونپنے کو تھے
ہم کو خبر نہیں تھی کہ تُو بے وفا بھی ہے

(''آج کل''، دہلی، نومبر ۱۹۸۰ء)

منظوماتِ واہی

رضا نقوی واہی

اُردو کی موجودہ مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کا تذکرہ آئے تو سب سے پہلے ہمارا ذہن رضا نقوی واہی کی جانب منتقل ہوتا ہے۔ شائستگی اور متانت ان کے طنز و مزاح کے خاص اوصاف ہیں۔ اُردو کی ادبی روایات پر اُن کی گہری نظر ہے۔ اس پر مستزاد اُن کا سماجی شعور، عصری مسائل پر غیر معمولی گرفت اور مظاہرِ حیات کا تیز مشاہدہ۔ اعلیٰ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری، زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت اور الفاظ کے تخلیقی استعمال کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ رضا نقوی واہی کے کلام کا سرسری مطالعہ بھی اس

مفروضے پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے۔ قافیے تو گویا ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ افکار و خیالات خود ہی طرزِ ادا کے سانچے میں منتقل ہو رہے ہیں۔

''منظوماتِ واہی'' رضا نقوی واہی کا آٹھواں اور تازہ ترین مجموعۂ کلام ہے جو اُن کے گذشتہ مجموعے ''شعرستانِ واہی'' کی اشاعت کے تقریباً نو سال بعد منظرِ عام پر آیا ہے۔ ۲۶۴ صفحات کے اس مجموعے میں ۱۲۴ منظومات ہیں۔ موضوعات متنوّع ہیں۔ یہ ایک طرح رضا نقوی واہی کا کلیات ہے۔ ''شعرستان'' سلسلے کی پندرہ اور نئی نظموں کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ اس میں واہی کی تقریباً تمام اہم اور معروف نظمیں شامل ہیں۔

واہی کے طنز و مزاح میں اشتعال انگیزی اور زہرناکی نہیں۔ وہ اس خلوص اور نیک نیتی سے آئینہ دِکھاتے ہیں کہ اُن کا ہدف اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا جائزہ لینے کے علاوہ ان کے طنز سے محظوظ بھی ہو سکتا ہے۔ 'محقق'، 'نقاد' اور 'مکتوبی ادیب' جیسی اعلیٰ پائے کی نظمیں اس بیان کی تائید کرتی ہیں۔ منظوم مکتوب نگاری میں واہی نے اپنی الگ امتیازی حیثیت بنائی ہے اور اس اندازِ سخن میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ اس مجموعے میں بھی ان کے سترہ منظوم خطوط شامل ہیں۔ پیروڈی نگاری غیر معمولی فنّی مہارت اور اعلیٰ ذہانت کا تقاضا کرتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے ''آدمی نامہ'' کے رنگ میں ''پروفیسر نامہ'' اور پرویز شاہدی کی نظم ''شیروانی'' کی پیروڈی کے طور پر ''لے میری زیرپائی'' واہی کی نظموں میں بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔

(''آج کل''، دہلی، مئی ۱۹۹۳ء)

📖

سنگِ جاں

زاہدہ زیدی

زاہدہ زیدی موجودہ دَور کی ایک معتبر اور ممتاز شاعرہ ہیں۔ ان کے پہلے دو شعری مجموعوں ''زہرِ حیات'' اور ''دھرتی کا لمس'' کو ادبی دنیا میں پذیرائی حاصل ہو چکی ہے۔ ''سنگِ جاں'' ان کا تیسرا اور تازہ ترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ۳۲ نظمیں، ۸ غزلیں اور ۴ نثری نظمیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھوپال گیس المیہ سے متعلق سات حصوں پر مشتمل ایک طویل نظم اور اٹلی کے مشہور شاعر یوجینیو مونتالے کی پانچ نظموں کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس طرح نظموں کی مجموعی تعداد ۴۸ ہے۔ ایک کے علاوہ یہ ساری

نظمیں آزاد نظم کے فارم میں ہیں۔ زاہدہ زیدی کا غالب رجحان نظم نگاری کی جانب ہے۔ غزلوں کی یورش کے دور میں اسے ایک نیک شگون ہی سمجھنا چاہیے۔

زاہدہ زیدی کی ادبی دلچسپیاں متنوع ہیں۔ وہ خود بھی ڈرامے لکھتی ہیں۔ اور غیر زبانوں کے اہم ڈراموں کو اُردو میں منتقل بھی کرتی ہیں۔ ان کے طبع زاد ڈراموں کا ایک مجموعہ "بند کمرہ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ انھوں نے بعض تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کے یہاں ایک عالمی نقطۂ نظر ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی ادبیات کے مطالعے کا یہ براہِ راست اثر ہے۔ چونکہ وہ خود انگریزی ادبیات کی معلم رہی ہیں، اس لیے انھیں ادب کے عمدہ نمونوں سے استفادے کے مواقع ملتے رہے ہیں۔

زاہدہ زیدی کے افکار میں دورِ حاضر کی بے قرار روح جلوہ گر ہے۔ ان کے کلام میں آج کے انسان کی محرومیوں اور معذوریوں، اس کی بے یقینی، اس کی تہذیب کے بام و در کی شکست کی داستان بھی ملے گی۔ یہ آج کے مسائل ہیں اور ان سے صرفِ نظر کرنا آج کے فنکار کے لیے ممکن نہیں۔ لیکن زاہدہ زیدی کی شاعری میں اور بھی بہت کچھ ہے، کیونکہ شاعری صرف حال پر نظر نہیں رکھتی، وہ زمان و مکان کی حدوں کو توڑتی بھی ہے۔ وہ زندگی کے ان مسائل سے بھی تعلق رکھتی ہے جو ازلی اور ابدی ہیں اور جو انسانی روح کو ہمیشہ مضطرب رکھتے ہیں:

اے ہوا
کیا تری بے قراری میں ہے
کوئی پیغامِ اُلفت نیا
یا کہ نوحہ کناں
کوئی بیتے دِنوں کی صدا
اے ہوا!
کیا مرے بحرِ جاں کا تلاطم ہے تُو
یا کہ صدیوں کے ساحل پہ پھینکی ہوئی
کوئی مبہم نوا

زاہدہ زیدی کی نظم "ہزاروں رنگ تھے" ماضی اور حال کے تفاوت کو ایک المیے کی شکل میں پیش کرتی ہے۔ زندگی کبھی رنگوں کی سحرکاری کا مظہر تھی۔ کتنے بھرپور رنگ تھے! ان رنگوں کی تفصیل خود شاعرہ کی زبانی سنئے جو ان کی قادر الکلامی اور فنی دسترس کا ثبوت بھی ہے:

ہزاروں رنگ تھے
نیلے، گلابی، کاسنی، اودے
روپہلے، شفقی، پیلے، سنہری، سُرخ، بادامی
ہرے، آبی، شہابی، آسمانی، بیگنی، دھانی
شرابی، شربتی، بھورے، بسنتی، چمپئی، پیازی
حنائی، ارغوانی، جامنی، فیروزی، انگوری
گل شفتالو، کاہی، مونگیا، نارنجی، عنابی

انسان کو ہمیشہ اپنی تلاش رہی ہے اور وہ اس جستجو میں ان بے نام راہوں سے گزرتا ہے کہ اکثر خود کھو جاتا ہے:

مرے وجود و عدم کی منزل میں
لاکھ صدیوں کے فاصلے ہیں
یہ میرا مدفن بھی پوچھتا ہے کہ میں کہاں ہوں
نہ میں یہاں ہوں نہ میں وہاں ہوں

کچھ نظمیں فوری ردِ عمل کا نتیجہ ہیں۔ ایک نظم اندرا گاندھی پر ہے جو رسمی مدح سرائی کی حامل ہے۔ ایک نظم خواجہ احمد عباس کی موت پر کہی گئی ہے جس کا خاموش حزن اثر انگیز ہے۔ بھوپال گیس المیہ کے تعلق سے گویا سات مختصر نظمیں مربوط ہو کر ایک مکمل نظم کی صورت میں نمو پاتی ہیں۔ اس طویل نظم میں شاعرہ کے دل کا درد پوری طرح سمٹ آیا ہے۔ نظم ''تتلی'' کا خیال غیاث احمد گدی کے مشہور افسانے ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' سے اخذ ہے، جس کا اعتراف مجموعے میں موجود ہے۔

یوجینیو مونتالے کی نظموں کے ترجمے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ یہ اطالوی شاعر کے کلام کی معجزہ نمائی بھی ہے اور زاہدہ زیدی کے ترجمے میں پیوست ان کے تخلیقی وفور کی کارفرمائی بھی:

اے بحرِ قدیم!
آج بھی میں
سرشارِ نوائے نیلگوں ہوں
موجوں کے لبوں پہ مرتعش ہیں
نغماتِ زمردیں کہ جیسے
بجتی ہوئی گھنٹیاں فضا میں

(۱۹۹۸ء)

سہ ماہی "ذہنِ جدید" (شمارہ ۱ و ۲) زبیر رضوی (مرتب)

بہت دنوں کے بعد اُردو کا ایک ایسا جریدہ منظرِ عام پر آیا ہے، جو چونکاتا ہی نہیں جھنجھوڑتا بھی ہے۔ میں نے جھنجھوڑنے کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے۔ "چونکانا" ایک لمحاتی طرزِ عمل ہے، اور "جھنجھوڑنا" نسبتاً دیرپا طریقِ عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ اس رسالے کا نام "ذہنِ جدید" ہے اور اس کے مرتب زبیر رضوی ہیں جنھیں بحیثیت شاعر درجۂ اعتبار حاصل ہے۔

سہ ماہی "ذہنِ جدید" کا پہلا شمارہ ہی مرکزِ گفتگو تھا کہ دوسرا شمارہ بھی ٹھیک تین ماہ بعد منصۂ شہود پر آ گیا ہے۔ پہلی ہی نظر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ آج کا رسالہ ہے۔ اُردو ادب کے تخلیقی نمونوں کو پیش کرنے کے علاوہ ہندوستانی اور عالمی ادب، مصوری، موسیقی، فلم، تھیٹر وغیرہ میں جو تازہ ترین صورتِ حال ہے اس کے بارے میں کسی نظریاتی موشگافی کے بغیر یہ جریدہ معروضی طور پر پُرکشش انداز میں معلومات بہم پہنچاتا ہے اور سیاسی و عمرانی مسائل سے بھی صرفِ نظر نہیں کرتا۔ اس رسالے کا خاص وصف اس کی Readability ہے یعنی "ذہنِ جدید" کا مطالعہ پہلے صفحے سے آخری صفحے تک یکساں دلچسپی کے ساتھ بغیر کسی جبر و اکراہ کے کیا جا سکتا ہے۔

جریدے کی ابتدا کسی نہ کسی بحث سے ہوتی ہے۔ پہلے شمارے میں "اشتراکی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے پیشِ نظر ترقی پسندی کی معنویت" پر بلراج کومل، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر قمر رئیس، دیوندر اسر اور وحید اختر نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس بحث سے پہلے میخائیل گورباچوف کے اس نہایت اہم انٹرویو کا اقتباس دیا گیا ہے جو مشہور امریکی جریدے "ٹائم میگزین" نے ان سے لیا تھا اور جس کی اشاعت اس کے ۴ر جون ۱۹۹۰ء کے شمارے میں ہوئی تھی۔ "بحث" ہی کے باب میں باقر مہدی کے مضمون "ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش" کا دوسرا حصہ شریک ہے۔ اُکھڑی اُکھڑی زبان اور بعض متضاد بیانات کے باوجود مضمون خاصا معلومات افزا ہے۔

دوسرے شمارے کی بحث "اُردو فکشن، تنقید اور روایت" سے متعلق ہے۔ شرکاء ہیں: مظفر علی سیّد، انتظار حسین اور مسعود اشعر۔ فکشن کی تنقید کے تعلق سے اس بحث میں بہت سی غیر رسمی باتوں کا اظہار ہوا ہے۔ ان پر مزید گفتگو ہونی چاہیے۔ مظفر علی سیّد کی مختصر تحریر (یا گفتگو جو ضبطِ تحریر میں لائی گئی ہے) ہندوستان والوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اسی حصے میں جوگندر پال کا مضمون "اُردو کہانی کا سفر"

بھی شامل ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ ایسی کئی باتیں ہیں جو صرف جوگندر پال ہی کہہ سکتے ہیں، بلکہ اس میں نئے الفاظ تراشنے کا عمل بھی ملتا ہے۔ یہ ساری بحثیں فکر انگیز ہیں۔

دونوں شماروں کا افسانوی حصہ جاندار ہے۔ نام بھی بڑے اور درشن بھی بڑے۔ پہلے شمارے میں شامل بانو قدسیہ کا افسانہ ''دربدر'' فن کی بلندیوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دو نسلوں اور دو تہذیبوں کے ذہنی رویوں کے تفاوت، زر کی طمع میں ڈوبے ہوئے بیٹے کے ہاتھوں ماضی، مذہب اور عقیدے سے جڑے ہوئے باپ کا قتل کچھ اتنی اثر آفرینی کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اس کی کوئی اور مثال اُردو افسانے میں شاذ ہی ملے گی۔ سریندر پرکاش کے دونوں ہی افسانے ''خیال صورت'' اور ''حاضری جاری'' قابلِ توجہ ہیں، بلکہ موخر الذکر تو ان کے بہترین افسانوں کی صف میں بلا تکلف شامل ہو سکتا ہے۔ جیلانی بانو کی ''ابنِ مریم'' کو بھی ان کی بہت اچھی کہانیوں میں شمار کرنا چاہیے۔ انور عظیم اور عوض سعید کی کہانیاں بھی اپنی بعض باطنی خصوصیات کی بنا پر متوجہ کرتی ہیں۔ عبداللہ حسین کے نئے ناولٹ ''قید'' کا ایک ٹکڑا بھی افسانے کے باب میں پیش کیا گیا ہے۔

ممتاز مفتی اس وقت ہمارے بزرگ ترین افسانہ نگاروں میں ہیں لیکن ان کا قلم اب بھی تر و تازہ ہے۔ ان کے ''گوشے'' سے پہلے شمارے کو زینت بخشی گئی ہے۔ اس گوشے میں ممتاز مفتی کے جانے پہچانے افسانے ''دیکھن دُکھن'' کے علاوہ اشفاق احمد کا لکھا ہوا خوبصورت خاکہ اور ممتاز مفتی سے زبیر رضوی اور مسعود اشعر کا لیا ہوا ایک انٹرویو بھی شامل ہے۔ ممتاز مفتی لاگ لپیٹ کے بغیر لکھنے اور باتیں کرنے کے قائل ہیں۔ ان کی باتیں دلچسپ بھی ہیں اور ذہن کو متحرک بھی کرتی ہیں۔

دوسرے شمارے کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں انتظار حسین، رضیہ فصیح احمد، رشید امجد، مظہر الاسلام اور غلام جیلانی کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ موہن تھپلیان کی ہندی اور بی پرکاش کی کنڑ کہانی کے تراجم بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ان کہانیوں سے ان دونوں زبانوں میں لکھے جانے والے افسانوں کے رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی شمارے میں اصغر وجاہت کا طویل ڈراما (۴۴ صفحات) ''جس نے لاہور نئیں دیکھا وہ جنما ہی نئیں'' جو حبیب تنویر کی ہدایت میں اسٹیج ہو چکا ہے، بطور خاص توجہ چاہتا ہے۔ اصغر وجاہت ہندی افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ ان کا یہ ڈراما اپنے موضوع کے اعتبار سے طاقتور اور موثر ہے۔

''ذہنِ جدید'' نے طنز و مزاح کا بھی مستقل باب قائم کیا ہے۔ پہلے شمارے میں دلیپ سنگھ کا مضمون ''جوس کا گلاس'' ہمارے معاشرے اور سیاست کی ریاکاری پر بھرپور طنز ہے۔ دلیپ سنگھ اپنے چوڑے شانوں کی بدولت مزاح نگاروں کی پہلی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا

ہے کہ ان کے رُوپ میں کنہیالال کپور نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ دوسرے شمارے میں شامل ان کا مضمون ''گوشے میں قفس کے'' بھی میرے اس خیال کی تائید کرتا ہے۔

یوسف ناظم کے مزاح کی دلآویز نرم خوئی ان کے مضمون ''چند اشیائے خوردنی'' میں بھی نمایاں ہے۔ عظیم اختر نے نسبتاً مختصر عرصے میں بحیثیت مزاح نگار اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔ وہ جن کرداروں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہیں، وہ اُردو دنیا سے متعلق ہمارے جانے پہچانے کردار ہیں اور انھیں ان کی اصل صورت میں دیکھ کر ہمیں ملال ہوتا ہے۔ ''ماموں نسیم لالہ'' بھی ایک ایسے ہی کردار ہیں۔

''ذہنِ جدید'' کے پہلے شمارے میں بلراج کومل، محمد علوی، وحید اختر، مخمور سعیدی اور زبیر رضوی کی نظمیں شامل ہیں۔ اس شمارے میں کوئی غزل نہیں ہے لیکن دوسرے شمارے میں اختر حسن، بلراج کومل، وزیر آغا، ندا فاضلی، عزیز قیسی، کشور ناہید، بشر نواز، انور معظم اور زبیر رضوی کی نظموں کے ساتھ ساتھ باقر مہدی، محمد علوی، شہرت بخاری، محسن زیدی اور جاوید ناصر کی غزلیں بھی شامل ہیں۔

پہلے شمارے میں فیض اور قرۃ العین حیدر کے انٹرویو عام لہجے سے مختلف ہیں اور موجودہ ادبی تناظر میں ان کی معنویت قابلِ لحاظ ہے۔

اس جریدے کے دو خاص عنوانات ''ہندوستانی ادب'' اور ''عالمی ادب'' ہیں۔ پہلے شمارے میں کنڑ، ہندی، پنجابی اور ہندوستانی انگریزی ادب کی موجودہ صورتِ حال پر مضامین ہیں۔ دوسرے شمارے میں خشونت سنگھ سے انٹرویو ہے۔ انھیں کی تحریر اور شخصیت کی طرح دلچسپ! ''ہندی کہانی، کل اور آج'' کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مباحثہ ہے، جس میں اصغر وجاہت، راجندر یادو، رمیش اُپادھیائے اور سوئم پرکاش نے حصہ لیا ہے۔

پہلے شمارے میں فلسطین کے احتجاجی ادب (جو ''ادبِ انتفاضہ'' کے نام سے موسوم ہے) سے ایک حصہ مختص ہے۔ زبیر احمد فاروقی نے ''ادبِ انتفاضہ'' کا تعارف کراتے ہوئے فلسطینی کے دو افسانوں اور دو نظموں کے عمدہ تراجم پیش کیے ہیں۔ نظموں کے منظوم ترجموں میں تخلیقی شان پیدا ہوگئی ہے۔ دوسرے شمارے میں بھی ''عالمی ادب'' کے تحت زبیر احمد فاروقی نے جدید عربی شاعری پر ایک تعارفی نوٹ کے ساتھ دو جدید عربی شاعروں البارودی اور الشابی کی نظموں کو منظوم اُردو جامہ پہنایا ہے۔ اس حصے میں البیر کامیو، اوکتاو پاز، انتولیا بائٹ، ہمنگوے، جین آسٹن اور ارونگ ویلس پر تعارفی مضامین اور اسٹفن اسپنڈر کا ایک انٹرویو بہت سی نئی معلومات فراہم کرتے ہیں۔

ان مستقل عنوانات کے علاوہ پہلے شمارے میں رابندر ناتھ ٹیگور اور وکٹوریہ اوکمپو کے جذباتی لگاؤ

کے سلسلے میں ایک نرم و نازک مضمون ہے۔ اس مضمون میں اپنی زبان میں لکھی ہوئی وکٹوریہ کی اس خودنوشت سے استفادہ کیا گیا ہے جو اس کی وصیت کے مطابق اس کے انتقال کے بعد ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح دوسرے شمارے میں بنگالی زبان کے لٹل میگزین، ویڈیو میگزین اور ملیالم کی مقبول صحافت پر مضامین ہیں اور پھر کتابوں کی باتیں۔ اُردو کتابوں پر تبصروں کے ساتھ ساتھ انگریزی کی ان کتابوں کا بھی تعارف کرایا گیا ہے جن کا انگریزی رسائل اور اخبارات میں چرچا ہوتا ہے، مگر اُردو والے ان سے عموماً بے خبر ہوتے ہیں۔

اب تک تو ذکر تھا ادب کا۔ لیکن ''ذہنِ جدید'' نے صرف ادب تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے اور یہی اس کی بڑی خوبی ہے۔ ہمارے رسائل کی عام تصویر یہ ہے: کچھ مضامین (جنھیں اکثر ''مقالے'' کہا جاتا ہے) کچھ افسانے، کچھ نظمیں، غزلیں، چند کتابوں پر تبصرے، قارئین کے کچھ خطوط۔ اللہ اللہ خیر صلاً۔ ''ذہنِ جدید'' ایک مختلف نوعیت کا رسالہ ہے اور صحیح معنوں میں ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔

''ذہنِ جدید'' غالباً اُردو کا پہلا رسالہ ہے جس میں اُردو ادب کی تخلیقات اور مباحث کے ساتھ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادب اور غیر ملکی ادب کے تازہ رجحانات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں فلم، تھیٹر، مصوری (کینوس) اور موسیقی پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں معلوماتی مضامین پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے شمارے میں منو پاریکھ اور دوسرے شمارے میں وان گو، ایم۔ ایف حسین، کرشن کھنہ، ستیش گجرال اور این سوزا جیسے ماہرینِ فنِ مصوری پر اچھا مواد پیش کیا گیا ہے۔ خود حسین کا تحریر کردہ ایک مضمون بھی ہے اور ان کی نظمیں بھی۔ اس شمارے میں خاصہ بڑا حصہ (تیس صفحات) فنِ مصوری سے متعلق ہے۔ پہلے شمارے میں ''مدھوبنی پینٹنگ'' پر اور دوسرے شمارے میں ایک مضمون ''عصری مصوری'' پر بھی ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اب سے ۲۵ سال پہلے ہی متھلا کی ''مدھوبنی مصوری'' نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔

پہلے شمارے کے حصہ فلم میں لتا منگیشکر سے ۱۸ سال پہلے آل انڈیا ریڈیو کی ''اُردو سروس'' کے لیے لیا ہوا ایک غیر مطبوعہ اہم انٹرویو ہے۔ پھر گریٹا گاربو، سری لیکھا اور انورادھا پوڈوال کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں بڑی دلچسپ اور چونکا دینے والی معلومات ہیں جن سے اُردو والے عموماً ناآشنا ہیں۔ دوسرے شمارے میں موسیقار نوشاد پر گرجا راجندرن کا ایک مضمون ہے۔ پھر کمرشیل سینما، فلمی موسیقی کے بدلتے رُوپ، پُراسرار فلموں اور سینما ہال کے متعلق مضامین ہیں، جن کے لکھنے والوں میں دیویندر اسر اور مشہور فلمی مبصر سبھاش کے جھا شامل ہیں۔

تھیٹر اور اسٹیج کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ روبہ زوال ہے۔ اس سلسلے میں سری رام سنٹر

کے ڈائریکٹر سیودھ لال کے مضامین "اچھے اسکرپٹ نہیں ملتے" اور "دلی تھیٹر کا منظر نامہ" غور طلب ہیں۔ دوسرے شمارے میں لوک کلاکار تیجن بائی پر دیپا گہلوٹ کا مضمون بھی قابلِ مطالعہ ہے۔

پہلا شمارہ (ستمبر تا نومبر ۱۹۹۰ھ) ۲۰۳، اور دوسرا شمارہ (دسمبر ۱۹۹۰ء تا فروری ۱۹۹۱ء) ۲۳۵ صفحات پر مشتمل ہے لیکن ۳۱ سطری خفی کتابت میں اتنے صفحات سے کہیں زیادہ کا مواد سمویا ہوا ہے۔ ایک شمارے کی قیمت بیس روپے ہے، جو اتنے مواد کے پیشِ نظر کم ہے۔

اس رسالے میں بہت کچھ ہے۔ یہ ایک ایسا متنوع اور رنگا رنگ جریدہ ہے جس کا ایک ادبی اور صحافتی وقار بھی ہے۔ جو لوگ ادب، آرٹ اور کلچر کے مختلف مظاہر اور تیور سے باخبر رہنا چاہتے ہوں، ان کے لیے "ذہنِ جدید" ایک ذہنی اور روحانی ضرورت ہے۔

(ماہنامہ "کتاب نما" دہلی، جون ۱۹۹۱ء)

چترلیکھا

بھگوتی چرن ورما (مصنف)
سعید سہروردی (مترجم)

بھگوتی چرن ورما اور ان کی تصنیف "چترلیکھا" کو ہندی ادب میں ممتاز بلکہ کلاسیکی درجہ حاصل ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ انگریزی اور چند دیگر مغربی زبانون میں بھی ہو چکا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ادارۂ انیس اُردو نے اِس کتاب کا اُردو ترجمہ شائع کیا۔ اس وقت جبکہ اُردو کی تقریباً تمام اہم ادبی تصانیف ہندی میں منتقل ہو چکی ہیں یا سرعت سے منتقل ہو رہی ہیں، اِس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہندی کی اہم تصانیف کا اُردو ترجمہ پیش کیا جائے، لیکن بدقسمتی سے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ اس اعتبار سے بھی ہم "چترلیکھا" کے اُردو ترجمے کو ایک خوش گوار اضافہ سمجھتے ہیں۔ سعید سہروردی نے اِس خوبصورتی سے اِسے اُردو میں منتقل کیا ہے کہ طبع زاد تصنیف کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

"چترلیکھا" بنیادی طور پر اناطول فرانس کی "تائیس" سے قریب ہے۔ اس کتاب کے مختصر سے دیباچے میں "تائیس" کی طرف جو اشارہ ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ بھگوتی چرن ورما کو "چترلیکھا" کی تصنیف کا خیال "تائیس" کے مطالعے سے ہی آیا ہوگا۔ لیکن "چترلیکھا" نہ صرف یہ کہ "تائیس" کا چربہ نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ ایسے فلسفیانہ مباحث بھی ہیں جو اسے "تائیس" سے افضل اور برتر بناتے

ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مغربی ادب کے ثنا خوانوں کو یہ بات ناگوار گذرے گی، لیکن ہمیں اِس احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ ہماری ہر تصنیف غیر ملکی تحریروں کے مقابلے میں فروتر ہے۔

اناطول فرانس کا پلاٹ صرف اِسی قدر ہے کہ تائیس نامی ایک رقاصہ کو ایک راہب راہ راست پر لانے کا تہیہ کرتا ہے۔ اسے مذہب و ریاضت کی تلقین کرتا ہے اور آخر کار اُسے لہو و لعب کی زندگی سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن اِس عمل کے دوران وہ خود ''تائیس'' کے جسم کے لیے تڑپنے لگتا ہے اور اس کی ساری رہبانیت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

''چترلیکھا'' بھی ایک رقاصہ ہے۔ جس کا مقصدِ حیات آسائش اور عیش و عشرت ہے، لیکن وہ نوجوان یوگی کمارگری کی جسمانی وجاہت کے ساتھ ساتھ اس کی ریاضت اور روحانی عظمت سے متاثر ہو کر اس سے محبت کرنے لگتی ہے اور دنیا تیاگ دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ دنیاوی عیش و آسائش کو خیرباد کہہ کر کمارگری سے مرید ہونے کو اس کی کُٹیا میں آتی ہے اور بالآخر اس کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے۔

اناطول فرانس سے یہ تھوڑی سی مماثلت بھگوتی چرن ورما کے یہاں بھی ہے، لیکن ''چترلیکھا'' صرف ایک رقاصہ کی کہانی نہیں ہے۔ ''تائیس'' میں دو ہی کردار اہم ہیں — تائیس اور راہب۔ لیکن ''چترلیکھا'' میں چترلیکھا کے علاوہ بیج گپت، کمارگری، شیوتانک، وشال دیو، یشودھرا اور رتنامیر سب ہی اہم کردار ہیں۔ ''چترلیکھا'' کا پلاٹ ''تائیس'' سے زیادہ پیچیدہ اور تہہ دار ہے۔ ممکن ہے خالص فنی اعتبار سے ''چترلیکھا''، ''تائیس'' کے درجے تک نہ پہنچ سکے، لیکن گناہ و بدی کے مسئلے پر جس انداز و طریق سے یہ کتاب روشنی ڈالتی ہے، وہ بھگوتی چرن ورما کا ہی حصہ ہے، اور بلاشبہ اس میں ان کی ''روح کا سنگیت'' شامل ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں گناہ و بدی کے مسئلے کو اس تفصیل و اطناب کے ساتھ واقعات کی روشنی میں ہندوستان کی کسی زبان کے ادب میں پیش نہیں کیا گیا، کم از کم اُردو میں تو ہرگز نہیں۔ کتاب کے آخر میں رتنامیر کی زبان سے جو کچھ بھگوتی چرن ورما نے کہلایا ہے، وہ دراصل انھیں کی آواز ہے اور اس وقیع کتاب کا بنیادی مقصد یہی ہے۔

''اس دُنیا میں گناہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ محض انسان کے زاویہ نظر سے معکوس ہے۔''

اور پھر:

> ''خوشی ہر فرد چاہتا ہے۔ دنیا کا کوئی آدمی اپنی مرضی سے وہ کام کبھی نہیں کرے گا جس سے غم ملے۔ یہی انسان کی فطرت اور اس کا زاویہ نظر ہے۔ اسی لیے دنیا میں گناہ کی صرف ایک تعریف نہیں ہو سکی اور نہ ہو سکتی ہے۔ ہم نہ نیکی کرتے ہیں نہ بدی، ہم صرف وہی کرتے ہیں جو ہمیں کرنا پڑتا ہے۔''

(''رفتارِ نو'' دربھنگا، سالگرہ نمبر، جنوری ۱۹۶۲ء)

نقوشِ جاوداں

سلیمان ڈوپلے (مرتّب)

۱۹۵۱ء کے اواخر سے میرا کلکتہ میں قیام ہے۔ تاباں القادری کا انتقال ۷ ارمئی ۱۹۵۵ء کو ہوا۔ ساڑھے تین سال سے کچھ زیادہ ہی ہم دونوں ایک شہر میں رہے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم دونوں کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی اور نہ میں ان کی زندگی میں ان کی صلاحیتوں اور اوصاف سے پوری طرح آگاہ ہو سکا۔

ان کے انتقال کے بعد ان کے مجموعۂ کلام ''مشامِ روح'' کے مطالعہ کا موقع ملا اور ان کی شاعرانہ صلاحیت کا قائل ہونا پڑا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کلکتہ کے نوجوان، خوش فکر شعرا میں تاباں القادری ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ ان کی بے وقت موت نے ایک ہونہار شاعر کو ہم سے چھین لیا۔

برسبیل تذکرہ، مجروحؔ سلطان پوری کے پہلے مجموعے ''غزل'' (اشاعت: ۱۹۵۳ء) میں شامل اِن دو اشعار:

کبھی ظلمتوں میں گِھر کر ہے خیالِ دستِ رہبر
کبھی خود چمک اُٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں
کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

کے سلسلے میں ارشد کاکوی نے مجروحؔ پر سرقے کا الزام لگایا تھا، کیوں کہ یہ اشعار تاباں القادری کے مجموعۂ کلام ''مشامِ روح'' میں بھی موجود ہیں، اور اس مجموعے کی اشاعت مجروحؔ کے مجموعے سے ڈھائی سال قبل ۱۹۵۱ء کے اوائل میں ہو چکی تھی۔ ویسے ''غزل'' میں مجروحؔ کے ان اشعار کے نیچے سنہ تخلیق ۱۹۴۴ء درج ہے۔

اہلِ کلکتہ نے اس جواں مرگ شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک مختصر سا مجموعہ مرتب کیا ہے، جس میں تاباںؔ مرحوم کی شخصیت اور فن سے متعلق کچھ مضامین اور نظمیں شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں تاباںؔ مرحوم کا کچھ کلام بھی شریک کر لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مجموعہ تاباںؔ مرحوم کے عقیدت

مندوں کے لیے اور بھی وقیع ہو گیا ہے۔

مجموعہ کی ترتیب ناتجربہ کاری اور بے توجہی کا شکار ہے۔ مضامین کی فہرست بھی نہیں دی گئی ہے۔ بعض مضامین اور نظموں کی شمولیت "برائے بیت" ہوئی ہے۔ حصہ نثر میں شاہ مقبول احمد کا مضمون واقعی قابلِ قدر ہے۔ رونق نعیم نے تاباںؔ کی شخصیت اور شاعری پر ایک تفصیلی کارآمد مضمون لکھا ہے۔ بعض نوآموز لکھنے والوں کے مضامین "تکلیف دِہ" حد تک معمولی ہیں۔ ایک دو حضرات نے اپنی انگریزی دانی کا بدسلیقگی سے مظاہرہ کیا ہے۔ منظومات میں ساجد القادری کی نظم خاص طور پر متوجہ کرتی ہے۔ انھوں نے تاباںؔ کی موت کو بنیاد بنا کر ایک اثر آفریں فکر انگیز نظم کی تخلیق کی ہے۔ احساںؔ دربھنگوی نے اپنے مسدس میں بڑی خوبی سے تاباںؔ کی شخصیت، ان کی تصنیفات اور ان کی صفات کو نظم کیا ہے۔

"نقوشِ جاوداں" کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ مجموعہ کے مرتب سلیمان ڈوپلے بہر حال مستحقِ مبارک باد ہیں۔

(ماہ نامہ "سہیل" گیا، ستمبر ۱۹۵۷ء)

عبدالماجد دریابادی

سلیم قدوائی

بیسویں صدی کی دوسری، تیسری اور چوتھی دہائی میں اُردو کے جن بڑے ادیبوں، انشا پردازوں اور صحافیوں کے نام کا سکّہ چلتا تھا، ان میں ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی اور نیاز فتح پوری جیسے اکابر شامل ہیں۔ عبدالماجد دریابادی ایک ہمہ گیر، ہمہ جہت اور پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ میری اپنی ادبی زندگی کے اوائل میں جن گراں مایہ نثر نگاروں کا اثر و نفوذ رہا ہے، ان میں عبدالماجد دریابادی کا نام نہایت اہم ہے۔ ان کے افکار و خیالات سے اتفاق اور اختلاف کے پہلو نکلتے رہے ہیں، لیکن ان کے طرزِ فکر کی صلابت ہر دَور میں متوجہ اور متاثر کرتی رہی ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز، فلسفہ اور مذہبیات کے عالم، مفسرِ قرآن، صحافی اور شعر و ادب کے مزاج داں اور ادا شناس کے طور پر ہماری ادبی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش حصہ ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کو بچپن سے ہی مطالعے کا خاص ذوق تھا۔ اسی مطالعے نے انھیں عنفوانِ شباب میں الحاد اور مذہب بیزاری سے قریب کیا اور اس مطالعے نے انھیں راہِ ہدایت بھی دکھائی، اور

"حکمائے فرنگ" کے مقابلے میں مشرقی مفکرین کی برتری کا احساس دلایا۔ مولانا دریابادی پر اس زمانے کی دو اہم شخصیتوں کا بہت اثر رہا۔ ایک مولانا محمد علی جوہر کا اور دوسرے مولانا اشرف علی تھانوی کا۔ محمد علی جوہر کے زیرِ اثر وہ سیاست کی طرف بھی راغب ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد عملی سیاست سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے۔

مولانا دریابادی کی ایک اہم جہت ان کی صحافت نگاری ہے۔ ہر چند وہ اخباروں اور رسالوں کے لیے بہت قبل سے لکھنے لگے تھے، لیکن ۱۹۲۵ء میں وہ باقاعدہ "سچ" کے ایڈیٹر ہوئے۔ "سچ" بند ہوا تو انھوں نے "صدق" کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا۔ اس کی اشاعت بھی بوجوہ رُک گئی تو انھوں نے "صدقِ جدید" کے نام سے ایک دوسرے اخبار کا اجرا کر دیا اور نصف صدی تک وہ براہِ راست ایسی صحافت سے وابستہ رہے، جس نے اس زمانے کے عام قارئین کے علاوہ صاحبِ فکر افراد پر بھی گہرے اثرات مُرتسم کیے۔ مضمون پر سرخی لگانے میں انھیں خاص مہارت تھی۔ کبھی کسی مصرعے سے، کبھی الفاظ کے اُلٹ پھیر سے، کبھی صنعتِ تضاد سے وہ بڑا کام لیتے تھے۔

عبدالماجد دریابادی کی تصنیفات اور تالیفات کی تعداد ۷۵-۷۶ تک پہنچتی ہے۔ ان میں ان کے خطبات اور کتابچے بھی شامل ہیں۔ ان کی تصانیف میں چار انگریزی میں ہیں۔ بعض کتابیں ان کے انتقال کے بعد مرتب ہو کر منظرِ عام پر آئیں۔ ان کا ایک ڈرامہ "زود پشیماں" کسی زمانے میں مشہور و مقبول ہوا تھا۔ ان کی غزلوں اور نعتیہ غزلوں کا بھی ایک چھوٹا سا مجموعہ چھپا ہے۔ مولانا محمد علی اور مولانا اشرف علی تھانوی پر لکھی ہوئی ان کی کتابوں سے سوانح نگاری کے باب میں دریابادی کی انفرادیت نمایاں ہے۔ ان کی "آپ بیتی" کو بڑی شہرت ملی اور اب بھی مرکزِ توجہ ہے۔ ان کی تصانیف میں "فلسفۂ جذبات" کسی زمانے میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی گئی۔ انھوں نے سفرنامے بھی لکھے جن میں "سفرِ حجاز" کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ مذہبیات اور اخلاقیات سے متعلق ان کی کتابوں کی تعداد پندرہ سے کم نہیں۔ ان میں سب سے مقبول اور اہم قرآنِ حکیم کی تفسیر ہے، جو "تفسیرِ ماجدی" کے نام سے معروف ہے۔ ترجمہ کے فن پر دریابادی کو خاص دسترس تھی۔ ان کے ترجموں میں "مکالمات برکلے" اور "تاریخ اخلاقِ یورپ" نام کی کتابیں اوریجنل تصنیفات کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ "بحر المحبت" کی تدوین سے ان کی محققانہ نظر کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ وہ باقاعدگی سے علمی، ادبی، دینی اور سماجی موضوعات و مسائل کو زیرِ بحث لاتے ہوئے خطوط بھی لکھا کرتے تھے، جن کی تعداد کئی ہزار تک پہنچتی ہے۔ "مکتوباتِ ماجدی" کے نام سے ان کے لکھے ہوئے خطوط کی دو جلدیں شائع

ہو چکی ہیں۔ انھوں نے اکبر الٰہ آبادی اور سید سلیمان ندوی کے مکاتیب کے مجموعوں کے علاوہ کچھ اور مشاہیر کے خطوط بھی مرتب کر کے چھپوائے ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کی شخصیت اور کارناموں کا کسی چھوٹی سی کتاب میں احاطہ کرنا ایک مشکل کام ہے۔ سلیم قدوائی نے ساہتیہ اکادمی کے لیے ان پر ایک مونوگراف لکھ کر اس مشکل کام کو آسان کر دکھایا ہے۔ انھوں نے مولانا دریابادی کے حالاتِ زندگی تیرہ صفحات میں اس طرح بیان کیے ہیں کہ ان کی زندگی اور کردار کے تمام ضروری پہلو پوری طرح روشن ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد بحیثیت ادیب اور بحیثیت صحافی ان کے کام کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ پھر الگ الگ عنوانات مقرّر کر کے ان کی مکتوب نگاری، شاعری، ڈرامہ نگاری، مقدمہ نگاری، تبصرہ نگاری، سوانح نگاری، مرقع نگاری اور ترجمہ نگاری پر گفتگو کی ہے۔ فلسفی، ماہرِ نفسیات، محقق، مرتب اور مفسرِ قرآن کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ قومی تحریک میں اُن کی شمولیت کے بارے میں بھی ایک الگ باب ہے۔

ڈاکٹر سلیم قدوائی نے کوئی دعویٰ بے دلیل نہیں کیا۔ اپنے ہر بیان کی تصدیق کے لیے انھوں نے مولانا دریابادی کی تحریروں کے اقتباسات پیش کیے ہیں جن سے مولانا کے رنگ تحریر کی شوخی و نرمی دونوں خوبیاں پوری طرح اُجاگر ہوتی ہیں۔ ان کی غزلوں کے کچھ نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ عام طور پر لوگ مولانا دریابادی کو ایک خشک اور بے لچک عالم دین کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن ڈاکٹر سلیم قدوائی کی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کی شخصیت میں کتنی بردباری، رواداری اور دل آویزی تھی۔

اتنی ساری تفصیلات مہیّا کرنے کے باوجود تعجب ہوتا ہے کہ سلیم قدوائی نے مولانا دریابادی کی ''آپ بیتی'' کو اپنے جائزے میں کیوں شامل نہیں کیا، ہر چند انھوں نے مولانا کے سوانحی حالات لکھتے ہوئے ''آپ بیتی'' سے کئی حوالے دیے ہیں۔ میں اسے اُردو کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھتا ہوں۔ اس کا تفصیلی ذکر ہونا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر سلیم قدوائی مولانا عبدالماجد دریابادی کے نواسے ہیں اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ ان کی تحریر واضح، شستہ اور رواں دواں ہے۔ عبدالماجد دریابادی کی زندگی، شخصیت اور کارناموں کو جاننے اور سمجھنے کے لیے سو صفحات کی اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسے ساہتیہ اکادمی نے اپنے روایتی حسنِ طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔

(ماہ نامہ ''ایوان اُردو'' دہلی، مارچ ۱۹۹۹ء)

📖

لے سانس بھی آہستہ

شاہد احمد شعیب

شاہد احمد شعیب ان شاعروں میں ہیں جو شاعری کو نام ونمود کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ وہ شعر اس لیے کہتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ ان کے مطالعے کا محور "علم الانسان" رہا ہے اور اب وہ ایک دانش گاہ میں "تحقیق کے طریق کار" کے اُستاد ہیں۔ سماجیات سے بھی اُن کا خصوصی تعلق خاطر ہے اور وہ معاشرتی اور سیاسی مسائل پر غور وخوض کرنے اور نتائج اخذ کرنے میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ ان کی باخبری ان کی شاعری کو برگ وبار عطا کرتی ہے اور اسی لیے ان کی شاعری جم غفیر کی شاعری سے کافی حد تک الگ معلوم ہوتی ہے۔ ان کا تعلق تو اسی نسل سے ہے، جسے ہم اپنی تن آسانی، یا 'ذہن آسانی' کے لیے ۱۹۶۰ء کے بعد کی نسل سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کا ذکر کرتے وقت ہم "جدید حسیت" کا نام لیے بغیر نوالہ نہیں توڑتے۔ لیکن شاہد احمد شعیب بہتے ہوئے دھارے کے ساتھ بہنے کے قائل نہیں۔ ان کی شاعری ان کے انفرادی شعور اور دانش کی پروردہ ہے اور اس کا جائزہ لینے کے لیے رسمی اصطلاحوں سے صرفِ نظر کرنا ہی بہتر ہے۔

"لے سانس بھی آہستہ" شاہد احمد شعیب کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں ۶۷ نظمیں اور ۷ اغزلیں شامل ہیں۔ ۲۱۲ صفحات کے اس مجموعے میں ۱۸۷ صفحات نظموں کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ ان دنوں ایک عام شکایت یہ ہے کہ اُردو کے شعرا نظم نگاری کی طرف کم توجہ دے رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اس مجموعے کی اشاعت نیک فال ہے۔ ان ۶۷ نظموں میں ایک طویل نثری نظم بھی ہے جو ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نثری نظم کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ شاہد احمد شعیب اس صنف کے مطالبات سے واقف ہیں اور اکثر ناموزوں طبع "شعرا" کی طرح اپنی کم مائیگی کو نثری نظم کا نام نہیں دیتے۔ باقی نظمیں آزاد ہیں اور اپنے موضوعات کے لحاظ سے ہی نہیں، اسلوب کے اعتبار سے بھی تنوع کا احساس دلاتی ہیں۔

شاہد احمد شعیب کی نظم "مقابلہ" پرانی اور نئی نسل کی کشمکش کا ایک پُر اثر اظہار ہے:

وہ اِک جاتا ہوا موسم
نئے موسم کی تیزی اور تندی سے، بہت گھبرا رہا ہے

میں اس کو محترم سمجھوں
ادب سے بات کرتا ہوں
مگر وہ
میرے ہی سر سے گزرنا چاہتا ہے
مجھے وہ ختم کرنا چاہتا ہے
میں اس کو قتل کرنا چاہتا ہوں

شاہد احمد شعیب کا تعلق اس علاقے سے ہے، جہاں قبائلی تہذیب کا عمل دخل ہے۔ قبائلیوں کا مخصوص معاشرہ کس طرح موجودہ صنعتی پھیلاؤ اور شہری زندگی کے دباؤ کا شکار ہو رہا ہے اس کا بے حد خوبصورت اور مؤثر اظہار ان کی نظم ''پریا'' میں ہوتا ہے۔ ''پریا'' کے معنی ہیں: ''سورج کی طرح روشن'' اور یہ چھوٹا ناگپور کے قبائلیوں کا نعرہ ہے:

''پریا'' — ہمارے تمھارے سفر کے لیے
ہر گلی کے لیے، دربدر کے لیے
دشت و کہسار کے واسطے
شہر بھر کے لیے

''لے سانس بھی آہستہ'' کی سترہ غزلوں میں سے پہلی تین غزلوں کی ردیف ''عجیب'' ہے۔ ''تحیر'' اور ''عجب'' کا عنصر شاہد احمد شعیب کی شاعری کے منظرنامے میں نمایاں ہے۔ اس ردیف کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

بغیر درس ہوئے رمز آشنائے حیات
یہاں تو مدرسۂ دل کا ہے نصاب عجیب

''تحیّر زائی'' کی کیفیت اس شعر میں بھی دیکھیے:

نہ جانے کس کو وہ آواز دیتا رہتا ہے
کبھی جو پوچھا تو وہ شخص ہنس کے ٹال گیا

غزلوں کی بعض ردیفیں اور ان ردیفوں میں کہے ہوئے کئی اشعار لہجہ اور مفہوم دونوں کے لحاظ سے تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ غزلوں میں بھی شاعر کے فکری رویوں کے خط و خال اسی طرح نمایاں ہیں جس طرح اُن کی نظموں میں۔

(''آج کل'' نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۹۰ء)

داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوش رُبا — شکیل الرحمٰن

دَورِ حاضر کے ممتاز نقاد شکیل الرحمٰن کی تازہ ترین تصنیف ''داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوش رُبا'' کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے ہی مصنف کے اس بیان سے معانقہ ہوتا ہے:

''اُردو ادب میں دو بڑے معجزے ہوئے۔ایک معجزہ 'دیوانِ غالب' ہے اور دوسرا 'طلسم ہوش رُبا'۔''

پہلے ''معجزے'' دیوانِ غالب کے حوالے سے اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ اب نیا کچھ کہنے (لکھنے) کی گنجائش کم ہی رہ گئی ہے۔لیکن اس کے مقابلے میں دوسرے ''معجزے'' طلسم ہوش ربا کے متعلق اتنا کم لکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی اس سلسلے میں کام کا آغاز ہی نہیں ہوا۔حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ایک نہایت وقیع کام تو کلیم الدین احمد کا ہے جن کی مستقل تصنیف ''فنِ داستان گوئی'' بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔اس کے علاوہ محمد حسن عسکری،عزیز احمد،سہیل بخاری،وقار عظیم، ڈاکٹر گیان چند نے ہماری داستانوں پر کام کیا ہے۔ادھر شمس الرحمٰن فاروقی کے بھی کئی مضامین آئے ہیں۔شکیل الرحمٰن کا کام آگے کا ایک قدم ہے۔یہ درسی یا نصابی نوعیت کی تنقید نہیں ہے۔یہ قاری کو تخلیق کے ساتھ لے کر چلتی ہے اور مصنفین کی خلاقی میں ان کو شریک کرتی ہے۔(اس کتاب کے مصنف کے ساتھ کہیں پروفیسر یا ڈاکٹر کا سابقہ نہیں ہے)

اس کتاب میں تنقید کا ایک نیا غیر رسمی اسلوب ملتا ہے۔یعنی داستان کی تمام خصوصیات اور اس کے سارے مضمرات کو اپنی بیگم مینا سے تخاطب کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔

شکیل الرحمٰن نے اپنے دعوؤں یا بیانات کی دلیل میں طلسم ہوش رُبا اور داستانِ امیر حمزہ سے نہایت مناسب اور خوبصورت اقتباسات پیش کیے ہیں۔شکیل الرحمٰن کی بنیادی تھیسس یہ ہے:

''اُردو ادب میں اس داستان نے اپنی ایک مائتھولوجی خلق کی ہے،اُردو دنیا کو فینٹاسی کا ایک شعور دیا ہے۔یہ وہ فینٹاسی بھی ہے جو اکثر حقیقت کے خلاف نہیں بلکہ خوابوں کی ایک دلفریب،پُراسرار اور طلسمی دنیا خلق کرکے غیر حقیقی عناصر کے اندر حقیقت کی ایک جھلک دِکھاتی رہتی ہے۔''

اس کی وضاحت کرنے کے لیے انھوں نے کتاب کو پانچ ابواب — تکنیک،رومانیت،فینٹاسی،

کردار، اسلوب — میں تقسیم کیا ہے، اور ہر باب میں ضروری تفصیل کے ساتھ دلچسپ انداز میں داستان کے مختلف پہلوؤں اور ان کی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ دنیا کی اس سب سے طویل کہانی میں حیرت و استعجاب کی جو رنگین اور انوکھی دنیا نظر آتی ہے اور اس کی نقش گری میں جو تکنیک اور اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور ہر کردار کی الگ انفرادیت قائم کرنے میں جو فنکاری دکھائی گئی ہے، اسے شکیل الرحمٰن نے اپنے تنقیدی شعور کی وساطت سے بہ کمال خوبی واضح کیا ہے۔ اس داستان کی خاص تکنیک یہ ہے کہ جیسے ہی ایک کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے کہ انھیں کرداروں کے ساتھ ایک دوسری اور بالکل نئی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ اس داستان میں تخیل کی جو بلند پروازی ہے اور جس نے اسے ایک لازوال فینٹاسی (Fantasy) کی شکل عطا کی ہے، اس میں عشق و محبت اور جنسی چھیڑ چھاڑ کا جو بے باکانہ اظہار ہے، ان سب پر نہایت دلآویز تبصرے مثالوں کے ساتھ شکیل الرحمٰن کی اس کتاب میں ملتے ہیں۔

اس کتاب کا ایک اہم باب ''حمزہ نامہ کی تصویریں'' بھی ہے۔ اس میں ان تصویروں کی جو تفصیلات ملتی ہیں وہ کہیں اور نہیں مل سکتیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شکیل الرحمٰن نے کتنی محنت اور تلاش و جستجو کے بعد یہ معلومات فراہم کی ہیں۔ 'حمزہ نامہ' کی بعض تصویروں کے عکس سے بھی کتاب مزین ہے۔ ''داستانِ امیر حمزہ'' کے نول کشور ایڈیشن کے بعض صفحات کے عکس بھی شامل کتاب ہیں۔

شکیل الرحمٰن کی اس کتاب کا مطالعہ اہتزاز اور مسرّت و بہجت کا سامان ہے۔ میں اچھی تنقید کے لیے اس وصف پر بھی اصرار کرتا ہوں۔

کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ سرورق تو اس قدر نفیس اور دیدہ زیب ہے کہ باید و شاید۔

(ہفتہ وار ''ہماری زبان'' دہلی ۱۵-۲۲ر ستمبر ۱۹۹۵ء)

مکاتیبِ وحشت

شمس الدین عازم (مرتب)

رضا علی وحشت کلکتوی کو بحیثیت شاعر متفقہ طور پر غالبؔ کا کامیاب ترین پیرو تسلیم کیا گیا ہے۔ غالبؔ کے اسلوب و اظہار میں ان کی اجنبی لیکن خوشگوار ترکیبوں، محذوفات اور مشکل پسندی کو کافی دخل رہا ہے اور وحشتؔ مرحوم نے ان خصوصیات کے تتبع میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ یہ اور بات ہے کہ غالب کی رفعتِ فکر، مضمون آفرینی اور ان کے اشعار کی معنوی تہیں وحشتؔ مرحوم کے کلام کا خاصہ

نہ بن سکیں۔

غالبؔ نے مکتوب نگاری کا بھی ایک نیا طرز ایجاد کیا اور انھوں نے اُردو نثر کو ایسی بے تکلفی اور دار فتگی بخشی کہ اس باب میں کوئی اور ان کے حریف ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ وحشتؔ کے خطوط میں غالبؔ کے طرزِ تحریر کی جھلکیاں ملتی ہیں، لیکن ہم اسے شعوری تتبع کا نام نہیں دے سکتے۔ وحشتؔ کا اسلوبِ تحریر بھی سادہ اور بے تکلفانہ ہے۔ ان کے خطوط کے مطالعہ سے ان کی نجابت، نیک نفسی، خودداری اور عالی حوصلگی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سارے خطوط نجی ہیں اور مکتوب نگار کو شاید ہی یہ گمان رہا ہو کہ ان کی اشاعت کی نوبت بھی آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطوط مولانا آزاد کی پُر تکلف انشا پردازی اور افکار کی ''ملمع کاری'' سے پاک ہیں۔ کہنا چاہیے کہ یہ خطوط وحشتؔ کی شخصیت کا واضح اظہار ہیں کہ مکاتیب کی سب سے بڑی صفت یہی ہوتی ہے۔

اُردو میں بعض دوسری اصناف کی طرح مکاتیب کی اہمیت کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے۔ بہ مشکل مکاتیب کے دس بارہ مجموعے مِل جائیں گے۔ اس لحاظ سے ''مکاتیبِ وحشت'' کی حیثیت ایک خوشگوار اضافے کی ہے۔ وحشتؔ مرحوم کی شخصیت کے خدوخال سے واقفیت کے لیے ہی نہیں، بلکہ ایک صاحبِ کمال شاعر کے شعری اور فنی نظریات اور بعض دیگر مسائل سے آشنا ہونے کے لیے بھی کتاب کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ افسوس ہے کہ کتابت و طباعت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ سرورق بھی بہت معمولی ہے۔ کتاب کی ظاہری شکل وصورت ہرگز وحشتؔ مرحوم کے شایانِ شان نہیں۔ شمس الدین عازمؔ ان مکاتیب کے مرتب ہیں۔ وحشتؔ کے خطوط کی بازیافت کے سلسلے میں ان کی محنت ستائش کی مستحق ہے۔

(ماہنامہ ''سہیل'' گیا، ستمبر ۱۹۵۷ء)

شجر اکیلا ہے

صابر دت

صابر دت کی شناخت ایک بھاری بھرکم رسالے ''فن اور شخصیت'' کے بھاری بھرکم ایڈیٹر کی حیثیت سے رہی ہے، حالاں کہ وہ خود کسی لحاظ سے بھاری بھرکم نہیں تھے۔ بحیثیت شاعر وہ نہ تنقید نگاروں کی فہرست میں رہے، نہ مشاعرہ سازوں کی۔ البتہ اپنے شباب آفریں کلام سے محفلوں کو خوب گرماتے

رہے۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان کا مختصر سا پہلا مجموعہ ''پل دو پل'' جب منظرِ عام پر آیا تھا، تو اسے زندگی کو زندگی کی طرح جینے والوں میں سراہا گیا تھا۔ ان کے دوسرے مجموعے ''موجِ عارض'' نے ان کے مدّاحوں کا حلقہ وسیع کیا۔ اس میں رُومانی فضاؤں کی سرشاری اور حقائق کی تلخ کلامی کا امتزاج تھا جس نے کلام میں ایک خاص نوع کی تاثیر پیدا کر دی تھی۔ اس مجموعے نے بعض سرکردہ ناقدوں کی توجّہ بھی اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ صابر دّت کا نیا مجموعہ ''شجر اکیلا ہے'' کے نام سے ان کے بے وقت انتقال سے کچھ پہلے شائع ہوا ہے، جو نظموں، غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ نظمیں پابند بھی ہیں، آزاد بھی اور نثری بھی۔ مجموعے کو سرسری طور پر دیکھتے ہی پہلا تاثر یہ قائم ہوتا ہے کہ وہ لہلاتے ہوئے بدن، نگاہوں کی سرمستی، کالے بالوں کی فسوں کاری اور شباب کی شادابی کے شاعر ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے:

سرِ شام آئے ہو آرام لے لو
ذرا دیر بیٹھو تم اِک جام لے لو

پوشاک پہن آیا مرا یار گلابی
گھر کے ہوئے سارے در و دیوار گلابی

اس نے پازیب جو پہنی ہوگی
نغمگی سب نے چُرائی ہوگی

صابر دّت کے کلام کا حاوی رنگ یہی ہے، لیکن ان کی شاعری اسی دائرے تک محدود نہیں۔ دراصل وہ نشاطِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کے شاعر ہیں۔ وہ ایک حسّاس اور دردمند دل کے مالک ہیں، اس لیے آج کے انسان کے زوال اور پستی کا واشگاف اظہار بھی ان کی نظموں میں ہوا ہے۔ ''شاعرِ حسن و شباب'' کو کتنے کرب اور کتنی ذہنی اذیتوں سے گزرنا پڑا ہوگا، تب جا کر اس نے ایسا احتجاجی لہجہ اختیار کیا ہے۔ 'کنفیشن'، 'کرسی کا سنسار'، 'منتری'، 'رہنما'، 'حاکمِ شہر' وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں۔

اس مجموعے کو پڑھنے والا یہ اندازہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ صابر دّت نے زندگی کو قریب سے اور کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کے کلام میں روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی سچائیاں بھی انوکھی اور دلچسپ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ان کے یہاں حسن و عشق کی کارفرمائیوں کے اظہار کے ساتھ حالاتِ حاضرہ پر تبصرے بھی ہیں۔ ان کی شاعری کا رواں دواں انداز، مصرعوں کی برجستگی، لہجے کا نکھار، بیان کی سادگی

اور سلاست فوری طور پر متوجّہ کرنے والے اوصاف ہیں۔ وہ اتنے سیدھے، صاف لہجے اور زُود فہم زبان میں شعر کہتے ہیں کہ ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے طرزِ اظہار میں ایک سلیقہ اور ایک نفاست ہے، جو بے اختیار دامنِ دل کو کھینچ لیتی ہے۔

(ماہ نامہ ''ایوانِ اُردو''، دہلی، اگست ۱۹۹۹ء))

📖

نَو نگے

صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین اُردو کے مشہور ادیب ڈاکٹر عابد حسین کی شریکِ حیات ہیں، لیکن ان کی شہرت کی بنیاد اس ازدواجی رفاقت پر قائم نہیں اور نہ ان کی ناموری حالّی سے خاندانی نسبت کے باعث ہے۔ صالحہ عابد حسین خود ایک بیدار مغز ادیبہ اور سلیقہ شعار افسانہ نویس ہیں۔ وہ ایک عرصے سے باقاعدگی کے ساتھ لکھ رہی ہیں۔ ''یادگارِ حالی'' ان کی بلند پایہ تصنیف ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''نقشِ اوّل'' ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا، جو اُردو افسانے کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد ان کے دیگر مجموعے ''سازِ ہستی'' اور ''نراس میں آس'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ''نو نگے'' ان کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں نو افسانے شامل ہیں، جو ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہو کر خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ مجموعہ میں کتابت کی بے شمار غلطیاں بہت کھٹکتی ہیں۔ ناشرین کو آئندہ محتاط رہنا چاہیے۔ صالحہ عابد حسین کے افسانوں میں گھریلو زندگی کی تصویر کشی دل پذیر پیرائے میں ملتی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی نفسیات کو پوری طرح سمجھتی ہیں اور ان کی حرکت و عمل پر فن کارانہ قابو بھی رکھتی ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے کے افسانے جو خود افسانہ نگار کے قول کے مطابق، چالیس افسانوں میں سے منتخب کیے گئے ہیں، ایک خاص معیار کے حامل ہیں لیکن ان میں 'شماتتِ ہم سایہ' (عنوان ثقیل ضرور ہے!) 'ماں'، 'سہاگ رات' اور 'بابا' بطور خاص توجّہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ صالحہ کے افسانے بے مقصد نہیں ہوتے اور پڑھنے والے کی دلچسپی بھی برابر برقرار رہتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دور ناولوں کا دور ہے۔ ایسے موقع پر افسانوں کا کوئی اچھا مجموعہ منظرِ عام پر آئے، تو وہ بطور خاص ہماری پذیرائی کا مستحق ہے۔ یوں بھی، جیسا کہ صالحہ نے کہا ہے:

''کہانی ایک شعر ہے، ایک غزل ہے، ناول ایک مسلسل نظم ہے۔ نظم کے محبوب اور مقبول ہونے کے باوجود غزل کی چاہ لوگوں کے دل سے نہیں نکل سکی۔ اسی طرح ناول کی مقبولیت کتنی بڑھے، مختصر افسانے کی جگہ دلوں میں ہے اور رہے گی''

(سہ ماہی ''رفتارِ نو'' دربھنگا، سالگرہ نمبر، جنوری ۱۹۶۲ء)

📖

زہرِ گُل

عالم خورشید

اب سے دس سال پہلے جب عالم خورشید کا پہلا مجموعۂ کلام ''نئے موسم کی تلاش'' شائع ہوا تھا تو خواہ انھیں اُردو شاعری کے اُفق پر ایک نئے ستارے کے طلوع ہونے کی بشارت سے تعبیر نہ کیا گیا ہو، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شاعر کے امکانات کے بارے میں، بہت سی توقعات قائم ہوئی تھیں۔ یہ اندازہ تو ہوا ہی تھا کہ شاعر اُردو شاعری کی موجودہ فضا سے مطمئن نہیں ہے اور وہ غزل کے نئے موسم کی تلاش میں ہے۔ عالم خورشید کا دوسرا مجموعۂ کلام ''زہرِ گل'' اسی تلاش کے ''نئے پانی میں اگلا پاؤں'' ہے۔
(''اگلا پاؤں نئے پانی میں'': بانیؔ)

آج کی سپاٹ، بے رنگ، اکہری اور یبوست کی ماری بیشتر غزلوں کی بھرمار میں اگر کوئی مجموعہ اچھی غزل کے لوازمات کا احترام کرتا ہوا دِکھائی دیتا ہے تو ہم اس کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں جسے ''انشراحِ قلب'' کہا جاتا ہے۔ ''زہرِ گل'' ایسا ہی مجموعہ ہے!

عالم خورشید کی غزلیں شگفتگی، خوش آہنگی اور فن کارانہ سادہ پُرکاری کا نمونہ ہیں۔ زبان و بیان کی ایسی برجستگی اور بے ساختگی اور بندش کی ایسی چستی کہ ایک بہاؤ کا احساس ہو۔ یہ شاعری نہ تجربات کی دلدادہ ہے اور نہ حرف وصوت کی شکست و ریخت کو اپنا دبدبہ قائم کرنے کے لیے ضروری سمجھتی ہے۔ یہ شاعری ''عروض زدہ'' اور ''عجز بیان کی پروردہ'' غزلوں کی طرح طبیعت کو منغّض نہیں کرتی۔

عالم خورشید کے یہاں تنہائی، شکست خواب، قدروں کی پامالی وغیرہ کا کوئی واشگاف اظہار نہیں ملے گا۔ اب احساس کے یہ زاویے پامال ہو چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر لمحہ تغیر پذیر صورتِ حال میں ہجر کا موسم بھی دیر تک نہیں رہتا، اور جب ہوا ہر موڑ پر راستہ بدل رہی ہو تو اس کے ساتھ چراغ بکف چلنا بھی بے معنی ہو جاتا ہے:

ہوا کے ساتھ بھلا کتنی دُور میں جاتا
ہر ایک موڑ پہ وہ راستہ بدلتی رہی

عالم خورشید اُردو شاعروں کی جدید ترین نسل سے تعلق رکھتے ہیں جسے ہم اپنی آسانی کے لیے ۱۹۸۰ء کے بعد کی نسل یا مابعد جدید نسل بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی اضافی وصف نہیں ہے۔ ان کی غزل اُردو غزل کی اسی روایت کا تسلسل ہے، جو کلاسیکیت، ترقی پسندی اور جدیدیت سب پر محیط ہے:

مری تشنہ لبی کا کب یقیں آئے گا دریا کو
میں صحرا کو بھی لے آؤں اگر اپنی گواہی میں

طلب کرتا ہوں ہر اک پھول سے خوشبو تمھاری
جو سچ پوچھو تو مجھ میں بھی خرابی کم نہیں ہے

انھیں ''غیر متغزلانہ'' الفاظ کے استعمال سے بھی وحشت نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

گملوں میں سبز کیکٹس، میزوں پہ سنگ سج گئے
حیرت میں ہوں کہ کیا سے کیا شہرِ جمال ہو گیا

وہ سامنے کے مشاہدات اور تجربات پر مبنی شعر نہیں کہتے اور معاشرے کی زبوں حالی، بے انصافی اور ظلم و تشدّد کے سلسلے میں سکّہ بند شکایتی یا احتجاجی لہجہ بھی اختیار نہیں کرتے۔ (ایسی شاعری آج کل مشاعروں میں بہت مقبول ہے۔) وہ جانتے ہیں کہ شاعری کا کام انسان کو اندر سے بدلنا ہے۔ اس کے بطون میں وہ احساس اور عرفان پیدا کرنا ہے جو اس کی تزکیہ نفس کا موجب بن سکے، کیونکہ فرد کے اندرون کی تبدیلی ہی معاشرے کی تبدیلی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ فرد سے سماج ہے، سماج سے فرد نہیں ہے۔ عالم خورشید کے اس طرح کے اشعار میرے بیان کی تصدیق کریں گے:

شام سے پہلے جلا بیٹھے تھے ہم سارے چراغ
صبح سے پہلے مکاں کو بے ضیا ہونا ہی تھا

وہ پشیماں ہے عبث ہم کو جلا کر آگ میں
خاک ایسی تھی کہ اس کو کیمیا ہونا ہی تھا

چراغو! کچھ تو بتلاؤ تمھیں کس نے بجھا ڈالا
تمھیں نے گھر جلائے تھے ہوا کی واہواہی میں

کسی ساحل پہ جاؤں ایک ہی آواز آتی ہے
تجھے رُکنا جہاں ہے وہ کنارہ اور ہے کوئی

یہ اس کی زرخیزی ہے جو کھل جاتے ہیں پھول نئے
ورنہ اپنی مٹی کو شاداب کہاں رکھتے ہیں ہم

اچھی شاعری اور کسے کہتے ہیں!

("آج کل" دہلی، فروری ۱۹۹۹ء)

خوابوں کا سویرا
عبدالصمد

عبدالصمد نے اپنے پہلے ہی ناول "دو گز زمین" سے ناول نگاروں کی پہلی صف میں جگہ بنالی تھی۔ تقسیم ہند کے المیے اور آزادی کے بعد کے واقعات نے اُردو کے ناول نویسوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ "دو گز زمین" میں کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش، بھائی اور بھائی، باپ اور بیٹے کے نظریاتی اختلافات، آزادی کی جدوجہد میں مسلم گھرانوں کی قربانیاں اور قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان کی قومی زندگی میں قوم پرست مسلمانوں کی پسماندگی اور ان کے حریفوں کی بالا دستی، ان حقائق کو بڑی باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔ "دو گز زمین" ناول کے پیرائے میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے لے کر قیامِ پاکستان کے بعد تک کے واقعات پر مشتمل ہندوستانی مسلمانوں کے متوسط طبقے کی اثر انگیز سماجی اور سیاسی تاریخ ہے۔

عبدالصمد کے نئے ناول "خوابوں کا سویرا" کو ان کے پہلے ناول کا تسلسل سمجھنا چاہیے۔ یہ ناول تقسیم کے بعد کے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو ان کے حقیقی تناظر میں پیش کرتا ہے۔ خوشحال شب و روز کے خواب آنکھوں میں سجائے پاکستان کی جانب مراجعت اور اپنی جڑوں سے اُکھڑنے کا المیہ اس ناول میں شدّتِ احساس کے ساتھ اُجاگر ہوا ہے۔ آزادی کے بعد جس طرح زندگی کا مقصد محض حصولِ زر رہ گیا ہے اور اس کے لیے، جس شقی القلبی سے آپسی رشتوں اور انسانیت کے تقدس کو مجروح کیا جا رہا ہے، اس کا اظہار بھی پُر اثر طریقے سے اس ناول میں ہوا ہے۔

زندگی کی ساری اعلیٰ قدریں کس طرح ذاتی منفعت کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھادی گئی ہیں اور کس طرح ذلّت وخواری کو بھی وجہ افتخار بنالیا گیا ہے، کس طرح شریف گھرانوں کی مسلمان لڑکیاں عربوں کے ہاتھوں فروخت ہوتی ہیں اور کس طرح بے روزگار نوجوان عزّتِ نفس کا سودا کر کے غیر ممالک میں دولت کمانے جاتے ہیں ــــ آج کی یہ زندہ حقیقتیں ''خوابوں کا سویرا'' میں متحرک تصویروں کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ ناول نئے اور پرانے اندازِ فکر کے تصادم کی کہانی ہے۔

''خوابوں کا سویرا'' ہندوستان کے مسلم معاشرے کے زوال اور انحطاط کی داستان نہیں۔ اس میں جدوجہد کرنے والے، حقائق کا سامنا کرنے والے، اپنے حق کے لیے لڑنے والے افراد بھی ہیں۔ کلثوم جیسی نڈر، عزم وارادہ کی پکّی لڑکی بھی ہے، جو زندگی کی خوبصورت قدروں کی بحالی کے لیے سرگرم عمل ہے۔ آفاق جیسا نوجوان بھی ہے جو اس بدنہاد معاشرے کی بدعنوانیوں کے خلاف سینہ سپر ہے۔ اس معاشرے میں فسادات کی بہیمیت بھی ہے، لیکن باہمی منافرت کے خاتمے کے لیے مسلم اور ہندو نوجوانوں کی کوششیں بھی ہیں۔ مسلمان خوف کی فضا سے نکل رہا ہے اور مشترکہ جدوجہد میں حصہ لے رہا ہے۔

جزئیات اور تفصیلات میں اور موجودہ مسائل کے تجزیے میں یہ ناول کہیں کہیں ''دو گز زمین'' سے اُوپر اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دونوں ناولوں کا تقابل غیر ضروری اور غیر مناسب ہے۔ دونوں کی اپنی الگ الگ خصوصیات ہیں، حالانکہ دونوں موضوع کی ایک ہی زنجیر میں پروئے ہوئے ہیں۔

''خوابوں کا سویرا'' جیسا کہ عنوان سے بھی ظاہر ہے، ایک رجائی، پُر اُمید اور حوصلہ آمیز نقش پر منتج ہے۔ ہمارے ملک کے مسلم معاشرے کو حوصلہ اور اُمید کی اشد ضرورت ہے۔

(''آج کل'' دہلی، نومبر ۱۹۹۵ء)

📖

ادبیاتِ کشمیر

علی جواد زیدی

''ادبیاتِ کشمیر'' علی جواد زیدی کے سات مضامین اور دیباچوں کا مجموعہ ہے۔ ریاست جموں وکشمیر کے الگ الگ خطوں کی خاص زبانیں کشمیری، ڈوگری اور لداخی ہیں۔ لیکن ریاست کی رابطے کی زبان اُردو ہے۔ کسی زمانے میں فارسی زبان کے اثرات بھی اس خطے میں گہرے رہے ہیں اور یہیں غنی کاشمیری

جیسا شاعر پیدا ہوا۔ علی جواد زیدی نے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ کشمیر میں گزارا ہے اور یہاں وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دورانِ قیام میں اُردو، فارسی، کشمیری اور ڈوگری ادبیات کے حوالے سے جو مضامین اور دیباچے لکھے تھے، انھیں اب یکجا کر دیا گیا ہے۔

مجموعے کے پہلے مضمون میں کشمیری ادب کے آغاز اور ارتقاء کا عالمانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ دراصل یہ مضمون عبدالاحد آزاد کی مشہور کتاب ''کشمیری زبان اور شاعری'' کی دوسری جلد کا دیباچہ ہے۔ لیکن نہایت تفصیلی اور معلوماتی۔ غنی کاشمیری پر دو مضامین ہیں۔ ایک تو مقدمہ ہے ''دیوانِ غنی'' کا، جسے محمد امین داراب نے مرتب کیا تھا اور جس پر علی جواد زیدی نے دوسرے نسخوں سے تقابل کرنے کے بعد نظرِ ثانی کی تھی۔ دوسرا مضمون بہ عنوان ''ذکرِ غنی'' اس بلند پایہ شاعر کے متعلق وہ معلومات فراہم کرتا ہے، جو دیوانِ غنی کی اشاعت تک پوری طرح منظرِ عام پر نہیں آئی تھیں یا جن کا احاطہ دیوان کے دیباچے میں نہیں ہو سکا تھا۔

فردوسی کے ''سام نامہ'' کا کشمیری زبان میں ترجمہ لچھمن (لکشمن) کول بلبل کاشمیری نے کیا تھا جسے غلام نبی خیالؔ نے ''کشمیری سام نامہ'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کرایا۔ اس کا دیباچہ علی جواد زیدی نے لکھا تھا۔ وہ بھی ''ادبیاتِ کشمیر'' میں شامل ہے۔ ڈوگری کہاوتوں پر تارا سمبل پوری کی ہندی کتاب کا دیباچہ علی جواد زیدی نے ہندی میں ہی لکھا تھا۔ اس کا اُردو ترجمہ اس کتاب کا پانچواں مضمون ہے۔ ایک مضمون کے ذریعے ڈوگری کے مشہور ادیب رام ناتھ شاستری کی حیات و خدمات کو متعارف کرایا گیا ہے۔ تیج بہادر بھان کے اُردو افسانوں کے پہلے مجموعے ''جہلم کے سینے پر'' کا دیباچہ اس کتاب کا آخری مضمون ہے۔

اس کتاب کے پہلے تین مضامین: ''کشمیری ادب کا تاریخی جائزہ''، ''مقدمہ دیوانِ غنی کاشمیری'' اور ''ذکرِ غنی کاشمیری'' ۲۶۰ صفحات کو محیط ہیں۔ یہی کتاب کے سب سے اچھے مضامین ہیں اور اس کتاب کو انھی تین مضامین پر ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ ان کے بعد ایک مضمون اور تین دیباچے ہیں جو کل ملا کر تیس صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان سے بھی کشمیری اور ڈوگری ادب کے بعض گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔ لیکن تحقیق کا اعلیٰ معیار جو ابتدائی تین مضامین میں پیش کیا گیا ہے، ان کے آگے باقی مضامین ہلکے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ایک طرح کی ناہمواری کا احساس دلاتے ہیں۔ پہلے تین مضامین کی بنا پر یہ کتاب ہر لائبریری میں ہونی چاہیے۔

(''آج کل''، دہلی، جولائی ۱۹۹۵ء)

انشاء: کلکتےّ کا عصری ادب نمبر ف۔س۔ اعجاز (مرتب)

میرے مضمون ''مغربی بنگال میں اُردو شاعری آزادی کے بعد'' (مشمولہ مجموعۂ مضامین: ''ایک لہر آتی ہوئی'') کا اختتامی جملہ ہے:

''افسوس یہ ہے کہ مغربی بنگال اب بھی اُردو ناقدین کے لیے ایک جزیرے کی حیثیت رکھتا ہے اور انھیں ساحلوں پر غوطہ لگانے سے ہی فرصت نہیں ہے۔''

وحشت کلکتوی اور پرویز شاہدی جیسے شعراء اب بھی متعصبانہ سلوک کے شکار ہیں۔ پرویز شاہدی کے مشہور شعر:

راہ گذر ہی راہ گذر ہے، راہ گذر سے آگے بھی
ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے حدِ نظر سے آگے بھی

کو خشونت سنگھ اپنے ایک انگریزی کالم میں جاوید اختر سے منسوب کرتے ہیں، اور سردار جعفری اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب کی نصف صدی'' کے ''حرفِ آغاز'' میں پرویز شاہدی کا یہی شعر نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہمارے ایک شاعر نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔'' جعفری کو ''ہمارے ایک شاعر'' کا نام لیتے ہوئے تکلف ہوتا ہے!

کلکتہ اُردو کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ وہاں کے شاعر اور ادیب ملک گیر شہرت سے بے نیاز اپنی تخلیقی اور تحریری سرگرمیوں میں محو رہتے ہیں۔ میں اکثر ان سے یہ شکایت کرتا رہتا ہوں کہ اتنی ''بے نیازی'' کیوں ہے! اب کچھ نوجوان لکھنے والے اپنی تحریروں کو برصغیر کے اہم اور مقتدر رسائل کے ذریعے روشناس کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

کلکتےّ کے مشہور ماہ نامہ ''انشاء'' نے ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ''کلکتےّ کا عصری ادب نمبر'' حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اس میں کلکتےّ کے ۶۹ نئے پرانے لیکن زندہ لکھنے والوں کی نگارشاتِ نظم ونثر کے نمونے الگ الگ گوشے کی صورت میں دیئے گئے ہیں۔ ہر لکھنے والے کا سوانحی خاکہ بھی ہے اور اس کی تصویر بھی۔ یہ سارا کام نہایت سلیقے سے ہوا ہے۔

سالک لکھنوی، علقمہ شبلی، قیصر شمیم اور اعزاز افضل کا شمار کلکتےّ کے سربرآوردہ شعراء میں ہوتا ہے،

جن سے اُردو دُنیا متعارف ہے۔ ابوالحفوظ الکریم معصومی اپنے علمی اور تحقیقی مضامین کے باعث پہچانے جاتے ہیں۔ احمد سعید ملیح آبادی ''آزاد ہند'' کے مدیر اور ایک بلند پایہ صحافی کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ رئیس الدین فریدی (جواب مستقلاً دہلی ہجرت کر گئے ہیں) اور رئیس احمد جعفری کلکتہ کے صحافیوں میں تعارف کے محتاج نہیں۔ ماہر قانون اور دانشور کی حیثیت سے خواجہ محمد یوسف اُردو معاشرے میں عزّت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ع۔ رشید نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو کئی اطراف میں پھیلا رکھا تھا۔ مغربی بنگال کے جدید شاعروں میں وہی سب سے زیادہ معروف اور قابلِ احترام سمجھے جاتے تھے۔ افسوس گذشتہ دِنوں موت نے انھیں قبل از وقت ہم سے چھین لیا۔ شہباز نبی نے جدید اُردو شاعری میں اپنے لیے جگہ بنالی ہے۔ عصری افسانہ نگاروں میں انیس رفیع بلند درجے پر فائز ہیں۔ فیروز عابد سے بھی اُردو دُنیا اچھی طرح واقف ہے۔ ڈرامے اور اسٹیج کے حوالے سے ظہیر انور اور کمال احمد کے نام اُردو دُنیا کے لیے عرصے سے مانوس اور معتبر ہیں۔

یہ سب نام اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے معروف، نیم معروف، لیکن باصلاحیت لکھنے والے، جن کا تعلق کسی نہ کسی اعتبار سے کلکتے سے ہے، اور جن کے تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوئے، وہ اس خاص نمبر کی زینت ہیں۔

ف۔ س۔ اعجاز ''انشاء'' کے کامیاب مدیر کی حیثیت سے ہی نہیں، بلکہ متنوّع اسلوب کے شاعر کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ اس خاص نمبر کی ترتیب سے ان کی خوش ذوقی کا پتہ چلتا ہے۔

اس نمبر میں کلکتے سے باہر کی صرف ایک شخصیت مظفر حنفی کو شامل کیا گیا ہے۔ ان کی شمولیت کا جواز یہ ہے کہ وہ گذشتہ گیارہ سال سے کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال پروفیسر کے منصب پر فائز ہیں، اور شاید جلد ہی کلکتہ کو خیرباد کہنے والے ہیں۔ اہلِ کلکتہ جس طرح اپنے علاقے سے باہر والوں کو اپناتے ہیں، اس کی مثال شاید ہی کہیں اور ملے۔ اس نمبر میں کچھ ایسی شخصیتوں کو بھی شامل کیا جاسکتا تھا جن کا قیام ہرچند اب کلکتے میں نہیں ہے، لیکن ان کی ادبی تشکیل اسی شہر میں ہوئی ہے، مثلاً اویس احمد دوراں، جن کی پہچان یہیں قائم ہوئی اور جو کم وبیش بیس سال یہیں قیام پذیر رہے۔ اتفاق ہے کہ انھیں کلکتہ چھوڑنا پڑا اور نہ ان کا مستقل قیام وہیں ہوتا۔ کلکتے میں موجود کچھ ایسے قابلِ ذکر نام بھی ہیں، جن کی عدم شمولیت بہ اِک نظر کھٹکتی ہے، مثلاً شمیم انور، اقبال کرشن، نصر غزالی، اسد الزماں اسد، کامل اختر، حسن عرفی اور خالق عبداللہ۔ بحیثیت مجموعی ''انشاء'' کی جانب سے پیش کردہ ''کلکتے کا عصری ادب نمبر'' ایک وقیع دستاویز ہے، جو ہمیشہ حوالوں کے لیے کام آتا رہے گا۔

(''ایوانِ اُردو'' جنوری ۲۰۰۱ء)

تذکرۂ نسوانِ ہند

فصیح الدین بلخی

فصیح الدین بلخی اُردو ادب کی اُن چند مغتنم ہستیوں میں ہیں جن کے دم سے تحقیق و تدقیق کی شمع روشن ہے۔ موصوف کو اُن کی تالیف ''تاریخِ مگدھ'' کے باعث کافی شہرت حاصل ہو چکی ہے جسے مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام شائع کیا تھا۔ ابھی حال میں اُن کی ایک اور تالیف ''تذکرۂ نسوانِ ہند'' منظرِ عام پر آئی ہے، جس میں انھوں نے زمانۂ قدیم سے لے کر دَورِ حاضر تک کی نامور ہندوستانی اور پاکستانی خواتین کے مختصر کوائف درج کر دیئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری خواتین زندگی کے مختلف شعبوں میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دینے کی اہل ہیں۔ اس میں ۲۸۶ شاعرات، ۵۴ قلم کار اور ذی علم خواتین کے علاوہ ایسی مشاہیر کے احوال بھی درج ہیں جنھیں سیاسی، تمدّنی یا اخلاقی نقطۂ نظر سے فضیلت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ ۱۶ کاملین (یعنی جنھوں نے موسیقی، رقص یا اس طرح کے دوسرے فنون میں کمال حاصل کیا) اور ۴۱ مقدس خواتین (یعنی جنھوں نے اپنے تقدس اور پاکیزگی کے باعث ناموری حاصل کی) کے حالات بھی موجود ہیں۔ اس طرح اس کتاب میں پورے ۴۸۹ شہرت یافتہ خواتین کا تعارف پیش کر دیا گیا ہے۔ اپنی معلومات میں اضافے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ طبقۂ نسواں کے لیے اس میں خاص طور پر دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

فصیح الدین بلخی کی محنت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ بلاشبہ انھوں نے متعدد تواریخ اور تذکروں کی ورق گردانی کی ہوگی۔ لیکن پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تھوڑی اور محنت کتاب کی قدر و قیمت میں مزید اضافے کا موجب ہوتی۔ بعض خواتین کا تذکرہ صرف ایک سطر میں ختم کر دیا گیا ہے۔ اکثر تذکروں میں غیر ضروری باتیں دے دی گئی ہیں جن سے ان خواتین کی شخصیت اور کردار کے بارے میں کوئی خاص رائے مرتب نہیں ہو پاتی۔ ترتیب میں بھی خوش سلیقگی کا فقدان ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت کتاب کے شایانِ شان نہیں۔ غالباً زوالِ عمر کے باعث مؤلف کتاب کو ان باتوں کی طرف توجہ دینے کا موقع نہ مل سکا۔ ''تذکرۂ نسوانِ ہند'' اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود، بہر حال، ایک سرکردہ محقق کی جانب سے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ ہر لائبریری اور تعلیمی ادارے میں اس کتاب کی ایک جلد ضرور ہونی چاہیے۔

(ماہ نامہ ''سہیل'' گیا، ستمبر ۱۹۵۷ء)

سبزۂ معنیٔ بیگانہ

فضا ابنِ فیضی

فضا ابنِ فیضی کی غزل گوئی اور جدیدیت دونوں تقریباً ہم عمر ہیں (اس سے پہلے وہ ایک قادرالکلام نظم گو کی حیثیت سے معروف رہے ہیں) اس لیے ان کے الفاظ اور افکار دونوں نئے مزاج کی نشان دہی کرتے ہیں۔ زبان و بیان پر اُنھیں جو قدرت حاصل ہے، وہ اُنھیں ہر نوع کی فکر محسوس کو غزل میں سمونے کا حوصلہ دیتی ہے۔ ان کے احساس اور طرزِ احساس تک رسائی، ان کے افکار و خیالات کی پیچیدہ نیم تاریک، نیم روشن گلیوں کے توسط سے ہی ہو سکتی ہے۔ کلاسیکی روایت کا زائیدہ اور پروردہ ہونے کی وجہ سے ان کا اُسلوب نہایت مہذب اور مودّب ہے، لیکن اپنی سوچ کے لحاظ سے نئے تقاضوں کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

"سبزۂ معنیٔ بیگانہ" غزلیات پر مشتمل فضا ابنِ فیضی کا چوتھا اور تازہ ترین مجموعہ ہے۔ (نظموں کے مجموعے الگ ہیں) اب کیفیت سے زیادہ کمیت کے اعتبار سے فضا کی شاعری قابلِ توجہ بن گئی ہے۔ اس مجموعے کی غزلیں بھی فضا ابنِ فیضی کی استادانہ مشق و مزاولت اور ان کی قوّتِ زود گوئی کا اظہار ہیں۔ جذبات کی فراوانی کے ساتھ خوش آہنگی بھی فضا کی غزلوں کا وصف ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار:

بجھا کے شہر کے سارے چراغ سویا تھا
ہوا کا شور دریچوں کے پاس کیسا ہے؟

لمحۂ رفتہ کی تحریریں دوبارہ پڑھ سکوں
اس جریدے کا کوئی پچھلا شمارہ ڈھونڈنا

اور کیا چاہتی ہیں خشک زمینیں مجھ سے
میں سفر میں ہوں تو بادل کا سفر ہے جاری

کتاب کا گٹ اپ نہایت دیدہ زیب ہے اور ایسی خوبصورت کتابت ان دنوں شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

("آج کل" دہلی، جولائی ۱۹۹۵ء)

جمیل مظہری کی شاعری کا مطالعہ فضیل احمد

جمیل مظہری اُردو شاعری کا ایک بڑا نام ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے انھیں جوش پر فوقیت دی ہے۔ جوش خود جمیل مظہری کے بڑے مدّاح اور قدرداں رہے ہیں۔ جمیل مظہری کو بہ وجوہ وہ عوامی شہرت نصیب نہیں ہوئی جو اُن سے، بہت کم درجے کے شعراء کے حصّے میں آئی، مگر حلقۂ خواص میں ان کی قدر و منزلت کم نہیں ہے، بلکہ انھیں اقبال کے بعد فکری اور فلسفیانہ شاعری کا سب سے بڑا نمائندہ تسلیم کیا گیا ہے۔

جمیل مظہری پر یوں تو پانچ چھ رسالوں کے خاص نمبر شائع ہوئے، کچھ اُن کی زندگی میں، کچھ اُن کی وفات کے بعد۔ ان سے متعلق تین چار کتابیں بھی منظرِ عام آئیں، مگر حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ ابھی ان کی شاعری اور نثر نگاری دونوں پر ہی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔

ڈاکٹر فضیل احمد نے علاّمہ جمیل مظہری کی نثری اور شعری کاوشوں کے سلسلے میں تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے۔ علاّمہ کی نثری تخلیقات کے مطالعے پر مشتمل ان کی کتاب اب سے چھ سال پہلے چھپ چکی ہے۔ اب انھوں نے "جمیل مظہری کی شاعری کا مطالعہ" پیش کیا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ علاّمہ مرحوم کی شاعری کی خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی خاصی کامیاب کوشش کی ہے۔ جمیل مظہری کا زیادہ وقت فکرِ سخن میں صرف ہوتا تھا اور انھوں نے شاید ہی کوئی صنفِ سخن ہو جس میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ غزل، نظم، مثنوی اور مرثیہ میں ان کی خلاّقانہ صلاحیتیں عروج پر ہیں۔ مذہبی قصیدہ، رُباعی، قطعہ اور گیت میں بھی ان کی قادرالکلامی نمایاں ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ ہجویہ اور طنزیہ شاعری میں وہ سوداؔ کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر فضیل احمد نے ان تمام اصناف کے حوالے سے جمیل مظہری کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ بحث کی ہے، اور مواد کی فراہمی میں کوتاہی نہیں کی۔

افسوس ہے کہ اس کتاب میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ ایک جگہ مصنف نے لکھا ہے کہ ضمیمہ میں جمیل مظہری کی ایسی سات ہجویہ نظمیں شامل کی جا رہی ہیں، جو پہلے کہیں شائع نہیں ہوئیں اور بطور خاص انھیں حاصل ہوئی ہیں، مگر اس کتاب میں سرے سے کوئی ضمیمہ ہے ہی نہیں!

("آج کل"، ستمبر ۱۹۹۶ء)

شبنم شبنم

کرشن موہن

ہمیں کچھ عادت سی پڑ گئی ہے کہ جب تک کسی چیز میں ستر کیڑے نہ نکالیں، پیٹ کا کھانا ہضم ہی نہیں ہوتا اور کچھ نہیں تو ادیب ٹائپ کے شکست خوردہ ذہنیت والے لوگ خوبصورت کتابوں کو دیکھ کر ادائے بے نیازی سے کہیں گے۔ ''کسی پیسے والے کی لکھی ہوئی کتاب ہوگی، اس کو ادب و دب سے کیا واسطہ۔'' گویا خالص ادبی کتابوں کو لازمی طور پر بدسلیقگی سے چھپنا چاہیے۔ میرا اپنا حال یہ ہے کہ اُردو کی ''ادبی اور معیاری'' کتابیں اور رسالے پڑھتے پڑھتے آنکھوں کی بینائی جواب دے رہی ہے۔ یہ تو درست ہے کہ بعض ''صاحبانِ ثروت'' یا ''صاحبانِ اہمیت'' کی کتابیں (جن کو کتاب کہنے کے لیے بھی بڑی ہمت درکار ہے) بڑے طمطراق سے چھپی ہیں، جن سے ممکن ہے ذوق نظر کی تسکین ہوتی ہو، لیکن ذوقِ ادب کی تشنگی فرو نہیں ہوتی۔ مگر اسی کو بہانہ بنا کر ہمارے وہ احباب جنھیں ادیب یا شاعر کہلانے کا شوق ہے، ہر خوبصورت کتاب کو گردن زدنی قرار دے دیتے ہیں اور عمر بھر اس آرزو میں تڑپتے رہتے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ان کی کتاب نفاست سے چھاپ دے۔ حالانکہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہماری معیاری کتابیں اہتمام اور شان سے چھپیں جو نہ صرف یہ کہ ذہن و چشم کو روشنی بخشیں بلکہ اُردو کتابوں کو جگ ہنسائی سے بھی بچائیں۔

''شبنم شبنم'' کرشن موہن کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے جو گذشتہ سال ''غیر روایتی'' اہتمام و آرائش کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، ڈیزائن، جلد، کور ہر ایک سے ناشرین کی خوش ذوقی کا ثبوت ملتا ہے۔ جسونت سنگھ کے آرٹ نے کتاب کی ظاہری دلکشی میں مزید اضافہ کیا ہے۔ خاص بات یہ نہیں ہے کہ کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہے، بلکہ زیادہ قابلِ تعریف یہ امر ہے کہ کتاب سلیقہ اور نفاست سے چھاپی گئی ہے — ایک ایسا سلیقہ اور نفاست جو اُردو کے ناشرین میں (خصوصاً ہندوستان میں) شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ''شبنم شبنم'' کی بابت ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ''اُردو میں کم کتابیں اس خوبی سے چھپی ہوئی نظر سے گزری ہیں۔'' اس کے لیے انڈین اکیڈمی کے ایس۔ این ساہنی خاص طور پر قابلِ مبارکباد ہیں۔ عام قارئین نے بھی شاعر کے کلام اور ناشرین کے

حسن ذوق کو سراہا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ چند ماہ کے مختصر عرصے میں ''شبنم شبنم'' کا دوسرا ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ اس وقت میرے پیشِ نظر دوسرا ایڈیشن ہی ہے۔

کرشن موہن اُردو کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کا کلام کافی عرصے سے اُردو کے منتخب اور معیاری رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ زندگی کے عام، سیدھے سادے مسائل کو جن کی طرف بیشتر شعرا توجہ نہیں کرتے، وہ خلوص اور سادگی سے بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ عموماً اپنے محسوسات کو صاف اور واضح الفاظ میں ادا کرتے ہیں اور شاعری کو ابہام و اہمال کی سرحدوں میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ ان کی شاعری لطافتِ احساس اور رعنائیِ تخیل سے عبارت ہے۔

کرشن موہن بڑے شاعر نہیں ہیں۔ نہ خود ان کو اس کا دعویٰ ہے اور نہ ان کے کسی ''نادان دوست'' نے انھیں خواہ مخواہ بڑا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈسٹ کور کے فلیپ پر ڈاکٹر عابد حسین، اثر لکھنوی اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کی جو مختصر رائیں درج ہیں، وہ بھی بہت جچی تلی اور محتاط ہیں۔ ''شبنم شبنم'' کے دیباچہ نگار منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے بھی نہ صرف یہ کہ تعریف و تحسین میں مبالغہ کو راہ نہیں دیا، بلکہ انھوں نے شاعر کی بعض کمزوریوں کی طرف بھی اشارے کر دیئے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عَرض کیا کرشن موہن بڑے شاعر نہیں ہیں، لیکن وہ ایک لائقِ اعتنا، خوش گو اور قابلِ ذکر نئے شاعر ضرور ہیں۔ ان کی شاعری ہمیں متوجہ کرتی ہے۔ ان کی نظموں کے بعض موضوعات ہماری شاعری میں نئے ہیں اور موجودہ دور کے ادب کی فکری یکسانیت میں ان موضوعات کی نادرہ کاری بعض اوقات ہمیں چونکاتی بھی ہے۔ کرشن موہن نے ہندی کے نرم اور سبک الفاظ کا استعمال موقع و محل کی مناسبت سے خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ البتہ فارسی الفاظ اور تراکیب کے استعمال میں اکثر جگہ ثقالت آ گئی ہے۔ ان کی آزاد نظموں میں خیالات کی تازگی تو ہے، مگر اسلوب میں فنکارانہ جمال کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نظموں میں 'استقبال'، 'کنارِ آب کی ایک شام'، 'بلیدان'، 'اصلاحِ سخن' اور 'آوارگی' مجھے خاص طور پر پسند آئیں۔ غزلوں کے اکثر اشعار جذبے کی صداقت اور افکار کی سادگی کا خوبصورت نمونہ ہیں۔

''شبنم شبنم'' کی قیمت پانچ روپے رکھی گئی ہے جو کتاب کی دلکشی اور آرائش کے لحاظ سے نامناسب نہیں ہے۔

کاش ہمارے یہاں زیادہ سے زیادہ کتابیں اسی اہتمام سے شائع ہو سکتیں!

(''رفتارِ نو'' دربھنگا، شمارہ ۴، مئی ۱۹۶۱ء)

تاریخِ ادبِ اُردو، کرناٹک کرناٹک اُردو اکادمی بنگلور (مرتب)

ایک زمانہ تھا جب اُردو شعر و ادب پر کچھ مخصوص علاقوں کی ہی اجارہ داری تھی، لیکن اب اس کی جڑیں ملک کے دُور دراز خطوں تک پھیلی ہوئی ہیں اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اُردو زبان اپنے پرانے مسکن دہلی اور لکھنؤ میں اپنے بال و پر سمیٹ رہی ہے تو اس کا دائرۂ اثر ان ریاستوں میں بڑھا ہے، جہاں علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مثلاً تامل ناڈو، کرناٹک اور مہاراشٹر میں۔ مدراس سے تو اُردو کتابوں کی ایک باڑھ سی آگئی ہے جو اس زبان کی ہر دلعزیزی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

گذشتہ دنوں ایک نئی کتاب: ''تاریخِ ادبِ اُردو، کرناٹک'' منصۂ شہود پر آئی ہے۔ اسے کرناٹک اُردو اکیڈمی، بنگلور نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ ان میں پانچ مبسوط اور بھرپور مضامین شامل ہیں:

(۱) بہمنی دَور میں دکنی ادب کی نشو و نما

(۲) کرناٹک میں اُردو: آغاز و ارتقا

(۳) اُردو شاعری عادل شاہی دَور میں

(۴) کرناٹک کا سیاسی اور تاریخی پس منظر

(۵) پرانے میسور میں اُردو آزادی سے پہلے

اتنے متنوع موضوعات کا یکجا ہونا بذاتِ خود قابلِ قدر ہے۔ سارے مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں اور تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے کرناٹک میں اُردو زبان کے آغاز اور ارتقاء کی واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر کا عالمانہ مقالہ سوا سو صفحات پر مشتمل ہے۔ بقول پروفیسر عبدالغفار شکیل:

> ''دکنی ادب کا آغاز کرناٹک سے ہی ہوا۔ کرناٹک کے اہم شہر گلبرگہ، بیدر اور بیجاپور قدیم دکنی ادب کے اوّلین مراکز رہے۔''

دکنی ادب کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس کتاب کے مختلف مضامین میں بھی دکنی اُردو ادب کے بارے میں اتنا کچھ مواد جمع ہو گیا ہے کہ ان کے مطالعے سے زبان و ادب کے طالب علم پوری طرح سیراب ہو سکتے ہیں۔

اس کتاب کا چوتھا مضمون: "کرناٹک کا سیاسی اور تاریخی پس منظر" کتاب کے موضوع سے غیر متعلق ہے۔ یہ عنوان اپنی جگہ عمدہ سہی، لیکن اس کا تعلق تاریخ اور جغرافیہ سے ہے، ادب سے نہیں۔ اور اس کتاب میں اس مضمون کی شمولیت کا کوئی جواز نہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے کرناٹک میں ادبِ اُردو کی موجودہ صورتِ حال کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ اس سلسلے کا ایک مضمون ضروری تھا۔ موجودہ شکل میں یہ کتاب عدم تکمیلیت کا احساس دلاتی ہے۔ مرتب کی طرف سے دیباچہ یا پیش لفظ کی غیر موجودگی بھی کھٹکتی ہے۔

اُردو ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اُس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

("آج کل" دہلی، جولائی ۱۹۹۵ء)

بے نام گلیاں

کلام حیدری

کلام حیدری کا شمار اُردو کے معدودے چند اُبھرتے ہوئے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی زندگی ابھی مختصر ہے اور اس مختصر عرصے میں انھوں نے فنِ افسانہ نگاری کے مختلف اصولوں کا درک حاصل کرنے کی ہر امکانی کوشش کی ہے اور نئے ادیبوں میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کرلی ہے۔

کلام حیدری کے چودہ افسانوں کا مجموعہ "بے نام گلیاں" کے نام سے ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ ان افسانوں سے مصنف کی ذہانت، فنکارانہ صلابت اور صحت مند شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ "کھلیان اور سلاخیں" بلاشبہ اس مجموعہ کا سب سے اچھا افسانہ ہے۔ زبان و بیان میں حسن ہے اور مواد کو پیش کرنے کی تکنیک موثر ہے۔ دیگر افسانوں میں 'قیامت'، 'رُوپ بہروپ'، 'دعاء'، اور 'مسکراہٹ کے پیچھے' خصوصی طور پر قابلِ توجہ ہیں، "بے نام گلیاں" (جس افسانے کی بنیاد پر اس مجموعہ کا نام رکھا گیا ہے) مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آیا، حالانکہ اس میں انشا پردازی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اگر صرف تحریر کی خوبصورتی ملحوظ ہو تو "بے نام گلیاں" (اس عنوان کا افسانہ) کو یقیناً اونچا مقام دینا پڑے گا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کہانی میں کرداروں کی صحیح تصویرکشی اور ماحول کی حقیقی عکاسی اپنے پورے تاثر کے ساتھ نہیں ہو سکی۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اُردو کی لکھائی چھپائی کا معیار بڑی تیزی سے اُونچا ہو رہا ہے۔ "بے نام

گلیاں" کی طباعت وکتابت دربھنگا جیسے "غیر ادبی" شہر میں ہوئی ہے لیکن کتاب ہر طرح دیدہ زیب اور جاذب نظر ہے۔

کلام حیدری سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کا یہ کہنا درست ہے کہ "ہماری تحریک اور ہمارے ادب کو ایسے لکھنے والوں کی بڑی ضرورت ہے۔" مجھے یقین ہے کہ ان کا نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے بہت بہتر ہوگا اور میں یہ بھی اُمید رکھتا ہوں کہ اُن کے "نقشِ ثانی" کے لیے ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

(ماہ نامہ "معاون" کلکتہ، مئی ۱۹۵۵ء)

سہیل: جمیل مظہری نمبر

کلام حیدری (مرتب)

جمیلؔ مظہری کی شاعری ایک ایسا پھول ہے، جسے بہت عرصے تک پتّوں نے چھپائے رکھا لیکن پھول کی خوشبو، باغ کی مصنوعی چاردیواری سے باہر نکل ہی آتی ہے۔ "سہیل" کا "جمیلؔ مظہری نمبر" اسی تعطّر کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی ایک کوشش ہے اور اس امر کا اظہار کہ اس نکہت نے کس کس نہج سے مشام جاں کو معطر کیا ہے۔

جمیلؔ مظہری بحمد اللہ بقید حیات ہیں اور ان کی زندگی میں ہی ان سے متعلق ایک خاص نمبر کی اشاعت ہوئی ہے۔ شاید اسے صحافتی روایت کے خلاف سمجھا جائے، کیونکہ ہم لوگ مردہ پرستی کے عادی رہے ہیں۔ ویسے آج سے کم وبیش ۲۵ برس پیشتر شاہد احمد دہلوی نے عظیم بیگ چغتائی کی زندگی میں ہی "ساقی" کا چغتائی نمبر پیش کر کے روایت شکنی کا آغاز کر دیا تھا۔

"سہیل" نے کئی سال پہلے "جمیلؔ مظہری نمبر" اور "پرویز شاہدی نمبر" شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا اور ادریس سنسہاروی نے اس وقت دونوں خاص نمبروں کی ترتیب کی ذمہ داری مجھے سپرد کی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ میری فطری تساہلی اور اپنی پیدا کردہ پریشانیوں نے کام کو آگے نہ بڑھنے دیا، کیونکہ "جمیلؔ مظہری نمبر" کو بہتر اور اہل ہاتھوں سے انجام پذیر ہونا تھا۔

"جمیلؔ مظہری نمبر" ایک بڑا کام ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرتب نے ایمانداری، محنت اور سلیقہ شعاری کو پس پشت ڈال کر اپنے آپ کو وقتی طور سے نمایاں کرنے کا شوق پورا نہیں کیا۔ اس نمبر

کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ جمیلؔ کے فن اور دوسرا حصہ شخصیت سے متعلق ہے۔ دونوں حصوں کی مجموعی ضخامت ۴۴۰ صفحات ہے۔ پہلے حصّے میں ۱۸ مضامین ہیں جو جمیلؔ کے فن کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی محاکمہ پیش کرتے ہیں۔ لکھنے والوں میں نامور نقادوں کے دوش بدوش کچھ نیم معروف قلم کار بھی ہیں اور کچھ ایسے بھی جنھیں ''تازہ واردانِ ادب'' میں شمار کرنا چاہیے۔ لیکن مرتب کلام حیدری کے ذوق اور شعور کی صلابت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس نمبر میں کوئی غیر معیاری اور سطحی مضمون شامل نہیں ہو پایا۔ ویسے فروگذاشتیں کہاں نہیں ہوتیں۔ اور پھر اتفاق کے ساتھ ساتھ اختلاف کا حق بھی انسان کے پیدائشی حقوق میں شامل ہے۔

مجھے اس نمبر میں نظیر صدیقی کا مضمون سب سے زیادہ پسند آیا، ہر چند کہ یہ مضمون افراط و تفریط سے پاک نہیں ہے اور مجھے اس کے کئی حصوں سے اختلاف ہے، جس پر تفصیلی بحث کی اس مختصر سے تبصرہ میں گنجائش نہیں۔ ''جمیل کی شاعری میں فکری عنصر'' احتشام حسین کا نہایت خیال انگیز مقالہ ہے۔ یہ کام احتشام صاحب ہی کے کرنے کا تھا۔ اخترؔ اورینوی نے جمیلؔ مظہری کی غزل گوئی کا بہت ہی مفصل جائزہ پیش کیا ہے، جو ان کی ناقدانہ ژرف نگاہی کا پتہ دیتا ہے۔ جمیلؔ کی غزل نگاری پر علی اکبر نقوی نے ایک مخصوص زاویہ نظر سے بحث کی ہے، جس میں بڑی تازگی اور دلکشی ہے۔ محبوب خزاں، شاہ مقبول احمد اور ہنس راج رتن کے مضامین کئی لحاظ سے وقیع ہیں۔ علی عباس حسینی نے جمیلؔ مظہری کی نظموں اور غزلوں کے علاوہ ان کی مرثیہ نگاری پر بھی اجمال کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ بہتر ہوتا اگر جمیلؔ کے مرثیوں پر کوئی مستقل مضمون شریکِ اشاعت ہوتا۔ یہ مرثیے ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ (تعجب ہوتا ہے کہ اختر اورینوی نے اپنی کتاب ''قدر و نظر'' میں بہار میں مرثیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے جمیلؔ مظہری کو کس طرح نظر انداز کر دیا، جبکہ انھوں نے جمیلؔ صاحب کے ایک غیر معروف شاگرد ذھتونی لال وحشی کا ذکر کیا ہے)

پہلے حصے کے ۱۸ مضامین میں سے پانچ (گویا ۳۰ فیصدی) جمیلؔ کی غزل گوئی سے متعلق ہیں۔ چار مضامین کے تو عنوانات ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ شاہ مقبول احمد نے اپنے مضمون ''جمیلؔ مظہری کے بعض افکار'' میں بھی دراصل ان کی غزل گوئی سے ہی بحث کی ہے۔ جمیلؔ کی شاعری کے ایک خاص پہلو سے متعلق اتنے مضامین شاید اس لیے شامل ہو گئے، کیونکہ ''فکرِ جمیل'' کی اشاعت کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ شاہدہ خیر، نزہت خیر اور قیصر خیر تینوں بہنوں کے مضامین نے نمبر میں تنوع پیدا کیا ہے۔ ''جمیلؔ کی شاعری میں عورت''، ''جمیل کی سیاسی شاعری'' اور ''جمیل کا اسلوب'' علی الترتیب ان

مضامین کے عنوانات ہیں۔ان میں سے شاہدہ خیر کا مضمون خاص طور پر کافی محنت سے لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔اس نمبر میں بڑی کمی رہ جاتی اگر ابراہیم ہوش اور رضا نقوی کے مضامین شامل نہ ہوتے۔ صرف ''نقشِ جمیل'' اور ''فکرِ جمیل'' کا مطالعہ کرنے والے حضرات جمیلؔ مظہری کی اس صلاحیت سے بے خبر ہی ہوں گے جو ہجویہ اور طنزیہ شاعری میں اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ان مضامین کے علاوہ پہلے حصّے کی ایک بہت ہی خاص چیز کلام حیدری کا لیا ہوا جمیلؔ صاحب کا انٹرویو ہے۔جمیلؔ مظہری کو سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔انھوں نے اکثر جگہ بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔

''جمیلؔ مظہری نمبر'' کا دوسرا حصہ (خط وخال) پہلے حصّے کے مقابلے میں بے رنگ معلوم ہوتا ہے۔بعض مضامین اتنے سرسری اور رسمی ہیں کہ انھیں ''تبرکات'' میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔شاید کسی کی زندگی میں اس کے خط وخال کو ایمانداری سے اُجاگر کرنا کچھ بہت آسان بھی نہیں ہے۔رضا مظہری کا مضمون اس حصّے کی جان ہے۔جمیلؔ صاحب کے خاندانی حالات اور ان کی شعری نشو ونما اور محرکات کی واقفیت کے لیے اس مضمون کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔مستقبل کے مؤرخ کے لیے یہ تحریر ہمیشہ اہمیت رکھے گی۔جمیلؔ مظہری کی حیات و شخصیت کے بعض ''راز ہائے درونِ پردہ'' کے انکشاف کا حق تو سیّد محمود طرزی کو ہی پہنچتا ہے،لیکن اپنی بے باکی اور صاف گوئی کے باوجود وہ بہت کچھ چھپا گئے ہیں۔ ان کے مضمون سے میری تشنگی اور بڑھ گئی۔اس سے زیادہ تو وہ مختصر سی گفتگو کے دوران زیادہ دلچسپ پیرائے میں جمیلؔ صاحب کی بابت بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔کاش کہ وہ جمیلؔ صاحب کی شخصیت پر کوئی اور تفصیلی مضمون لکھیں۔''جمیلؔ مظہری نمبر'' کے دونوں حصوں میں خواتین کی نگارشات کافی اچھی ہیں۔دوسرے حصّے میں صوفیہ فضل،روحی حسن اور اُمّ حبیبہ تینوں کے مضامین اپنی دلچسپ طرزِ تحریر کے باعث متوجّہ کرتے ہیں۔منیر خاں کا لکھا ہوا خاکہ مزیدار ہے۔لیکن زبان کی خامی اکثر جگہ کھٹکتی ہے۔خاں صاحب نے ایک جگہ ''سلام کا جواب'' کی بجائے ''سلام کا پاسخ'' لکھا ہے۔اس قدر ''مفرس'' ہونے کی ضرورت نہ تھی۔دوسری جگہ آپ نے ''قابلِ گردن زدنی'' استعمال کیا ہے جو قطعی نادرست ہے۔یوں بھی یہ مضمون اس سے پہلے ''اشارہ'' پٹنہ (ستمبر ۱۹۵۹ء) میں چھپ چکا ہے۔ ندیم نقوی کا مضمون بھی ''آثار'' کلکتہ (یکم اپریل ۱۹۶۰ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ان مطبوعہ مضامین کی شمولیت کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

''جمیلؔ مظہری نمبر'' کا دوسرا حصہ ہر چند کہ ۱۴۲ صفحات پر مشتمل ہے،لیکن خدوخال سے متعلق حصہ دراصل صرف ۸۲ صفحات ہی پر محیط ہے۔باقی صفحات میں علاّمہ کا کچھ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام اور ان

کی نثر نگاری کے دو خوبصورت نمونے دیئے گئے ہیں۔ جمیلؔ صاحب کا افسانہ ''ایک سوال'' (جو پہلے 'نگار' میں چھپا تھا) اور ان کا خطبۂ صدارت دوبارہ شائع کر کے مرتب نے ایک نیک کام کیا ہے۔ ان دونوں مضامین کا مطالعہ جمیلؔ صاحب کے معاشرتی، مذہبی اور ادبی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ''جمیلؔ مظہری نمبر'' میں موصوف کی نثر نگاری پر ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت تھی کیونکہ آپ اس باب میں بھی ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں۔

کتابت وطباعت نمبر کے شایانِ شان نہیں ہے۔ فہرست میں صرف لکھنے والوں کے نام کے بجائے مضامین کے عنوانات بھی دیئے جاتے تو بہتر تھا۔ نمبر کے دوسرے حصے میں تصاویر اچھی نہیں چھپیں اور تصویروں کے نیچے جن ناموں کی کمپوزنگ ہوئی ہے ان کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اپنی وقعت اور اہمیت کے لحاظ سے دونوں حصوں کی مجموعی قیمت پانچ روپے غیر مناسب نہیں، لیکن اسے زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے کے لیے کم از کم ایک ڈیڑھ روپے کم قیمت رکھنی چاہیے تھی۔

جمیلؔ مظہری ایک عہد آفریں شاعر ہیں۔ ان کی بابت ابھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ یقین ہے کہ آئندہ بہت زیادہ لکھا جائے گا۔ لیکن مستقبل کے لکھنے والے ''جمیل مظہری نمبر'' سے روشنی پاتے رہیں گے اور ''سہیل'' گیا کی یہ پیشکش ہمیشہ سر آنکھوں پر رکھی جائے گی۔

(''رفتارِ نو'' دربھنگا، شمارہ ۳، جنوری ۱۹۶۱ء)

📖

سائکی

کلیم عرفی

نوجوان مصنف کلیم عرفی نے ورجل اور ہومر سے متاثر ہو کر یونانی اساطیر کی بنیاد پر سائکی اور کیوپڈ کی مشہور داستانِ محبت کو اپنے پُر اثر اور دل نشیں انداز میں ڈرامہ کی شکل دی ہے۔ غالباً کلیم عرفی کی یہ پہلی کتاب ہے، لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عرفی صاحب کو ادب کا بہت اچھا ذوق عطا ہوا ہے، اور ان سے واقعی کسی بلند پایہ تصنیف کی توقع کی جا سکتی ہے۔

''سائکی'' ایک قدیم اساطیری کہانی ہے۔ کیوپڈ اور سائکی کے علاوہ جوپٹر، وینس، ہرکولس، اپالو، نارسی س، اکسٹس وغیرہ اس کے خاص کردار ہیں۔ کوہ اولمپس کے دیوتاؤں کی عظمت وجبروت، ان کی شان وشوکت، ان کی محبت، ان کی خوبیاں، ان کی کمزوریاں — بڑی خوبی سے اُجاگر کی گئی

ہیں۔ کلیم عرفی نے ڈرامہ کی مروّجہ اور اصل تکنیک سے انحراف کیا ہے۔ لیکن شاید فضا اور ماحول کے لحاظ سے اس انحراف کی ضرورت تھی۔ بحیثیت مجموعی کلیم عرفی کی کوشش لائق ستائش ہے۔

کتاب انتہائی دیدہ زیب ہے۔ الہٰ آباد میں لکھائی چھپائی کا یہ اعلیٰ معیار حیرت انگیز ہے۔ ناشرین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ان سے اُمید ہے کہ وہ آئندہ بھی ایسی ہی خوبصورت کتابیں شائع کریں گے۔

"سائکی" کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہوگا جو قدیم یونانی اور رومی اساطیر سے ناآشنا ہیں۔

(ماہنامہ "معاون" کلکتہ، مئی ۱۹۵۵ء)

پگڈنڈی: سجاد حیدر یلدرم نمبر — مبارز الدین رفعتؔ (مرتب)

بڑی شخصیتوں کی موت کے بعد اخبارات و رسائل نے اکثر اپنے خصوصی نمبر شائع کیے ہیں اور "مردہ پرستی" کی پھبتی سہتے رہے ہیں۔ منٹو اور مجاز کی وفات کے بعد کئی رسالوں نے اپنی خصوصی اشاعتوں کے ذریعے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ابھی حال ہی میں "نگارش"، "فروغِ اُردو"، "صبحِ نو" اور "نگار" نے کامیاب "جگر نمبر" پیش کیے۔ "پگڈنڈی" کے "سجاد حیدر یلدرم نمبر" کی حیثیت مذکورہ نمبروں سے ذرا مختلف ہے۔ یہ نمبر یلدرم کی وفات کے اٹھارہ سال بعد شائع ہوا ہے، جب ہمارا اُردو داں طبقہ اپنے ادب کے اس عظیم محسن کو فراموش کرتا جا رہا تھا، اس لیے اتنا یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ "پگڈنڈی" کی یہ "مردہ پرستی" کسی تجارتی مفاد کے پیشِ نظر نہیں ہے۔

سجاد حیدر یلدرم اُردو ادب کی قدر آور شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ اس صدی کے آغاز سے انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ اُردو میں مختصر افسانہ نویسی کی بنیاد انھیں نے رکھی۔ "خیالستان" ان کے مختصر افسانوں کا دلکش مجموعہ ہے، جو پہلی بار ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ یلدرم کی شہرت خاص طور پر ترکی زبان کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے ترجموں کے باعث ہے۔ انھیں ترجمہ کرنے کا ایسا سلیقہ تھا کہ عنایت اللہ دہلوی مرحوم اور ل۔ احمد اکبر آبادی کے علاوہ کسی اور کے حصے میں یہ مہارت نہیں آئی۔ اُردو

میں انشائے لطیف کی ابتدا بقول رشید احمد صدیقی ''شرر، ریاض اور یلدرم کی تحریروں سے ہوئی۔''
یلدرم نے ادبِ لطیف اور مفکرانہ اور فلسفیانہ ادب کا نیا اسلوب اُردو زبان میں پیدا کیا۔ اِس طرزِ تحریر نے اُردو کے بعض نہایت اہم انشا پردازوں اور افسانہ نگاروں کو متاثر کیا، جن میں نیاز فتح پوری، ل۔ احمد اکبر آبادی، سلطان حیدر جوشؔ، قاضی عبدالغفار اور مجنوں گورکھپوری کے نام آتے ہیں۔

''یلدرم نمبر'' کو مبارز الدین رفعتؔ نے مرتب کیا ہے جو خود ایک مشہور ادیب اور مترجم ہیں۔ موصوف اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے ''یلدرم اور اُن کی تحریروں سے قلبی رابطہ'' رکھتے ہیں۔ اس نمبر میں وہ تمام اہم مضامین شامل ہیں جو یلدرم کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ چند نئے مضامین بطورِ خاص لکھوائے گئے ہیں۔ یلدرم کی نثر و نظم کے نمونے بھی ہیں، ان کی عکسی تحریر بھی، چند یادگار فوٹو بھی۔

خواجہ غلام السیدین، مشتاق احمد زاہدی، رشید احمد صدیقی، پطرس، سیّد رضا علی، صلاح الدین احمد اور اسلوب احمد انصاری جیسے لکھنے والوں کی نگارشات کے علاوہ یلدرم کی صاحبزادی قرۃ العین حیدر کا ایک مضمون ہے۔ پھر ان کا ایک افسانہ اور ان کے ناول کا ایک حصہ جن میں یلدرم کی شخصیت کے نقوش بڑی خوبصورتی سے اُجاگر ہوئے ہیں۔ یلدرم مرحوم کی رفیقۂ حیات نذر سجاد حیدر کے دو تاثراتی مضامین بھی شامل ہیں۔ پُرانے مضامین کے ساتھ سنۂ تحریر یا سنۂ اشاعت دے دیا جاتا تو بہتر تھا۔ یلدرم کی شاعری کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے اور اس سلسلے میں کئی مضامین شامل ہیں۔ یہ سراسر مبالغہ آرائی ہے۔ یلدرم میں کوئی شاعرانہ خصوصیت نہ تھی۔ لے دے کر ''مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں'' ایک غنیمت نظم ہے، جو انھوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں لکھی تھی۔

نثار احمد فاروقی نے ''پیش گفت'' میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''نقوش'' کے ''پطرس نمبر'' کے علاوہ گذشتہ دس سال میں کسی شخصیت پر ''اتنا وقیع، ضخیم، اچھا اور شاندار'' نمبر شائع نہیں ہوا جتنا کہ ''پگڈنڈی'' کا یلدرم نمبر۔ اِس طرح کے دعوؤں سے پڑھنے والے بُرا اثر قبول کرتے ہیں۔ مقابلے اور موازنے کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن میرے خیال میں اس کا یہ موقع نہ تھا۔ ابھی حال میں ''سہیل'' نے ایک بہت ہی شاندار اور ضخیم ''جمیل مظہری نمبر'' شائع کیا ہے۔ پھر ''نقوش'' ہی کے منٹو نمبر یا ''نگار'' کے چند خاص نمبر مثلاً ''حسرت نمبر'' کو کیا کہیں گے؟

اس دعوے سے قطع نظر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ''پگڈنڈی'' کے یلدرم نمبر کی ایک مستقل دستاویزی حیثیت ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کی بابت اتنی ساری معلومات کہیں یکجا نہیں مل سکتیں۔

(''رفتارِ نو'' دربھنگا، سالگرہ نمبر، جنوری ۱۹۶۲ء)

ہوئے ہم دوست جس کے

مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین ہمہ جہت مزاح نگار ہیں۔ ہمہ جہت سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے صرف مزاحیہ مضامین ہی نہیں لکھے، بلکہ ان مضامین کے ساتھ ساتھ انھوں نے شخصی خاکے بھی لکھے اور کالم نگاری بھی کی۔ (حق تو یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین نے اپنی مزاح نگاری کا آغاز کالم نویسی سے کیا تھا اور اس کا انجام بھی کالم نویسی ہی سے ہو رہا ہے۔) ان تمام ادبی اور صحافتی صورتوں یا اصناف میں انھوں نے طنز وظرافت کا اعلیٰ معیار برقرار رکھا ہے۔ انھیں زبان و بیان پر دسترس ہے اور وہ نہایت شگفتہ، چست اور منجھی منجھائی نثر لکھنے پر قادر ہیں۔

''ہوئے ہم دوست جس کے''، مجتبیٰ حسین کے سترہ خاکوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ سترہ کے بجائے انیس کہنا شاید زیادہ مناسب ہو، کیونکہ شمس الرحمٰن فاروقی اور نثار احمد فاروقی کے حوالے سے دو دو خاکے ہیں، یا انھیں خاکے نہ کہیں تو یادداشتوں پر مبنی تاثراتی مضامین کہہ لیں۔ سب کی سرحدیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔

خاکے کی کوئی جامع و مانع تعریف شاید ممکن نہیں۔ شخصی خاکے بھی کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جس میں صاحبِ خاکہ کے خط و خال، حلیہ، حرکات، چال ڈھال، طرزِ گفت و شنید وغیرہ کو کسی منصوبے کے تحت بطور خاص اُجاگر یا ظاہر کیا گیا ہو۔ ایسے خاکے کو ہم ایک طرح کی قلمی تصویر بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ نکتہ چینی کا اسلوب اختیار کر کے شخصیت کے بعض مضحک پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے۔ بعض خاکہ نگار کسی شخص کے تعلق سے یادوں کا نگار خانہ سجا لیتے ہیں اور اس کی مدد سے صاحبِ خاکہ کی شخصیت آشکار کرتے ہیں۔ کچھ خاکہ نگار تھوڑی یا زیادہ تعریف کے ساتھ ہلکی سی تنقید کے لیے فضا تیار کر لیتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، شمس الرحمٰن فاروقی، نثار احمد فاروقی، وحید اختر، شکیل الرحمٰن، قمر رئیس، قتیل شفائی، استاد محمود مرزا، ریڈیو اناؤنسر اور اداکار دیو کی نندن پانڈے کے خاکے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ رشید الدین خاں، ابراہیم شفیق، عوض سعید، ف۔ س۔ اعجاز، رشید قریشی، علی باقر اور وہاب عندلیب کے بھی خاکے ہیں۔ یہ خاکے صاحبانِ خاکہ کے کردار کی خوبیوں اور مزاج کے خواص کو ہلکے پھلکے دلچسپ اسلوب میں پیش کرتے

ہیں۔ مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی کو پانچ لاکھ کا سرسوتی سمان ملنے پر مجتبیٰ حسین یوں رقم طراز ہیں:

"شمس الرحمٰن فاروقی ان لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے نہ صرف اپنے ادبی اور تنقیدی معیار کو برقرار رکھا ہے، بلکہ انعامات لینے کے معاملے میں بھی وہ ایک خاص معیار کو برقرار رکھنے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں جب بھی کوئی انعام ملا تو بڑا انعام ہی ملا۔ ایرے غیرے چھٹ بھیئے انعامات کو لینے سے انھوں نے ہمیشہ گریز کیا ہے۔"

اس مجموعہ میں شامل کئی خاکے کسی نہ کسی موقعے، یا تقریب کے لیے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً راج بہادر گوڑ کا خاکہ ان کی پچھتر ویں سالگرہ پر، شمس الرحمٰن فاروقی کا خاکہ "کتاب نما" کے فاروقی نمبر کی رسم اجرا، اور پھر انھیں سرسوتی سمان ملنے پر، نثار احمد فاروقی کا خاکہ ان سے متعلق "کتاب نما" کے خاص نمبر اور پھر اُتر پردیش اُردو اکادمی کا ایک لاکھ گیارہ ہزار کا انعام ملنے پر، شکیل الرحمٰن کا ان کے ممبر پارلیمنٹ منتخب ہونے پر اور وحید اختر کا خاکہ ان کے انتقال پر لکھا گیا۔

شاعر، ادیب، تنقید نگار، دانشور، موسیقار، ریڈیو اناؤنسر، ظاہر ہے ان سب کی دلچسپیاں اور مشاغل مختلف ہیں، مگر ان تمام شخصیتوں کو مجتبیٰ حسین نے بڑی خوبی سے اپنی خاکہ نگاری کے دائرے میں لے لیا ہے۔ دراصل وہ دوستوں کے دوست ہیں اور یہ سارے خاکے ان کی دوست داری، محبت، انسانی اخوت اور دردمندی کے مظاہر ہیں۔ مجتبیٰ حسین جس کے دوست ہوتے ہیں، آسمان بھی دشمن بن کر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ خاکے خود انھوں نے "اپنا خاکہ لکھنے کی چاٹ" میں لکھے ہیں۔ مجتبیٰ حسین دوستوں کا خاکہ لکھتے لکھتے بیچ بیچ میں اپنا خاکہ بھی لکھ جاتے ہیں، بلکہ یوں کہیے کہ اپنا خاکہ اُڑانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے ممدوح کے ایسے حالات و واقعات کو سامنے لے آتے ہیں جن کے لیے خود ان کا مشاہدہ شاہد ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ بڑے سلیقے اور بڑی محبت سے طنز کے نشتر بھی لگا جاتے ہیں اور یہ بات کسی کو ناگوار شاید لگتی بھی ہو تو شکایت کا محل نہیں ہوتا کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کی بنا خود ان کا مشاہدہ و مطالعہ ہے۔

سیدھی سادی باتوں میں مضحکہ خیز پہلو نکال لینا مجتبیٰ حسین کا خاصہ ہے۔ وہ فوٹو گرافی کے نہیں مصوری کے قائل ہیں۔ ان کی تحریر میں ایک بے ساختگی، روانی اور فطری بہاؤ ہے جو پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ ان کے خاکوں میں مزاح ہی مزاح نہیں ہے، مزاح کے ساتھ سنجیدگی بھی ان کے خاکوں کی خصوصیت ہے۔ آخر تک آتے آتے اکثر ان میں حزن و ملال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات تو قہقہوں اور آنسوؤں کا امتزاج ہی ان خاکوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

حزن اور ملال کی یہ خصوصیت مجتبیٰ حسین کے ان خاکوں میں زیادہ ہے جو ان کے پرانے مجموعوں مثلاً "آدمی نامہ" میں شامل تھے۔ "ہوئے ہم دوست جس کے" کے خاکے "سیاست" حیدرآباد کے ہفتہ وار کالم کے لیے لکھے گئے ہیں، اور کالم کی اپنی حدود اور مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ان میں مجتبیٰ حسین کی فطری شگفتہ بیانی تو خیر ہر جگہ موجود ہے، مگر اکثر اس آنچ کی کسر دکھائی دیتی ہے جس نے ان کے بہترین خاکوں کو کندن بنا دیا ہے۔

("شب خون" الٰہ آباد، شمارہ ۲۳۴، فروری ۲۰۰۱ء)

نقوش: افسانہ نمبر

محمد طفیل (مدیر)

اُردو ادب کا گذشتہ پچیس سالہ دور دراصل اُردو افسانے کا دور ہے۔ اس دور کے دس بہترین افسانہ نویسوں کا انتخاب کرنا ہو تو ہمارے ذہن میں فوراً کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت، احمد ندیم، اختر اورینوی، محمد حسن عسکری، ممتاز مفتی، سہیل عظیم آبادی اور اُپندر ناتھ اشک کے نام آتے ہیں۔ اپنے ذوق کے مطابق اس فہرست میں تھوڑی سی تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ فہرست کو کچھ اور طول دیجیے تو علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، دیوندر ستیارتھی، غلام عباس، بلونت سنگھ، عزیز احمد، شکیلہ اختر، قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، شوکت صدیقی، جیلانی بانو، انور عظیم اور واجدہ تبسم کے نام سامنے آتے ہیں۔ ویسے اچھے افسانہ نگاروں کی فہرست یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ان بلند پایہ افسانہ نگاروں میں سے بیشتر "نقوش" لاہور کے تازہ ترین افسانہ نمبر میں شریک ہیں۔ یہ نمبر پہلی ہی نظر میں اپنی ضخامت کے باعث مرعوب کرتا ہے۔ پھر فہرست پر نظر ڈالیے تو بیدی، کرشن چندر، منٹو، عصمت، احمد عباس، اشک، عباس حسینی، دیویندر ستیارتھی، شکیلہ اختر، مہندر ناتھ، قدرت اللہ شہاب، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، رام لعل، دیویندر اسّر یونس رمزی کے علاوہ ل۔ احمد اکبر آبادی، حجاب امتیاز علی اور عبدالرحمٰن چغتائی جیسے پُرانے لکھنے والوں کا ایک ہی جگہ اجتماع دِکھائی دیتا ہے۔ اگر یہ "معجزہ" نہیں تو کیا ہے!

۷۰۰ صفحات کے اس نمبر میں ۳ ناولٹ، ۲ رپورتاژ، ایک طویل ڈرامہ، ۳ طویل مختصر افسانے اور ۳۲ افسانے شامل ہیں۔ اس نمبر کے سارے مشتملات کی بابت کوئی رائے پیش کرنا سر دست میرے

لیے ممکن نہیں، کیونکہ پڑھے بغیر تبصرہ کرنے کا فن ابھی تک میں نے نہیں سیکھا۔ البتہ چند نگارشات پر اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا ہوں۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ "ایک چادر میلی سی" بلاشبہ قدر اوّل کی چیز ہے۔ توقع تھی کہ بیدؔی اپنی گنجلک اور ناہموار زبان کو آہستہ آہستہ درست کرلیں گے، مگر ابھی تک ان کی زبان میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ شاید کچھ اور بگڑی ہی ہے۔ اگر بیدؔی اپنے آپ کو اس عیب سے بچالیتے تو ان کی مقبولیت خواص سے آگے بڑھ کر عوام تک بھی پہنچ جاتی۔ بہر حال بیدی تو پھر بھی بیدی ہیں۔ کردار نگاری، فضا بندی، پلاٹ کی تعمیر، نفسیاتی مطالعہ اور انسانی نقطۂ نظر کے لحاظ سے یہ ناولٹ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ویسے ابتدائی ایک دو صفحے جبر کرکے پڑھنے پڑتے ہیں۔

کرشن چندر کا افسانہ "تائی ایسری" صحیح معنوں میں بڑا افسانہ ہے۔ کرشن کے فن پر پھر بہار آرہی ہے۔ گذشتہ تین سال کے عرصے میں کرشن نے بہت سے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن ان میں "گلدان" اور "تائی ایسری" کا مرتبہ شاید سب سے بلند ہے۔ منٹو کا آخری افسانہ (جیسا کہ مدیر نے یقین دلایا ہے) "کالی کلی" ان کے مخصوص رنگ سے ہٹا ہوا ہے، مگر ہے خوبصورت اور لطیف۔ چونکہ منٹو کی وفات کے بعد بہت سے ناشروں نے دوسروں سے افسانے لکھوا کر مرحوم کے نام سے چھاپ دیئے، اس لیے "نقوش" میں "کالی کلی" کی آخری چند سطریں منٹو کے اپنے حرفوں میں چھاپی گئی ہیں۔ منٹو کے دستخط بھی ہیں تا کہ یہ احتمال نہ رہے کہ یہ منٹو کا افسانہ نہیں ہے۔ ویسے ذاتی طور پر میں یہ سمجھ نہ پایا کہ منٹو کے ہاتھ کی تحریر لیتھو میں کس طرح چھاپی جا سکی۔ چونکہ "نقوش" کے مدیر طفیل صاحب صرف نام بیچنے کے قائل نہیں ہیں، اس لیے منٹو کے ہاتھ کی تحریر کے بغیر بھی یقین کرنا ہی پڑتا کہ افسانہ منٹو کا ہی ہے۔

شکیلہ اختر ان دنوں بہت کم لکھ رہی ہیں۔ ان کا طویل مختصر افسانہ "سرحدیں" بڑے نازک احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ پھر بہار کی فضا، ماحول اور زبان کو شکیلہ نے حسب معمول چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ "سرحدیں" کو شکیلہ اختر کے بہت اچھے افسانوں میں شمار کرنا چاہیے۔

سچن سین گپت کے مشہور بنگالی ڈرامے "سراج الدولہ" کا بے انتہا کامیاب ترجمہ احمد سعدی نے کیا ہے۔ بنگالی افسانوں اور ڈراموں کے اُردو مترجم کی حیثیت سے محمد یونس احمر کے بعد احمد سعدی کا ہی نام پیش پیش ہے۔ 'سراج الدولہ' کہیں سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔

اُردو افسانے کی رومانوی تحریک کے علمبرداروں میں ل۔ احمد اکبرآبادی کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب آپ کا نقطۂ نظر رومانوی نہیں انقلابی ہے۔ ل۔ احمد اکبرآبادی کے افسانوں کا رنگ ۳۵-۱۹۳۴ء میں ہی بدل چکا تھا۔ "افسانۂ حقیقت" اسی تبدیل شدہ رنگ کا نمائندہ افسانہ ہے۔

"نقوش" کے ساتھ ہی بھاری بھرکم نمبروں کا تصور وابستہ ہے۔ ضخامت اور معیار دونوں

حیثیتوں سے اس وقت اُردو کا کوئی رسالہ اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جو حضرات اس اندیشے سے دُبلے ہوئے جا رہے ہیں کہ اُردو افسانہ رو بہ زوال ہے، اُنھیں 'نقوش' کے تازہ ضخیم افسانہ نمبر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

("رفتارِنو" دربھنگا، شمارہ نمبر ۳، جنوری ۱۹۶۱ء)

مجلس: عبدالحق نمبر

محمد منظور احمد (مدیر)

جب سے "سہیل" گیا کا "جمیل مظہری نمبر" شائع ہوا ہے، زندہ ادیبوں اور شاعروں کے نمبر نکالنے کی ایک ہوا بندھ گئی ہے۔ خود "سہیل" نے "کلیم الدین احمد نمبر" کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ "صنم" پٹنہ نے "پرویز شاہدی نمبر"، "ندیم" ڈھاکہ نے "عندلیب شادانی نمبر"، "شاہکار" نے "فراق نمبر"، "پگڈنڈی" نے رشید احمد صدیقی نمبر"، "افکار" نے "جوش نمبر"، "خیال" کامٹی نے "کرشن چندر نمبر" اور "نگارش" نے "احمد ندیم قاسمی نمبر" کے اعلانات کیے ہیں۔ "مردہ پرستی" کی روایت کے خلاف یہ "احتجاج" مناسب سہی، لیکن اس کا بھی خطرہ ہے کہ کہیں ہر ایرے غیرے سے متعلق خاص نمبروں کے نکلنے کی تحریک نہ شروع ہو جائے اور خود ادیب و شاعر جو پہلے ایڈیٹروں سے گذارش کیا کرتے تھے کہ:

"بہرِ خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجیے"

اب ذرا سی ترمیم سے یہ درخواست نہ کرنے لگیں کہ:

"بہرِ خدا ہمارا بھی نمبر نکالیے"

یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں ہے۔ اِس نوعیت کا ایک آدھ اعلان شائع بھی ہوا ہے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، بڑی شخصیتوں پر اُن کی زندگی میں ہی نمبر نکلیں یا مستقل تصانیف لکھی جائیں تو یہ ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ منٹو اِس طرح کی آرزو لیے دُنیا سے سدھار گئے۔ اگر ان کی زندگی میں ہی وہ "منٹو نمبر" شائع ہو جاتا جسے وہ خود مرتب کرنا چاہتے تھے، تو یہ بڑے معرکے کی چیز ہوتی۔

بہر حال، اس بحث کا یہاں موقع نہیں۔ میرے پیشِ نظر "مجلس" کا ضخیم "عبدالحق نمبر" ہے جو موصوف کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق ان کی زندگی میں ہی شائع ہوا تھا (افسوس ہے کہ جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، موصوف ہم میں نہیں رہے!)

اُردو مجلس حیدر آباد کی جانب سے بابائے اُردو کی ۹۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ''یوم عبدالحق'' کا انعقاد کیا گیا تھا۔اس اجلاس میں پڑھے گئے مضامین کے علاوہ کچھ اور تحریریں بھی اس نمبر میں شریک کی گئی ہیں۔بابائے اُردو کے متعلق بعض اہم شخصیتوں کے پیامات و تاثرات بھی ہیں، چند شعراء کی نظمیں بھی اور مولوی عبدالحق کے چند خطوط بھی۔

ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، خواجہ حمید الدین شاہد، پنڈت ونشی دھر ودیالنکار، نثار احمد فاروقی، خلیق انجم اور ساجد علی نے کافی محنت سے مولوی عبدالحق کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر سیر حاصل تبصرے کئے ہیں۔وزیر حسن دہلوی کا مضمون ''اُردو کے بڑے میاں'' ان کے مخصوص طرزِ نگارش کا دلپذیر نمونہ ہے۔مضمون نگاروں کی فہرست میں پروفیسر عبدالقادر سروری، نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر محی الدین زورؔ جیسے نام بھی ہیں۔مگر ان کے مضامین بے حد تشنہ اور سرسری ہیں۔سہیل عظیم آبادی اور جگن ناتھ آزاد کے تاثراتی مضامین اچھے ہیں۔ایک ہی موضوع پر ایک سے زیادہ مضامین کی ضرورت نہ تھی۔

۲۴۴ صفحات کا یہ رسالہ خوبصورت ٹائپ میں شائع ہوا ہے۔یہ اُردو کی بدقسمتی ہے کہ اب تک اس کا ٹائپ مقبول نہ ہو سکا۔اگر ہمارے رسالوں اور کتابوں کی بڑی تعداد ٹائپ میں شائع ہونے لگے تو لامحالہ لوگ اسے پسند کرنے لگیں گے اور یہ اُردو کے حق میں نیک فال ثابت ہوگا۔اُردو مجلس کے معتمد اعزازی اور ''مجلس'' کے مدیر محمد منظور احمد ہر طرح ہمارے شکریے اور تحسین کے مستحق ہیں۔''عبدالحق نمبر'' ان کی خوش ذوقی اور حسن ترتیب کا آئینہ دار ہے۔

(''رفتارِ نو'' دربھنگا، سالگرہ نمبر، جنوری ۱۹۶۲ء)

کلّیاتِ ساغر نظامی

ڈاکٹر مظفر حنفی (مرتب)

اقبال کے بعد کی نسل میں جن شعرا نے سامعین اور قارئین دونوں کے دِلوں میں سُرعت کے ساتھ گھر کیا ان میں جوشؔ، جگرؔ، ساغرؔ اور حفیظ کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔یہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھائی دہائی کی بات ہے۔مشاعروں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔یہ وہ وقت تھا جب مشاعرے ہماری تہذیبی زندگی کا حصہ تھے اور شاعر کو وزن و وقار عطا کرتے تھے۔ساغر نظامی اس قبیلے

کے ایک نمایاں شاعر تھے۔ ایک وقت میں فرق مراتب کے باوجود جوشؔ اور ساغرؔ کا نام ایک ساتھ لیا جاتا تھا۔ ساغرؔ کے ترنم میں ایک خاص قسم کا لوچ تھا جو اپنے اُتار چڑھاؤ کے باعث انفرادیت پیدا کرلیتا تھا۔ اپنی نوجوانی کے دنوں میں ہی وہ اپنے اس شعر کی وجہ سے سارے اُردو معاشرے کے محبوب بن گئے تھے:

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حُسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

کلیم الدین احمد نے اپنی خود نوشت ''اپنی تلاش میں'' میں لکھا ہے کہ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں ساغر نظامی کی نظمیں اپنی نوٹ بک میں نقل کیا کرتے تھے۔ ساغرؔ، کلیم الدین احمد سے قریباً تین سال بڑے تھے، لیکن انھوں نے کم عمری میں ہی اتنی شہرت حاصل کرلی تھی کہ موخر الذکر اپنی نوعمری میں اُن کے کلام کو حرزِ جاں بنانے لگے تھے۔ یہ وہی کلیم الدین احمد ہیں جو بعد میں بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لائے۔

ساغرؔ اپنی وضع قطع، اپنی نفاست پسندی، اپنی شائستگی اور اپنے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے شاعروں کے درمیان اپنی ایک الگ شان رکھتے تھے۔ انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، لیکن نظم اور گیت کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کی انقلابی، قومی اور سیاسی نظمیں آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں کافی مقبول ہوتی تھیں۔ انھوں نے اپنی بہت سی نظموں اور گیتوں میں ہیئتی تجربے بھی کیے، مثلاً انھوں نے اپنی نظم ''موجوں کے ساز پر ملاّح کا گیت'' میں ہم آواز الفاظ کی تکرار سے ہی نہیں بلکہ ارکان کی کمی بیشی سے بھی بڑا فائدہ اٹھایا ہے، جس سے نظم کی نغمگی میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔

ساغر نظامی نے شاعری کے علاوہ ''ایشیا'' جیسے رسالے کی ادارت بھی کی۔ اپنا اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا۔ جوشؔ کے ساتھ فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے اور کہا جاتا ہے کہ جوشؔ ہی کے برابر تنخواہ پاتے رہے۔ پھر آزادی کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں جب مختلف زبانوں کے اکابرین ادب کو پروڈیوسر کا اعزاز دیا گیا تو اُردو میں قرعہ فال ساغر نظامی، روشِ صدیقی اور سہیل عظیم آبادی کے نام نکلا۔ ساغر نظامی ڈپٹی چیف پروڈیوسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور اس کے بعد تاحیات حکومت ہند کے ''اقامتی شاعر'' (Poet-in-residence) رہے۔ ان کی شعری تخلیقات پر مشتمل ایک درجن سے زیادہ مطبوعہ کتابیں ہیں جن میں ''بادۂ مشرق'' اور ''صبوحی'' بہت مشہور ہیں۔ کالی داس کے ڈرامے ''شکنتلا'' کے نہایت خوبصورت منظوم ترجمے کی بھی بڑی پذیرائی ہوئی۔ ''انارکلی''، ''نہرو نامہ'' اور ''مشعلِ آزادی'' جو ان کے آخری دَور کی طویل نظمیں ہیں، اپنی سلاست، روانی اور قدرت شعری کے لیے

خاص طور پر متوجہ کرتی ہیں۔

ساغؔر نظامی کے مجموعے اب دستیاب نہیں ہیں اور ہم ایک فراموش کار دور میں رہتے ہیں۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھلانے میں ہمیں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ ہر بونا آج کل اپنے آپ کو شاعرِ اعظم سمجھتا ہے، اس لیے ساغر نظامی یا ان کے مرتبے کے دوسرے شاعروں کی طرف توجہ کون کرے۔ اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ ساغر نظامی کا کلام از سرِ نو شائع کیا جائے۔ اِن کی بیگم ذکیہ سلطانہ نیر جو خود بھی ایک خوش گو شاعرہ ہیں اور جو نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ساغؔر صاحب کی شریکِ حیات اور رفیقِ سفر رہی ہیں، ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں کہ انھوں نے ساغؔر صاحب کا زیادہ سے زیادہ کلام محفوظ رکھا یا انھیں حاصل کیا۔ اور اب ''کلّیاتِ ساغر نظامی'' کی دو ضخیم جلدیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب کی ذمہ داری پروفیسر مظفر حنفی نے نہایت خوش اُسلوبی سے نبھائی ہے۔ حق یہ ہے کہ جس سلیقے، محنت اور دقتِ نظر سے مظفر حنفی نے یہ کام انجام دیا ہے وہ انھیں سے ممکن تھا، کیونکہ کتابوں کی ترتیب و تدوین کا انھیں خاص تجربہ ہے۔ ذکیہ سلطانہ ساغؔر کی اپنی کوششیں شامل نہ ہوتیں اور انھوں نے مظفر حنفی کو تعاون نہ دیا ہوتا تو یہ گراں قدر کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔

''کلّیاتِ ساغر نظامی'' کی پہلی جلد غزل، گیت اور رباعی پر مشتمل ہے اور دوسری جلد میں قومی، وطنی اور سیاسی نظمیں شامل ہیں۔ تیسری زیرِ اشاعت جلد رومانی نظموں پر مشتمل ہوگی۔ ساغؔر نظامی اور ان کے ساتھ کی بہت سی بلند مرتبت شخصیتوں کی نادر اور یادگار تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔ مظفر حنفی نے اپنے مقدمے میں ساغر نظامی کے شاعرانہ کارناموں کی تفصیل بیان کی ہے۔ مقدمہ اور تصویریں دونوں جلدوں میں مشترک ہیں۔

(''ایوانِ اُردو'' دہلی، جولائی ۱۹۹۸ء)

اعتراف

مظفر مہدی

ڈاکٹر مظفر مہدی کے تیرہ تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا پہلا مجموعہ ''اعتراف'' کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس سے پہلے وہ ڈاکٹر منصور عمر کے اشتراک سے دو کتابیں بہ عنوان ''اختر اورینوی: فن کار و ناقد'' اور ''بہار کے چند نامور شعرا'' مرتب کر کے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنا چکے ہیں۔ مجموعے

کا نام ''اعتراف'' رکھ کر انھوں نے اپنی تنقیدی کاوِشوں کو تخلیقی ادب سے ہم رشتہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شاعر یا ادیب جو کچھ تخلیق کرتا ہے، وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی نوع کا اعتراف ہی تو ہے۔

مظفر مہدی کا موقف ہے کہ ''زندگی کی طرح ادب بھی نصب العینی اور غایتی ہوتا ہے۔'' اس موقف کے صحیح یا غلط ہونے یا جزوی طور پر درست ہونے کے سلسلے میں بہت ساری بحثیں ہوتی رہی ہیں یا ہوتی رہتی ہیں۔ ان سے قطع نظر، چونکہ مظفر مہدی اس خیال کے موئد اور مبلغ ہیں، اس لیے ان کے بہت سے مضامین اسی موقف کے تحت معرضِ تحریر میں آئے ہیں۔ عنوانات سے ہی اس کا اندازہ ہو جائے گا — اُردو شاعری کا مجتہد حالؔی، اقبال سہیل کی شاعری کا سیاسی منظر نامہ، جمیل مظہری ایک تحریکی شاعر، تحریک مجاہدین اور اُردو شاعری، جدوجہد آزادی اور شعری اظہار، قومی زندگی میں صحافت کا کردار۔ اپنی جگہ یہ موضوعات اہم ہیں، اور کہنا چاہیے کہ مظفر مہدی نے ان موضوعات کے ساتھ انصاف کیا ہے اور بہت سی ایسی معلومات فراہم کی ہیں، جن سے ہمارا عام قاری باخبر نہیں ہے۔ ان سب کے سلسلے میں ان کے تنقیدی خیالات بھی لائق اعتنا ہیں۔

مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ اس مجموعے میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور/یا ابوالکلام آزاد جیسے پیش پا افتادہ ''موضوعات'' پر کوئی مضمون نہیں ہے۔ یونیورسٹی یا کالج سے وابستہ کسی اُستاد کے مجموعۂ مضامین میں اس طرح کی تحریروں کا نہ ہونا ایک اچھی علامت ہے۔

مظفر مہدی کے مضامین میں تنقید و تحقیق کا امتزاج ہے۔ دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا ادب کی صحت کے لیے مفید ہے۔ ''مقدمہ نگاری کا منصب''، ''عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی پر ایک نظر'' اور ''سرسیّد اور شاد عظیم آبادی'' اس مجموعے کے نہایت عمدہ بلکہ سب سے اچھے مضامین ہیں۔ ان موضوعات پر شاذ ہی لکھا گیا ہے۔ تحقیق سے مظفر مہدی کی دلچسپی کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر سیّد نہال اختر کے ایک ایسے مضمون سے بھی استفادہ کیا ہے، جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانے کو شاعری کے مقابلے میں (بلکہ ناول کے مقابلے میں بھی) ایک دوسرے درجے کی صنف حتیٰ کہ ''فروعی صنفِ ادب'' قرار دے کر اچھا خاصہ اختلافی مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ اس موقف سے عام طور پر اختلاف کیا گیا۔ وہاب اشرفی نے انھیں دِنوں ایک مضمون ''افسانے کا منصب'' تحریر کیا تھا جو میرے ہی ایماء پر انھوں نے ''شب خون'' میں شائع کرایا تھا۔ مظفر مہدی نے اپنے مضمون میں فاروقی کی تحریروں کے اقتباسات نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی رد میں وہاب اشرفی کے مضمون کے اقتباسات پیش کر دیئے ہیں۔ انھوں نے اپنے طور پر گویا کچھ نہیں

کہا ہے۔ یہ مضمون ان نوجوان طالب علموں کے لیے مناسب ہے، جنھوں نے فاروقی اور وہاب اشرفی کی تحریریں نہیں پڑھی ہیں۔

مظفر مہدی تنقید کے منصب سے واقف ہیں، اس لیے ان کے یہاں سطحیت کا گزر نہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین میں شروع سے آخر تک ایک صلابت اور رکھ رکھاؤ ہے۔ نظریاتی جھکاؤ کے باوجود ان کا تنقیدی روّیہ غیر جذباتی ہے۔ ان کے خیالات سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان پر کسی کی بے جا طرفداری کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، صاف صاف کہتے ہیں اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہتے ہیں۔ سنجیدگی، معقولیت اور اپنے موضوع سے قربت، یہ مظفر مہدی کے وہ اوصاف ہیں جو ان کے مجموعۂ مضامین ''اعتراف'' کو ہمارے لیے قابل مطالعہ بناتے ہیں۔

(''ایوانِ اُردو'' دہلی، مئی ۱۹۹۹ء)

ٹھوکریں

معین شاہد

''ٹھوکریں'' نوجوان افسانہ نگار معین شاہد کا پہلا ناول ہے۔ اس کے پلاٹ کی بنیاد محبت کی ناآسودگی پر رکھی گئی ہے۔ رسم ورواج کی قیود اور کہنہ عقائد کی زنجیریں کس طرح ہماری معصوم محبت کا گلا گھونٹ دیتی ہیں، یہی اس ناول کا موضوع ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ مختلف افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں نے اس موضوع پر بقدر صلاحیت اپنے زورِ قلم کا کمال دکھایا ہے۔ کرشن چندر کے ناول ''شکست'' اور عصمت کے ناول ''ضدی'' کا موضوع بھی یہی ہے۔ لیکن ہر بڑے فنکار کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔ معین شاہد ابھی نئے ہیں۔ ان سے کسی انفرادی طرزِ نگارش یا انفرادی فنی شعور کی توقع رکھنا تحصیل حاصل ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ حتی الامکان اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ انجم مانپوری کا یہ خیال درست ہے کہ معین شاہد کا مشاہدہ تیز ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے فضا اور ماحول کی تصویر کشی میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ طرزِ تحریر کی خامی اور پلاٹ کی فرسودگی کے باوجود ناول شروع سے آخر تک دلچسپ ہے۔ معین شاہد ہماری ہمّت افزائی کے مستحق ہیں۔ اگر انھوں نے ناول نویسی کے فن پر مزید توجہ دی اور زندگی کے اہم تر مسائل کو اپنے ناول کا موضوع بنایا تو ان کی صلاحیتیں ہمارے ادب کے لیے کارآمد ثابت ہوں گی۔

اُردو ادب میں اچھے ناولوں کی کمی کے پیشِ نظر ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی ایسا ناول شائع ہو جس سے مصنف کی ہونہاری کا اندازہ ہو تو ہم اس کی ہمت افزائی میں بخل سے کام نہ لیں۔

معین شاہد کے ہونہار ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دیکھنا ہے کہ آئندہ وہ ہماری توقعات کو پورا کرتے ہیں یا نہیں!

(ماہ نامہ "معاون" کلکتہ، نومبر ۱۹۵۵ء)

آزادی کے بعد اُردو نثر میں طنز و مزاح — نامی انصاری

ہمارے یہاں شاعری کے ناقد ہیں، فکشن کے ناقد ہیں، نظریاتی مسائل کے ناقد ہیں، لیکن طنز و مزاح کی صنف اب بھی کسی باقاعدہ ناقد کی تلاش میں ہے۔ اس لیے نامی انصاری کی تازہ کتاب "آزادی کے بعد اُردو نثر میں طنز و مزاح" دیکھ کر ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوا۔

ایسا نہیں کہ اُردو طنز و مزاح کے حوالے سے کچھ لکھا ہی نہ گیا ہو، لیکن جو کام ہوا ہے اسے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی کتاب "طنزیات و مضحکات" کی وقعت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر ڈاکٹریٹ کے لیے لکھے ہوئے مقالے ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر وزیر آغا کی تصنیف "اُردو ادب میں طنز و مزاح: آزادی کے بعد (۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۵ء تک)" بھی ہے۔ یہ ضخیم کتاب جو تیس سال کے اُردو طنز و مزاح کا تفصیلی جائزہ ہے، شاید زیادہ لوگوں تک نہیں پہنچی۔

نامی انصاری نے ایک بھاری پتھر اٹھایا ہے اور اسے صرف چوم کر نہیں چھوڑا۔ یہ کتاب آزادی کے بعد اُردو میں طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ ہے۔ پس منظر کے طور پر "اودھ پنچ" کے دور اور اس کے بعد ممکنہ عبوری دور کا بھی اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔ "طنز و مزاح کا نیا منظر نامہ" کے عنوان کے تحت انھوں نے آزادی کے بعد کے مزاح نگاروں پر اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے سب ہی مزاح نگاروں کا ذکر یا کم از کم ان کے نام آ گئے ہیں۔ نامی انصاری نے ابوالکلام آزاد اور ظ۔ انصاری کو بھی طنز نگاروں کی صف میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کوئی قابلِ لحاظ مثال پیش نہیں کی۔ انھوں نے قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں بھی طنز و مزاح کے عناصر تلاش کیے ہیں۔ شفیق الرحمٰن کا صرف نام ہی آیا ہے۔ ان کی مزاح نگاری تفصیلی جائزے کی متقاضی ہے۔ مزاحیہ افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں پر بھی الگ سے گفتگو ہونی چاہیے تھی۔ عبوری دور کے ایک نہایت اہم

مزاح نگار مانپوری کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

آزادی کے بعد کے پانچ اہم مزاح نگاروں رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، مجتبیٰ حسین اور احمد جمال پاشا کا محاکمہ نامی انصاری نے خاصی محنت سے کیا ہے اور تمام ضروری گوشوں پر نظر ڈالی ہے۔ میرے خیال میں کتاب کا سب سے اہم حصہ یہی ہے۔ اس کے بعد طنز و مزاح کی ادبی صورتوں یعنی کالم نگاری، خاکہ نگاری اور سفر نامہ نگاری پر الگ الگ باب ہیں۔ یہ حصہ بھی کافی معلومات افزا ہے۔

کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور محض مداحی نہیں ہے۔ اس میں بڑی دیانت داری اور بے تکلفی سے مزاح نگاروں کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے تسلیم شدہ منفرد اسلوب پر بھی انھوں نے سوالیہ نشان قائم کیا ہے، اور مثالوں سے واضح کیا ہے کہ ان کی اکثر تحریروں میں اسلوب کی شگفتگی مفقود ہے اور یہ کہ وہ اپنے ممدوح کے سلسلے میں اکثر مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں اور کبھی کبھی ان کا مزاح مزاح نہیں رہتا بلکہ سنجیدگی اور ثقالت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

آزادی کے بعد اُردو نثر میں طنز و مزاح کا یہ جائزہ بڑی حد تک سیر حاصل ہے، جس سے مصنف کی محنت، اس کے علم اور اس کی تنقیدی نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر ایک باب مزاحیہ اور طنزیہ شاعری پر بھی ہوتا تو یہ کتاب ہر طرح مکمل ہوتی۔ نامی انصاری کا یہ کہنا کہ ''نظموں کی حد تک کوئی بہت اعلیٰ معیار کا کارنامہ وجود میں آیا ہی نہیں، اس لیے میں نے اس سے صرف نظر کیا ہے'' محلِ نظر ہے، اور اس سے اختلاف کی پوری گنجائش موجود ہے۔ آزادی کے بعد کے طنز و مزاح نگار شاعروں میں کم از کم سیّد محمد جعفری، مجید لاہوری، رضا نقوی واہی، راجہ مہدی علی خاں، ضمیر جعفری اور دلاور فگار سے کسی طرح صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

(''ایوان اُردو'' دہلی، جولائی ۱۹۹۸ء)

عکس

نثار احمد صدیقی

انٹرویو کی اپنی افادیت ہے۔ اس کے ذریعہ ہم نہ صرف بعض مسائل اور موضوعات پر اس شخص کے خیالات جان سکتے ہیں، جس سے انٹرویو لیا جاتا ہے، بلکہ اس کی شخصیت کے ان نہاں خانوں تک بھی پہنچ سکتے ہیں، جہاں عام طور پر ہماری رسائی نہیں ہوتی۔ پہلے عموماً سیاسی شخصیتوں سے ہی انٹرویو

لیے جاتے تھے۔ پھر فلمی شخصیتوں کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ ان سے انٹرویو لینے کا رواج بڑھنے لگا۔ ادبی شخصیتوں سے انٹرویو لینے کی زحمت اس وقت تک نہیں کی جاتی تھی جب تک اسے کوئی بڑا انعام یا کوئی خاص اعزاز نہ بخشا گیا ہو۔ انٹرویو لینا عام طور پر صحافیوں کا کام رہا ہے۔ ادیب اور شاعر لائبریریوں، اکیڈمیوں اور تعلیمی اداروں میں خواہ جس اہمیت کے بھی حامل ہوں، لیکن وہ سماج کا ایک غیر ضروری حصہ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ ادیب اور شاعر کی ادبی اور شاعرانہ شخصیت ہی اہم ہے اور میرے نزدیک اسے سیاسی اور فلمی شخصیت کے بالمقابل لانے کی ضرورت بھی نہیں۔ لیکن یہ ادبی اور شاعرانہ شخصیتیں آج ماس میڈیا کے عروج کے زمانے میں اسی طرح سماجی زندگی میں دخیل ہو رہی ہیں جس طرح مثال کے طور پر سیاسی اور فلمی شخصیتیں۔

ادیبوں اور شاعروں سے انٹرویو کی ابتدا ہمارے یہاں شاید ریڈیو کے توسط سے ہوئی۔ پھر یہ سلسلہ اخباروں اور رسالوں تک پہنچا۔ آج کل ٹیلی ویژن پر بھی اس طرح کے انٹرویو لینے کا رواج ہے۔ نثار احمد صدیقی اُردو کے باقاعدہ انٹرویور Interviewer ہیں۔ انھوں نے تواتر کے ساتھ کچھ ناقدوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں سے انٹرویو لیے۔ انھیں رسالوں میں چھپوایا اور اب انھیں کتابی صورت میں ''عکس'' کے نام سے شائع کرایا ہے۔

نثار احمد صدیقی نے اکثر اپنے سوالات مختلف لکھنے والوں سے دُہرائے ہیں۔ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے ایک ہی سوال نامہ کئی لکھنے والوں کو بھیج دیا تھا۔ سوالات عمومی نوعیت کے ہیں جن سے لکھنے والوں کے خیالات اور نقطۂ نظر سے واقفیت ہوتی ہے لیکن ان کی اپنی ذات اور ان کے تخلیقی وجود پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ انٹرویو کے لیے ناقدوں کا انتخاب تو خیر غنیمت ہے لیکن افسانہ نگاروں اور شاعروں کا انتخاب افراط و تفریط کا شکار ہو گیا ہے۔

انٹرویوز میں سوال اور جواب کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے لیکن ''عکس'' میں کئی ایسے انٹرویوز شامل ہیں، جن میں سارے سوالات ایک جگہ دے دیئے گئے ہیں، اور ان کے بعد اُن کے جوابات نمبر دار ایک جگہ۔ اس عیب کو دور کرنا ضروری تھا۔ انٹرویوز چاہے تحریری ہوں، لیکن ان پر براہِ راست اور ''فی البدیہہ'' ہونے کا ڈھونگ ضرور ہونا چاہیے ورنہ انٹرویو کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

اپنے سوالوں کے دوران دوسروں کے حوالے دیتے ہوئے نثار احمد صدیقی سے ایک آدھ جگہ چوک ہوئی ہے اور ان کی یادداشت نے ان کے ساتھ وفا نہیں کی ہے۔ مثلاً میرے ایک بیان کا حوالہ دیتے ہوئے بلراج کومل سے ان کے خیالات دریافت کیے گئے ہیں۔ اس کا پہلا جملہ یوں ہے:

''مظہر امام نے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

''نئی نسل کے ہر ادیب یا شاعر کے یہاں شہری زندگی کی گھٹن، ہجوم میں فرد کی تنہائی، خودکشی کی تمنا وغیرہ لازمی طور پر موجود ہے۔''

حالانکہ میں نے اپنے مضمون ''آتی جاتی لہریں'' میں لکھا تھا:

''یہ ضروری نہیں ہے کہ نئی نسل کے ہر ادیب یا شاعر کے یہاں شہری زندگی کی گھٹن، ہجوم میں فرد کی تنہائی، خودکشی کی تمنا لازمی طور پر موجود ہو۔''

دونوں جملوں میں بیّن فرق ہے۔ بہ طور حوالہ دیئے ہوئے جملے سے بلراج کومل نے جائز طور پر جزوی اختلاف کیا ہے۔ لیکن ان کے سامنے میرا اصل جملہ ہوتا تو شاید اختلاف کی گنجائش نہ ہوتی۔

''عکس'' میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ خاص طور پر غیر ملکی مصنفوں کے نام یا انگریزی رسمِ خط میں لکھے ہوئے الفاظ، مثلاً ٹینی سن کو مے سنین، آندرے برتوں کو اندر برئیں، اڈلر کو اڈر، Vulnerability کو Valumenlibity، Idiom کو Idion (دو دو جگہ) لکھا گیا ہے۔ ایک جگہ نشتر خانقاہی، محشر خانقاہی ہو گئے ہیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ہر لکھنے والے نے اپنے خیالات کا اظہار مصلحت اور تکلف کے بغیر کیا ہے۔ پھر بھی ان انٹرویوز کے دوران بعض دلچسپ بیانات سامنے آتے ہیں۔ مثلاً:

''شاعر کو بحر العلوم ہونا چاہیے۔ ورنہ اس کی شاعری روحِ عصر کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے گی۔'' (جوش ملیح آبادی)

''نثر شاعری کے مقابلے میں زیادہ مشکل اور زیادہ ہمت شکن مشغلہ ہے۔'' (شمس الرحمٰن فاروقی)

''ترقی پسند ادب کے سامنے بہر حال ایک اعلیٰ مقصد تھا۔ اگرچہ وہ لوگ چیزوں اور مسائل کو ایک رُخے ڈھنگ سے دیکھتے تھے اور انھیں براہِ راست بیان کرتے تھے، لیکن ان کے خلوص اور بے باکی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔'' (شمس الرحمٰن فاروقی)

''بے ربطی اور ناہمواری کے باوجود دنیا میں شاہکار افسانوں اور ناولوں کا وجود ہے۔ ان کے خالق بے حد صحت مند لوگ رہے ہیں۔'' (وہاب اشرفی)

انٹرویوز سب کے سب دلچسپ ہیں، اور انھیں بے تکلفی سے ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکتا ہے۔ ایک دو انٹرویوز بہت سرسری اور سطحی ہیں، اگر انھیں مجموعے میں شامل نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ امید ہے نثار احمد صدیقی اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔

(''آج کل'' دہلی، نومبر ۱۹۸۰ء)

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مفکّر ایک رہنما

ڈاکٹر عبدالمنعم النمّر (مصنف) نجم الدین شکیب (مترجم)

مولانا ابوالکلام آزاد (محی الدین احمد) مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ مدنی عرب تھیں۔ اس لیے مولانا آزاد کی مادری زبان عربی تھی۔ ان کے والد ہندوستانی تھے، لیکن عملاً عرب ہو چکے تھے۔ انھوں نے مکہ میں تیس سال قیام کیا تھا۔ اور اس عرصے میں ان کی زبان عربی لغت کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ مولانا آزاد کی ابتدائی نشو ونما والد کے زیرِ عاطفت ہوئی۔ آزاد کو عربی زبان پر عبور حاصل ہوا۔ ان کی تحریروں میں عربی کے فقرے اور عبارتیں عام ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں جب مشہور عرب عالم دین اور رہنما علامہ سیّد رشید رضا، مولانا شبلی نعمانی کی دعوت پر ندوہ کے اجلاس کی صدارت کے لیے تشریف لائے تھے تو مولانا آزاد نے اُن کی عربی تقریر کا اُردو میں برجستہ ترجمہ کر کے اپنی عربی دانی کا لوہا منوالیا تھا۔ وہ سیّد رشید رضا کی تحریک "موتمر اسلامی" کے ہمنوا تھے اور اس مسئلے کے علاوہ مسئلہ خلافت پر بھی اُن سے طویل خط و کتابت رہی تھی۔ پھر مولانا آزاد نے "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعے صحافت کو ایک نیا رُخ دیا اور عالم اسلام کے مسائل پر اس میں زوردار مضامین شائع ہوئے۔ سیاست سے براہِ راست تعلق نے انھیں ملک کے ممتاز ترین رہنماؤں میں جگہ دی اور اُن کی ذہانت، معاملہ فہمی، سیاسی بصیرت، غیر معمولی حافظہ اور قاموسی علم کے چرچے ملک میں اور ملک سے باہر ہونے لگے۔ لیکن حیرت ہے کہ خود عرب ممالک میں ان کی ویسی شہرت نہ ہوئی جس کی توقع تھی اور جس کے وہ مستحق تھے۔ جدوجہد آزادی کے زمانے میں عرب ممالک میں ہندوستان کے رہنماؤں میں گاندھی اور نہرو کی شخصیتیں ہی موجب توجہ تھیں۔ آزادی سے قبل لے دے کر مولانا آزاد کی علمی شخصیت کے تعارف کے طور پر مولانا مسعود عالم ندوی کا ایک مضمون ملتا ہے، جو مصر کے دینی ہفتہ وار "الفتح" میں شائع ہوا تھا۔ آزادی کے بعد وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کا ذکر سرسری طور پر کبھی کبھی ہندوستانی سفارت خانہ مصر کے عربی بلیٹن میں آتا رہا۔ انھیں دنوں مولانا آزاد پر عربی میں ایک مقالہ "الحج" میں چھپا تھا، مگر اس میں پیش کردہ اطلاعات نا معتبر تھیں۔

ڈاکٹر عبدالمنعم النمر پہلے عرب ہیں، جنھوں نے مولانا آزاد پر عربی زبان میں ایک مفصل کتاب لکھی اور اسے دو جلدوں میں شائع کرایا۔ دراصل یہ اُن کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر ۱۹۷۲ء میں جامعہ ازہر نے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ اس سے پہلے ایک ہندوستانی طالب علم نے عربی میں ''مولانا آزاد اور اُن کی آراء'' کے عنوان سے ایم۔ اے کے لیے ایک رسالہ (Dissertation) لکھا تھا۔

عبدالمنعم النمر جنوری ۱۹۵۶ء میں ہندوستان آئے۔ اپنے سوا دو سالہ قیام کے دوران انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں اہم ماخذوں کا مطالعہ کیا اور اُن کے ذہن پر اس سلسلے میں جو دُھند چھائی ہوئی تھی، اُسے دُور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مولانا آزاد پر کام کرتے ہوئے خود اُردو سیکھی اور قاہرہ میں مقیم ہندوستانی طلباء سے مولانا آزاد کی تحریروں کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ عرب ممالک ایک عرصے تک ہندوستان کے سلسلے میں بڑی غلط فہمیوں اور عدم واقفیت کا شکار رہے۔ عبدالمنعم النمر نے ''پیش لفظ'' میں اس کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے:

> ''ہندوستان کے کے اُس دور کی تاریخ کے بارے میں ہمارے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کا خیال تھا کہ قیام پاکستان کے بعد جزیرہ نمائے ہند کے اس حصہ (بھارت) میں کوئی مسلمان باقی نہیں رہا اور ان کی پوری تعداد ترکِ وطن کر کے پاکستان چلی گئی۔''

انھوں نے یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ جب ۱۹۵۰ء میں مولانا ابوالحسن ندوی جمعیۃ الشبان کے جلسے میں شرکت کے لیے عرب آئے تو اُن کے اعزاز میں منعقدہ جلسے میں اُن کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھیں پاکستانی علماء میں شمار کیا گیا جس کی تردید مولانا ندوی کو کرنی پڑی۔

جہاں یہ فضا ہو، وہاں کے ایک طالب علم کا ہندوستان آنا، یہاں کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنا اور پھر مولانا آزاد جیسی عبقری شخصیت کو اپنی تحقیق کا موضوع بنانا، بذات خود ایک کارنامہ ہے۔ مولانا آزاد زندگی بھر قوم پرستانہ سیاست سے وابستہ رہے، ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار اور تقسیم ملک کے شدید مخالف رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے دو چار اہم ترین رہنماؤں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔

عبدالمنعم النمر کی کتاب، جس کا اُردو ترجمہ ''مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مفکر، ایک رہنما'' کے نام شائع ہوا ہے، دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ تین سو صفحات کی پہلی جلد میں انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے ماضی یعنی اُن کی حکومت، عروج و زوال اور پھر انگریزوں کے تسلط کی تاریخ بھی اجمالاً بیس صفحات میں پیش کی ہے، تاکہ اُن کے بقول ''وہ فضا پیش نظر ہو جس میں آزاد کی نشو و نما ہوئی اور وہ سماجی سانچے بھی

سامنے ہوں جو آزاد کے ذہن و دماغ کی تشکیل پر اثر انداز ہو رہے تھے۔" اس کے بعد وہ ابواب ہیں جن میں مولانا آزاد کی ذہنی نشو و نما کے مختلف ادوار کا بیان ہے۔ یہ قریباً سو صفحات پر محیط ہے۔ اس کے بعد مولانا کے علمی کارناموں میں "ترجمان القرآن" کا خصوصی مطالعہ ہے۔ ذوالقرنین کے بارے میں مولانا کی علمی تحقیق پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ تفسیر قرآن کے سلسلے میں مولانا آزاد پر بعض علماء کی جانب سے جو اعتراضات ہوئے تھے، ان کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ حصہ پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر عبدالمنعم النمر نے اپنی کتاب کی دوسری جلد میں مولانا آزاد کی سیاسی زندگی، ان کی جدوجہد، ان کی بصیرت اور ہندوستان کو آزادی کی منزل تک لے جانے میں ان کی خدمات کا مفصل محاکمہ کیا ہے۔ اور ایک قومی رہنما اور سیاسی قائد کی حیثیت سے مولانا آزاد کے کارناموں کی تفصیل بیان کی ہے۔ پہلا حصہ مولانا آزاد کو ایک دینی عالم، مصلح اور مفسرِ قرآن کی حیثیت میں پیش کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں اُنھیں ایک عظیم سیاسی رہنما اور آزادیٔ ملک و قوم کے ایک بے باک مجاہد کے رُوپ میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمنعم النمر کا خیال ہے کہ "مولانا آزاد نے مذہب اور سیاست کے میدانوں میں سیّد جمال الدین افغانیؒ اور محمد عبدہؒ سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تحریک سول نافرمانی، مولانا آزاد کی گرفتاری اور مقدمہ، رہائی اور کانگریس کی صدارت، مولانا آزاد کیوں کانگریس میں رہے؟ جدوجہد کے خطرناک مراحل میں آزاد کی قیادت، گاندھی جی اور آزاد کے درمیان اختلاف، وائسرائے کی ملاقات سے انکار، آزاد انگریزوں سے گفت و شنید کرتے ہیں، گفت و شنید کا نتیجہ، گاندھی جی مولانا سے استعفاء طلب کرتے ہیں، گاندھی جی مولانا کے سامنے اپنے اقدام پر افسوس ظاہر کرتے ہیں، دوبارہ گفت و شنید کی سربراہی، تقسیم کے بارے میں مولانا کا موقف۔ یہ چند عنوانات ہیں، جن کے تحت ہندوستانی سیاست کی کروٹوں اور مولانا آزاد کی سیاسی فہم و دانش کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک طویل باب بہ عنوان "آزاد اور خلافت" ہے۔ خلافت کے مسئلہ پر "الہلال" میں جو کچھ لکھا گیا ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور انھیں دنوں یعنی ۱۳-۱۹۱۲ء میں عرب عالم اور رہنما سیّد رشید رضا کے نام لکھے ہوئے ان کے خطوط کی نقلیں دی گئی ہیں جو مسئلہ خلافت کے تعلق سے بعض وضاحتیں طلب کرتی ہیں۔ ان خطوط میں مکتوب نگار کی حیثیت سے مولانا آزاد نے اپنا نام "ابوالکلام الدہلوی" لکھا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے کہ مولانا آزاد کے دادا انگریزوں کے تسلط یعنی ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی میں رہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالمنعم النمر قیاس کرتے ہیں کہ ممکن ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مدرسہ فکر کی نسبت سے مولانا آزاد نے خود کو دہلوی لکھا ہو، کیونکہ

"ہندوستان میں علماء اور مصلحین اکثر یہ نسبت اختیار کرتے تھے۔"

بہر حال، مولانا آزاد کی یہ داستان اُن کی وفات اور ان کے تعزیتی جلسے پر ختم ہوتی ہے۔

دوسری جلد کے آخری سو صفحات میں مولانا آزاد کی وہ تحریریں ہیں جن میں چند بے حد اہم مباحث پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً اولوالامر، شرح حدیث حارث اشعری، جماعت و التزام جماعت، شرائط امامت و خلافت، نصوص سنت و اجماع اُمت وغیرہ۔ لیکن کہیں مصنف کا نام نہیں دیا گیا ہے۔

عبدالمنعم النمر کے تجزیے ایک عرب کے نقطۂ نظر سے ہیں۔ ایک ہندوستانی قاری کو کہیں کہیں ایک خاص نوع کی جانب داری کھٹک بھی سکتی ہے، لیکن ایسے مقامات بہت کم ہیں۔ کہیں کہیں تحقیقی صلابت بھی مشکوک ہے۔ مصنف نے اکثر حوالوں سے احتراز کیا ہے۔ جہاں حوالے دیئے ہیں، ان کے ماخذ کی تفصیل نہیں دی۔ اُردو ترجمے میں کتابت کی غلطیاں بھی کافی ہیں۔

ان چند فروگذاشتوں سے قطع نظر، یہ کتاب اپنی جگہ وقیع ہے اور مولانا آزاد میموریل کمیٹی لکھنؤ نے اس کا ترجمہ کرا کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس کا ترجمہ نجم الدین شکیب نے اس خوبی اور عمدگی سے کیا ہے کہ بے اختیار منہ سے کلمات داد و تحسین نکلتے ہیں۔ ترجمے کی خوبی یہی ہے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہو۔ نجم الدین شکیب کے ترجمے میں یہ وصف موجود ہے۔

اُردو کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالحسن ندوی نے لکھا ہے، جو مختصر لیکن جامع، معلوماتی اور عالمانہ ہے۔

("آج کل" دہلی، نومبر ۱۹۹۱ء)

📖

دستک — نریش کمار شاد

"دستک" نریش کمار شاد کی نظموں، غزلوں اور قطعات کا تازہ مجموعہ ہے۔ ابتدائیہ جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ شاد کی شاعری کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اس کے منفرد اندازِ بیان، سماجی شعور اور خلاّقانہ وارفتگی نے اسے شاعروں کی سب سے نئی پود میں اہم مقام عطا کیا ہے اور جدید ترین شعرا میں غالباً وہ واحد شاعر ہے جو "سُرخ کرنوں کا پیامی" ہونے کے باوجود ترقی پسند اور غیر ترقی پسند حلقوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ "دستک" کا مطالعہ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ مستقبل اپنی بہت سی کامرانیوں کے ساتھ نریش کمار شاد کے لیے چشم براہ ہے!

("نئی کرن" دربھنگا، شمارہ ۳، اشاعت: فروری ۱۹۵۱ء)

آہٹیں

نریش کمار شاد

"آہٹیں" نریش کمار شاؔد کے کلام کا تازہ مجموعہ ہے۔ شاؔد اُردو کے جدید تر شعرا میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر چکے ہیں اور ایک منفرد رنگ کے مالک ہیں۔ نرمی، گھلاوٹ اور رچاؤ کے ساتھ ساتھ صحت مند شعور ان کی شاعری کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ان کی شاعری ابہام یا خیالات کے الجھاؤ سے پاک ہے۔ جوش ملیح آبادی کا خیال درست ہے کہ "نریش کمار شاؔد عام نوجوان شاعروں سے قطعی مختلف ہیں۔ وہ سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ فن کے دائرے میں رہ کر شعر کہتے ہیں۔"

"آہٹیں" میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے، لیکن اس میں نظمیں قطعات اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ ان قطعات کا لطف اُٹھایئے:

کیف پر بھی ہے کیف کا عالم
آج مستی بھی محوِ مستی ہے
بات کرتے ہیں پھول جھڑتے ہیں
آنکھ اُٹھاتے ہیں مے برستی ہے

جھوم کر لے رہی ہے انگڑائی
اِک پری چہرہ بال بکھرائے
جیسے لبریز آبگینے سے
بادۂ لالہ گوں چھلک جائے

ایک غزل کے چند اشعار ہیں:

شام وعدہ کا ڈھل گیا سایا
آنے والا ابھی نہیں آیا
زندگی کے غموں کو اپنا کر
ہم نے دراصل تجھ کو اپنایا

آج کے دَور میں جب ہم اچھے اشعار پڑھنے یا سننے کو ترستے ہیں، ''آہٹیں'' کا مطالعہ بہت حد تک اس تشنگی کو دُور کر دے گا۔

(ماہنامہ ''معاون'' کلکتہ، جون ۱۹۵۴ء)

📖

نیپال میں اُردو

نسیم اختر

آج کل کتابیں چھپتی پہلے ہیں، لکھی بعد میں جاتی ہیں۔ ڈاکٹر نسیم اختر کی کتاب ''نیپال میں اُردو'' ان سے مختلف ہے۔ یہ لکھی پہلے گئی ہے، چھپی بعد میں ہے۔ اس کتاب کے لیے مواد جمع کرنے اور انھیں تحریری شکل دینے کا کام انھوں نے کافی پہلے شروع کر دیا تھا۔ ''کاتا اور لے دوڑی'' والی مثال ان پر صادق نہیں آتی۔

''اُردو کی نئی بستیوں'' کے ادب کا بڑا چرچا ہے۔ ڈالر اور پونڈ کا بہاؤ تیز ہو تو ان بستیوں کے ادب کی تعریف میں رسالوں کے ''نمبر'' / ''گوشے'' تو آئیں گے ہی۔ ان کی مدح وستائش میں کتابوں کے انبار لگیں گے ہی۔ میں تو ''نیپال میں اُردو'' کا ذِکر سن کر ہی چونکا۔ نیپال اور اُردو — کتنا تضاد معلوم ہوتا ہے! لیکن نسیم اختر نے ایک بے حد معلوماتی کتاب پیش کر دی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نیپال میں اُردو نے کس حد تک قدم جما رکھے ہیں۔ عموماً اُردو زبان کی بڑی ''مملکتوں'' کے حکمرانوں کو اپنی ناک سے آگے دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اُردو نے اپنے پاؤں کہاں کہاں پھیلائے ہیں، اس سے ان کی دلچسپی صرف اپنی حکمرانی اور تسلط کو وسیع کرنے کی حد تک ہے۔ اپنی زبان کو پھیلانا، بڑھانا اور اسے مستحکم کرنا، ان باتوں سے ان کی دلچسپی نہیں ہے۔ ڈاکٹر نسیم اختر کی کتاب اس لحاظ سے اور بھی اہم اور وقیع بن جاتی ہے کہ انھوں نے پہلی بار یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ نیپال میں اُردو زبان کی جڑیں کتنی پیوست ہیں۔ اس کتاب کا ایک باب نیپال کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو اُجاگر کرتا ہے۔ اس کتاب میں نیپال میں تصوّف کے اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ مجھے جن ابواب سے دلچسپی پیدا ہوئی، ان کے عنوانات ہیں: نیپالی زبان کی ساخت اور اُردو، نیپال میں اُردو کے اثرات، نیپال اور اُردو کا لسانی اشتراک، نیپال میں عربی، فارسی اور اُردو کے مخطوطات، نیپال میں اُردو صحافت، نیپالی لوک گیتوں میں اُردو عناصر، نیپال میں اُردو کا آئینی مطالبہ اور نیپال میں اُردو کی

سرگرمیاں۔ کیا آپ نے کبھی نیپال کے حوالے سے ان باتوں پر غور کیا ہے؟ کیا آپ کے علم میں ہے کہ نیپال میں اُردو کے قدم کیسے اور کہاں کہاں پہنچے ہیں؟ آپ کے علم میں ہو تو ہو، مجھے تو پہلی بار اس کتاب کے مطالعے سے ان باتوں کی آگہی ہوئی۔

نسیم اختر کی کتاب "نیپال میں اُردو" کی قرار واقعی پذیرائی ہونی چاہیے، کیوں کہ یہ اس کا حق ہے۔

(روزنامہ "پندار" پٹنہ، ۲۶ر فروری ۲۰۰۶ء)

شہرت کی خاطر

نظیر صدیقی

"انشائیہ نگار کے لیے موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ بالکل آزاد اور خود مختار ہوتا ہے۔ اُسے کوئی روک ٹوک نہیں، وہ ہر جگہ جا سکتا ہے اور سب کچھ کہہ سکتا ہے۔ شرط کیف و اثر ہے۔ کیونکہ بات کا بتنگڑ بنانا اس کا کام نہیں۔ اسے دل سے سروکار رکھنا پڑتا ہے، دماغ یا 'دماغ والوں' سے نہیں......" (ڈاکٹر سید محمد حسنین)

"انشائیہ کی ایک اور خصوصیت اس کی عدم تکمیل ہے۔ ایک مقالہ لکھتے وقت جہاں یہ ضروری ہے کہ موضوعِ زیرِ بحث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے، وہاں انشائیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم ہوتی ہے لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی شامل کر دی جاتی ہیں جن کا بظاہر موضوع سے تعلق نہیں ہوتا......" (ڈاکٹر وزیر آغا)

"انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک کی اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جاتے ہیں اور بامعنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اُجاگر کی جاتی ہے......" (نظیر صدیقی)

انشائیہ کی کوئی جامع تعریف مختصر الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔ یہ اصطلاح کچھ اتنی نئی نہیں ہے، لیکن اسے ہنوز قبولِ عام کی سند نہیں ملی، ہر چند کہ اِس صنف کی مقبولیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

عام طور پر انگریزی میں جس صنف ادب کے لیے Light Essay کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، اسی کو اُردو میں انشائیہ کے نام سے موسوم کیا جانے لگا ہے۔ اور 'ایسے' یا 'لائٹ ایسے' کی اصطلاح انگریزی جاننے والوں کے لیے شاید کچھ زیادہ مبہم نہیں۔

''شہرت کی خاطر'' نظیر صدیقی کے ۱۸ ''دلچسپ اور خیال انگیز'' انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ نظیر صدیقی ایک بالغ نظر نقاد ہی نہیں، ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ انشائیہ نگاری کی طرف بھی انھوں نے خصوصی توجہ دی ہے اور اس صنف کی فنی حیثیت کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ اس کا ثبوت ان کا وہ مضمون یا ''انشائیہ'' ہے جو کتاب کے آغاز میں ''کچھ اپنے فن کی تعریف میں'' کے عنوان سے درج ہے۔ یہ مضمون ''صنف انشائیہ'' کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ البتہ حیرت ہوتی ہے کہ انگریزی کے Essayists یا انشائیہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے جہاں اُنھوں ہیزلٹ اور لوکس کو نظر انداز کر دیا ہے، وہاں اُردو کے اہم انشائیہ نگاروں کی فہرست میں مانپوری اور فلک پیما کے نام بھی نہیں لیے ہیں۔

اس مجموعے کے بہترین انشائیے ''شہرت کی خاطر''، ''شادی''، ''آزادی اور شرافت''، ''امتحان گاہ''، ''پدرم فقیر بود''، ''دوست اور دوستی''، ''جہاں میں رہتا ہوں'' اور ''نظیر صدیقی مرحوم'' ہیں۔ ''جہاں میں رہتا ہوں'' کا عنوان مہندر ناتھ کے مشہور افسانے سے اخذ ہے اور ''نظیر صدیقی مرحوم'' کنہیا لال کپور کے انشائیہ ''مرحوم کی یادیں'' سے۔ لیکن اس کے علاوہ ان میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ نظیر صدیقی کا رنگ اور ان کی باتیں اپنی ہیں۔ ''غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد'' ان کے ابتدائی دَور کا ایک سفرنامہ ہے جسے دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے، لیکن اگر اس مجموعے میں شامل نہ ہوتا تو بہتر تھا، کیونکہ یہ سفرنامہ بہ اعتبارِ اسلوب و خیال دوسرے انشائیوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ''شہرت کی خاطر'' ایک ایسا مجموعہ ہے جو مصنف کے خوش آئند مستقبل کی بشارت دیتا ہے۔

نظیر صدیقی اپنا مفہوم اختصار میں وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی ذہانت مجموعے کے تمام انشائیوں سے نمایاں ہے۔ ان کے یہاں اگر کوئی نمایاں کمزوری ہے تو وہ یہ کہ ان کے طنز میں اکثر شدید تلخی پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی مردم بیزاری ایسے نقطے پر پہنچ گئی ہے جہاں سے ''انسانیت بیزاری'' کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ ایک اچھے ادیب کے لیے یہ ذہنی رویہ مناسب نہیں۔ ایک انشائیہ نگار کو یوں بھی ''جذباتی تلخ کلامی'' سے اجتناب کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دُنیا سے نظیر صدیقی کا جھگڑا بہ قول رابرٹ فراسٹ ''دو پریمیوں کا جھگڑا'' ہے۔ خدا کرے نوبت قطع تعلق تک نہ پہنچے۔

(''رفتارِ نو'' دربھنگا، سالگرہ نمبر، جنوری ۱۹۶۲ء)

تاثرات و تعصّبات

نظیر صدّیقی

نظیر صدیقی بحیثیت انشائیہ نگار کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ تو میں نہیں کہوں گا کہ انھوں نے شہرت کی خاطر انشائیے لکھنا شروع کیے جس طرح غالب نے مہ رُخوں کی خاطر مصوری سیکھی تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے انشائیوں کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" اچھی خاصی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

اور اب اُن کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "تاثرات و تعصبات" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نظیر صدیقی کے تنقیدی مضامین دلچسپ ہوتے ہیں۔ ان کی نثر میں شگفتگی اور روانی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں، سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور اس طرح کہتے ہیں کہ دوسرے زیادہ سوچے بغیر بھی سمجھ جائیں۔ وہ حتیٰ الامکان اپنے خیالات کا اظہار کسی رو رعایت کے بغیر کرتے ہیں، لیکن ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ آل احمد سرور کی طرح توازن قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر کچھ زیادہ تعریف ہوگئی تو کچھ خامیوں کی نشان دِہی کریں گے اور اگر عیوب کی طرف کچھ اشارے زیادہ ہو گئے تو پھر خصوصیات گنوانے لگیں گے۔ وہ حضرات جو غیر جانب داری کے مدعی ہیں، عموماً اس نوع کی کمزوریوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ تنقید کو صرف قصیدہ یا ہجو نہیں ہونا چاہیے۔ تنقید نگار کا کام یہ ہے کہ وہ غیر جانب دار ہو اور وہ حسن و قبح دونوں پر نگاہ رکھے۔ لیکن اس اصول کا سہارا لے کر کچھ تنقید لکھنے والے ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے نظیر صدیقی کے یہاں بھی یہ عیب نظر آیا۔ وہ رشید احمد صدیقی کی طرزِ نگارش سے متاثر ہی نہیں، مرعوب بھی ہیں اور ان کی تقلید یا تتبع کو اپنے اندازِ تحریر کی معراج سمجھتے ہیں۔

نظیر صدیقی تفصیل و اطناب سے کام لیتے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کے لیے ایک ہی خیال کو مختلف الفاظ میں بیان کرنے سے نہیں تھکتے۔ ایک طالب علم کے لیے شاید یہ اسلوب مفیدِ مطلب معلوم ہو، لیکن ذہین قاری کو ایک ہی خیال کا اِعادہ گراں گزر سکتا ہے۔

ڈیمائی سائز کے ۳۹۰ صفحات کی کتاب "تاثرات و تعصبات" میں دس مضامین شامل ہیں۔ اس طرح ہر مضمون کا اوسط ۳۹ صفحات ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس شرح و تفصیل سے کسی شاعر، ادیب یا موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ہر

مضمون کتنے صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے:

(۱)	یگانہ چنگیزی	۵۱	(۲)	فراق	۴۵
(۳)	فیض	۴۵	(۴)	جمیل الدین عالی	۱۷
(۵)	اجتبیٰ رضوی	۳۳	(۶)	جگر	۲۶
(۷)	کہتی ہے ان کو خلقِ خدا	۳۰	(۸)	رشید احمد صدیقی	۵۶
(۹)	گنجے فرشتے	۱۲	(۱۰)	کچھ اپنی صفائی میں	۷۵
				کُل	۳۹۰

بہ اعتبار طوالت ان کے مضامین کی ترتیب یوں ہوگی: (۱) کچھ اپنی صفائی میں (۲) رشید احمد صدیقی (۳) یگانہ چنگیزی (۴) فراق/فیض۔ شرح وسط کی اس کمی بیشی سے میرے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ نظیر صدیقی بطور خاص اس وقت زیادہ ''بولتے'' ہیں جب خود ان کا معاملہ درپیش ہو یا ان کے محبوب ترین لکھنے والوں کا۔ نظیر صدیقی نے اس کتاب کے پیش لفظ بہ عنوان ''اعترافات'' میں اعتراف کیا ہے کہ وہ Individualist اور Introvert ہیں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ وہ کیا ہیں اور کیا رہنا چاہتے ہیں، لیکن اگر وہ ادب کا ذکر کرتے ہوئے ''میں، میں'' کی تکرار کرنے لگیں تو یقیناً ہم اسے ان کا ذاتی مسئلہ سمجھ کر نظرانداز نہ کرسکیں گے۔

(گوہاٹی، ۱۹۶۳ء)

شاد کا عہد اور فن (حصہ دوم)

نقی احمد ارشاد

داغؔ اور امیرؔ کا کلام زبان و بیان کی بعض نفاستوں کے باوصف غزل کے ابتذال و انحطاط کا نمونہ ہے۔ غزل اپنے موضوعات ولفظیات کے اعتبار سے کچھ ایسی سطح پر آ گئی تھی کہ اس کا اس قعر پستی سے نکلنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ حالیؔ نے اسی غزل کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ لیکن داغؔ اور امیرؔ کی غیر معمولی مقبولیت کے دَور ہی میں اُردو غزل میں ایک ایسی آواز اُبھری جس نے اپنی متانت، علوئے تخیل اور لطافتِ اظہار کے باعث اپنی انفرادیت کا سکہ بٹھایا۔ یہ آواز شادؔ عظیم آبادی کی تھی۔ عام طور پر حسرت موہانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اُردو غزل کا احیاء کیا اور اسی لیے وہ

رئیس المتغزلین کہے جاتے ہیں۔ لیکن حسرتؔ سے پہلے اور حسرتؔ سے بہتر طور پر اُردو غزل کو جس نے توانائی عطا کی، وہ شادؔ عظیم آبادی تھے۔ حسرتؔ کے یہاں کہیں کہیں وہ عامیانہ پن بھی ملتا ہے جو مثال کے طور پر داغؔ اور امیرؔ کے یہاں ہے، کیونکہ ان کے نزدیک سوقیانہ شاعری کی بھی ایک جگہ ہے۔ لیکن شادؔ کے یہاں سطحیت، ابتذال اور پھکڑ پن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دراصل اُردو غزل کا احیاء شادؔ عظیم آبادی سے ہوتا ہے۔ اور وہ صحیح معنوں میں نئی غزل کے بانی ہیں۔

حسرتؔ نے بہت سی غزلیں شادؔ کی زمینوں میں کہی ہیں۔ یہی حال اقبالؔ کا بھی ہے۔ اقبالؔ نے اپنے ابتدائی دَور میں داغؔ کی شاگردی اختیار کی اور ان کے رنگ میں کچھ غزلیں کہیں، لیکن شاید اپنے اُستاد کا رنگِ کلام اُنھیں مرغوبِ خاطر نہیں ہوا اور وہ دوسرے شعرا کی طرف متوجہ ہوئے۔ نقی احمد ارشاد نے اپنی تازہ کتاب ''شادؔ کا عہد اور فن'' (حصہ دوم) میں ''بانگِ درا'' کی دو اور ''بالِ جبریل'' کی پانچ ایسی غزلوں کی نشاندہی کی ہے جو شادؔ کی نکالی ہوئی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ شادؔ کا فارسی کلام بھی اقبالؔ کی شعر گوئی کے آغاز سے پہلے تواتر کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا اور اقبالؔ کی نظر سے گزر چکا تھا۔ شادؔ نے اپنے ایک خط میں دعویٰ کیا ہے کہ اقبالؔ نے کیمبرج میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اوّل الذکر سے فارسی میں کچھ لکچر لکھوا کر منگوائے تھے۔ قاضی عبدالودود نے شادؔ کے اس بیان کو چیلنج کیا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ قاضی عبدالودود نے ۱۹۲۲ء میں ''دیوانِ شادؔ'' کی اشاعت کا بندوبست کیا تھا۔ اسی زمانے میں شادؔ سے ان کے اختلافات ہوئے۔ شادؔ تو اپنا غم وغصہ ۱۹۲۷ء میں اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن قاضی عبدالودود اوائل ۱۹۸۴ء سے پہلے اس بندِ غم سے نجات نہ پا سکے۔

نقی احمد ارشاد نے اپنی کتاب کے قابلِ لحاظ صفحات قاضی عبدالودود کے ان اعتراضات کو رد کرنے میں صرف کیے ہیں جو مؤخر الذکر نے شادؔ پر عائد کیے تھے۔

قاضی عبدالودود کی بابت شادؔ نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا:

''میری مختصر غزلیں غلط سلط چھپوا کر ایک شخص کمال متمتع ہوا۔ شاید اس نے تین سو خرچ کیے تھے، گیارہ سو نفع کر چکا۔''

اس کا بدلہ لینے کے لیے قاضی عبدالودود نے شادؔ عظیم آبادی کو دروغ گو ثابت کرنے کی غرض سے محمد مسلم کی کتاب ''شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی'' اور ''مکتوباتِ شادؔ'' کے حوالے سے رسالہ ''تحریر'' دہلی میں ایک طویل مضمون لکھا، جس میں شادؔ کی غلط بیانیوں کی بہت سی مثالیں دیں۔ یہی مضمون قاضی عبدالودود نے اپنے مجموعہ مقالات ''اشتر و سوزن'' میں بھی شامل کیا۔ اس مضمون کی اچھی خاصی شہرت ہوئی۔ نقی احمد ارشاد نے قاضی صاحب کے اعتراضات کے جوابات دلیلوں کے ساتھ دیے ہیں۔

انھوں نے اس زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور اُن کی روشنی میں شاؔد کے بیانات کی تصدیق کی ہے۔ نقی احمد ارشاد یوں تو شاؔد کے پوتے ہیں، لیکن انھوں نے اپنے محاکے میں ارشتے کے تقدس کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ اُنھوں نے شاؔد کی بعض مبالغہ آرائیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ ''شاد کا عہد اور فن'' (حصہ دوم) مصنف کے عمیق مطالعے اور تحقیقی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ افسوس ہے کہ کتاب کے آخر میں ''کتابیات'' کی کوئی فہرست نہیں ہے، جس سے اندازہ ہوتا کہ نقی احمد ارشاد نے مواد کی فراہمی میں کن کن کوچوں کی سیر کی ہے۔

نقی احمد ارشاؔد نے اقباؔل کے اس فارسی قصیدے کی بھی نشاندہی کی ہے جو شاؔد کی فارسی نظم کے تتبع میں کہا گیا تھا۔ اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شاؔد عظیم آبادی نے اپنا پہلا مسدس ۲۹ سال کی عمر میں حالی کے پہلے مسدس ''مدوجزرِ اسلام'' سے چار سال پہلے لکھا۔ اس وقت حاؔلی کی عمر ۴۲ سال تھی۔

نقی احمد ارشاد نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ شاؔد، قومی یک جہتی کے علمبردار تھے۔ اس لیے اُنھوں نے ایک مثنوی ''نویدِ ہند'' ۱۸۸۷ء میں تصنیف کی۔ اس مثنوی میں حکومت کا دھیان مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کی طرف رجوع کرایا گیا تھا تا کہ ان کی پستی اور تنزلی دُور ہو اور ہندو مسلمان آپسی جھگڑوں کو ختم کر کے تعلیم و ترقی کی طرف راغب ہوں۔ یہی مثنوی نظر ثانی کے بعد ۱۹۱۲ء میں ''مادرِ ہند'' کے نام سے شائع ہوئی۔

نقی احمد ارشاد نے اپنے تحقیقی کام کو کہیں بوجھل نہیں ہونے دیا۔ ''شاد کا عہد اور فن'' (حصہ دوم) یقیناً ایسی کتاب ہے جسے اُردو ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کے پاس ہونا چاہیے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ کئی سال پہلے چھپ کر خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ ہر حصے کی اپنی الگ اہمیت ہے۔

(''آج کل'' دہلی، اگست ۱۹۸۹ء)

📖

مرزا غالبؔ: ایک تنقیدی جائزہ — نقی احمد شاد

غالبؔ کے دو صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر ''اُردو مرکز عظیم آباد'' نے اپنی دوسری کتاب نقی احمد ارشاد کی تصنیف ''مرزا غالب: ایک تنقیدی جائزہ'' کی صورت میں پیش کی ہے۔ اس اشاعتی پروگرام کا آغاز سردار جعفری کی کتاب ''غالب کا سومناتِ خیال'' سے ہوا تھا۔ اس میں غالبؔ کی مشہور

فارسی مثنوی "چراغِ دیر" کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ اس سلسلے کی تیسری پیشکش شکیل الرحمٰن کی "رقصِ بتانِ آذری" بھی شائع ہو گئی ہے۔

نقی احمد ارشاد، شاد عظیم آبادی کے پوتے ہیں۔ لیکن وہ صرف اسی نسبت سے نہیں پہچانے جاتے۔ ان کے شعری اور علمی اکتسابات کا عملی اظہار چار پانچ دہائیوں سے ہو رہا ہے۔ انھوں نے شاد کے غیر مطبوعہ کلام کو کتابی صورت میں شائع کرایا۔ شاد کی نثری کتابیں بھی منظرِ عام پر لائے۔ کچھ پہلی بار، کچھ دوسری بار۔ علم و ادب سے نقی احمد ارشاد کی والہانہ شیفتگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اُردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ سنسکرت اور ہندی کی ادبی روایات سے بھی وہ اچھی طرح آشنا ہیں۔ تاریخ تصوّف اور فلسفے سے بھی انھیں شغف ہے۔

"مرزا غالب: ایک تنقیدی جائزہ" کا متن سو صفحات پر مشتمل ہے۔ نقی احمد ارشاد نے جان بوجھ کر اختصار کو ملحوظ رکھا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں آج کل ضخیم کتابیں نہیں پڑھی جاتیں۔ قاری کی عدم موجودگی کے اس دور میں کسی کتاب کو خواہ وہ مختصر ہو یا ضخیم، اگر سو پچاس سنجیدہ قاری بھی میسر آجائیں تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اس کتاب کی حیثیت ایک طرح کے مونوگراف کی ہے۔ اس کے پہلے حصے میں اجمال کے ساتھ غالبؔ کی زندگی کے ضروری واقعات پیش کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً پیدائش، تعلیم و تربیت، شادی، شاعری کا شوق، کلکتہ کا سفر، قلعہ معلیٰ سے وابستگی، بیماریاں اور موت۔

دوسرا حصہ غالبؔ کی شاعری کے محاکمے پر مشتمل ہے۔ بیدلؔ کی اثر پذیری کے تعلق سے نسبتاً تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ بیدلؔ کی پُر پیچ ترکیبیں، ان کا ابہام، ہندو فلسفے سے متاثر ان کے افکار، غالبؔ کے لیے ایک خاص وقت میں وجہِ کشش تھے۔ لیکن وہ بیدلؔ کے تتبع میں دور تک نہ جا سکے اور اس رنگِ سخن سے دست کش ہو گئے۔ نقی احمد ارشاد نے نظیریؔ اور غالبؔ کے فارسی اشعار کی مماثلت اور یک رنگی کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہ بیدلؔ اور نظیریؔ کے علاوہ عرفیؔ، ظہوریؔ اور انوریؔ سے بھی غالبؔ نے استفادہ کیا ہے۔ مصنف نے بیدلؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے فلسفیانہ افکار کے ضروری نکات بھی بیان کیے ہیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقبالؔ کے مذہبی اور ملی خیالات میں شدید تضادات ہیں، اس کے برعکس بیدلؔ کے افکار میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ نقی احمد ارشاد نے اپنی تائید میں کئی جگہ "نگار" کے "معلومات نمبر" سے نیازؔ فتح پوری کے بیانات نقل کیے ہیں۔ لیکن ان سے کامل اتفاق ضروری نہیں۔ مصنف نے مثال دے کر بتایا ہے کہ غالبؔ کے مقابلے میں مومنؔ کی فارسی ترکیبیں زیادہ دل پذیر ہیں۔ انھوں نے بیدلؔ اور غالبؔ کے اشعار کا موازنہ بھی کیا ہے اور اوّل الذکر کو غالبؔ پر ترجیح دی ہے۔ لیکن غالبؔ کی انفرادی خصوصیات جو غالبؔ کو غالبؔ بناتی ہیں، ان پر ذرا کم توجہ کی گئی ہے۔ مجھے

اس کتاب میں یہ کمی محسوس ہوئی۔ انسان بحیثیتِ کُل غالبؔ کی شاعری میں متحرک نظر آتا ہے۔ غالبؔ نے انسانی وجود کو ایک وحدت کی شکل میں دیکھا اور اپنی شاعری میں پیش کیا۔ انسان کی ہمہ جہتی کا اتنا بھرپور، اتنا جمالیاتی اور اتنا بامعنی اظہار عالمی شاعری میں بھی کم کم ہی ملے گا۔

نقی احمد ارشاد نے زیادہ تر اشاروں میں باتیں کی ہیں۔ انھوں نے غالبؔ کے افکار اور اظہار کے تمام ضروری پہلوؤں کو اپنے محاکمے میں شامل کیا ہے، لیکن جی چاہتا ہے کہ ہر جگہ اس قدر ایجاز و اختصار سے کام نہ لیا گیا ہوتا تو بہتر تھا۔ قاری کو خود سے خالی جگہیں پُر کرنی پڑتی ہیں۔ ویسے یہ کتاب ہے بھی ذہین قاری کے لیے۔ نقی احمد ارشاد نے غالب کا تنقیدی جائزہ کھلے ذہن سے لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان پر جانب داری کا الزام عائد نہ ہو۔ وہ اس پیرانہ سالی میں جواں ہمت اور باحوصلہ ہیں۔

ان کی نئی کتاب "مرزا غالبؔ: ایک تنقیدی جائزہ" میں کئی خیال انگیز باتیں ہیں۔ کچھ ایسی ضمنی باتیں بھی ہیں جو کہیں اور نہیں مل سکتیں۔ بیدلؔ کے کلام پر ہندوستانی اثرات کا ذکر سب سے پہلے شادؔ عظیم آبادی نے اپنی کتاب "نوائے وطن" میں کیا تھا اور ان کے مکھی اشعار پیش کیے تھے۔ قاضی عبدالودود نے اس کی تردید کی اور دعویٰ کیا کہ یہ اشعار خود شادؔ نے اپنی طرف سے کہہ دیے ہیں۔ قاضی عبدالودود کا موقف یہ بھی تھا کہ بیدلؔ، عظیم آباد کے یعنی عظیم آبادی نہیں تھے، حالانکہ حسین قلی خاں عظیم آبادی کے فارسی تذکرہ "نشترِ عشق" کا قلمی نسخہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے جس میں تحریر ہے کہ بیدلؔ کی ولادت عظیم آباد میں ۱۰۵۴ھ میں ہوئی۔ نقی احمد ارشاد نے اس طرح کی ضمنی اور بہ ظاہر غیر متعلق باتوں سے کتاب کو دلچسپ بنا دیا ہے۔

("ترجمان"، عظیم آباد، شمارہ ۲، نومبر ۱۹۹۹ء)

📖

بے نام شجر

نور جہاں ثروت

"بے نام شجر" ایک ایسی شاعرہ کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جسے جذبات پر بھی قابو ہے اور زبان و بیان پر بھی، لیکن جس نے اپنے تجربات، محسوسات اور مشاہدات کے بے محابا اظہار میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا ہے۔ مجھے اس مجموعے میں سچی شاعری کے نمونے نظر آئے اور اس کے مطالعے سے شاعرہ کے جینوئن (Genuine) ہونے کا اندازہ ہوا۔ نور جہاں ثروت نے نظمیں اور غزلیں دونوں کامیابی

سے کہی ہیں۔ وہ عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کرتی ہیں اور اپنے کلام کی ایک خاص سطح برابر برقرار رکھتی ہیں۔ اس مجموعے میں شامل کلام ایک بالغ ذہن کی تخلیق ہے۔

کتاب سلیقے سے مرتب کی گئی ہے اور ظاہری تزئین و آرائش کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے، جو کتاب کے معنوی محاسن کے شایانِ شان ہے۔

(ماہ نامہ "سہیل" گیا، جلد ۵۶، شمارہ ۱۲، اشاعت: مارچ ۱۹۹۷ء)

جرس

واحق احمد مجتبیٰ* (وامق جونپوری)

مشہور گیت "بھوکا ہے بنگال" کے خالق وامق احمد مجتبیٰ کے کلام کا یہ پُر وقار مجموعہ ابھی ابھی منظرِ عام پر آیا ہے۔ "جرس" وامق کی شعری کاوشوں کا نچوڑ ہے اور ہر طرح ایک مکمل مجموعہ ہے۔ اس میں وامق کی وہ تمام نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو ان کی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیت پر دلالت کرتی ہیں۔ جدید شعری ادب میں "جرس" ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

(نئی کرن" دربھنگا، شمارہ ۳، اشاعت: فروری ۱۹۵۱ء)

ہم امن چاہتے ہیں

ہربنس سنگھ دوست

جنگ سے نفرت اور امن کی خواہش انسان کا فطری جذبہ ہے۔ بیسویں صدی نے دو عالمگیر جنگوں کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں دیکھی ہیں۔ خطرناک جنگی اسلحوں اور بموں کی روز افزوں افزائش کے بعد اب تیسری عالمگیر جنگ کا تصور بھی انسان کے رونگٹے کھڑے کر دینے کو کافی ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ آج بھی چند درندہ صفت استعمار پرست نسل انسانی کو خاک وخوں میں تڑپتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی ملک گیرانہ ہوس کو پورا کرنے کے لیے اپنے اسلحہ ساز کارخانوں اور تجارتی منڈیوں کو ترقی

---

* وامق جونپوری کا کلام ایک مختصر عرصے کے لیے وامق احمد مجتبیٰ کے نام سے شائع ہوا۔

دنیے کے لیے سارے عالم کو تباہ اور ویران کردینے کے درپے ہیں۔ لیکن دنیا کا ہر عام انسان امن کا خواہش مند ہے۔ ادب چونکہ عام انسانوں کی خواہشوں اور آرزوؤں کی ترجمانی کرتا ہے اس لیے دنیا بھر کے سارے نیک نفس ادیبوں اور شاعروں نے جنگ کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے اور امن کے گیت گائے ہیں۔ ہربنس سنگھ دوست کا مرتب کردہ مجموعہ ''ہم امن چاہتے ہیں'' انھیں ادیبوں اور شاعروں کی امن پسندانہ نگارشات کا ایک خوبصورت انتخاب ہے۔

اُردو ادب کا یہ دور غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری کا دور ہے۔ چند ایک واقعی قابل احترام اور مخلص خدمت گزارانِ ادب کو چھوڑ کر عام طور پر اُردو کے موجودہ ادیب یا تو اپنی پبلسٹی کی کوششوں میں مصروف ہیں یا ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھال رہے ہیں یا محض اُردو کی قصیدہ خوانی کر کے اس زبان کے مستقبل کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کئے لے رہے ہیں۔ یہ تینوں صورتیں اُردو کے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتی ہیں۔ واقعی سنجیدگی اور خاموشی سے کوئی تخلیقی کام کرنا جو ادب اور سماج کے لیے مفید ثابت ہو سکے بہت صبر آزما ہے۔ اور اس کے لیے صرف خلوص ہی نہیں بلکہ غیر معمولی محنت و مشقت کی ضرورت بھی ہے۔ نئے ادیبوں میں خلوص کی کمی ہو یا نہ ہو لیکن کچھ ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ وہ ریاضت اور جانفشانی سے جی چراتے ہیں۔

ہربنس سنگھ دوست غالباً اُردو کے سب سے کم عمر ادیب ہیں۔ ابھی اُنھوں نے زندگی کی بیس بہاریں بھی مکمل نہیں کی ہیں۔ اس عمر میں عموماً طبیعت سخت محنت و مشقت کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ لیکن انھوں نے ''ہم امن چاہتے ہیں'' مرتب کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ادب اور انسانیت کی بقا اور ترقی کے لیے ہر ممکن زحمت برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ امن کے موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں کی اہم تخلیقات کا اتنا عمدہ مجموعہ مرتب کرنا کچھ ان کا ہی حصہ ہے۔

ہندوستان میں امن کی تحریک کئی سالوں سے چل رہی ہے۔ یہاں کے تمام مقتدر ادیب، شاعر اور فنکار اس تحریک میں عملی طور پر حصہ لیتے رہے ہیں اور جنگ و امن کے موضوع پر بے شمار چیزیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اب تک امن سے متعلق اچھی تخلیقات کو کسی مجموعہ کی شکل میں شائع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، حالانکہ یہ وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔ وامق جونپوری نے البتہ امن کے موضوع پر لکھی ہوئی اُردو نظموں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ ہربنس سنگھ دوست کا مرتب کردہ مجموعہ زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ اہم ہے۔

اس مجموعہ میں ۹۱ ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں جن میں سے ۵۲ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیب ہیں۔ اُردو کے لکھنے والوں کی تعداد ۳۹ ہے۔ جہاں ہر ادیب کی تصویر شامل ہے، وہاں ہر ایک نے اپنے تاثرات کا اظہار بھی کیا ہے کہ ''میں امن کیوں چاہتا ہوں؟'' اُردو، ہندی، پنجابی،

تامل، تلگو، اُڑیا وغیرہ کے ساتھ روسی، فرانسیسی، امریکی، انگریزی، اطالوی، جرمنی، ہسپانوی، چینی، جاپانی وغیرہ زبانوں کی تخلیقات کی شمولیت نے مجموعہ کو ایک ادبی صحیفہ بنادیا ہے۔ یہ جامعیت بہت کم مجموعوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اُردو کی تخلیقات میں گوربخش سنگھ، کرشن چندر، بیدی، کلام حیدری، شفیق الرحمٰن اور ہربنس سنگھ دوست کے افسانے اور وامق جونپوری، منظر شہاب، اختر الایمان اور احمد علی جاوید کی نظمیں خاص طور پر بہت اثر انگیز ہیں۔ مرتب نے کوشش کی ہے کہ مجموعہ میں اچھی چیزیں ہی شامل ہوں، وہ محض ناموں کے پیچھے نہیں بھاگے، لیکن پھر بھی چند چیزیں ایسی شامل ہوگئی ہیں جن کا نہ ہونا ہی اچھا تھا۔ احمد ندیم قاسمی اور جعفری کی ان سے بہتر چیزیں شامل کی جاسکتی تھیں۔

امن اس دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور دائمی امن کے قیام میں ہی انسانیت کی بقا اور ارتقا کا راز مضمر ہے۔ مرتب ہربنس سنگھ دوست جنھوں نے یہ مجموعہ مرتب کیا اور ناشر امر سنگھ جنھوں نے یہ مجموعہ چھاپا دونوں ہر طرح مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتابت اور طباعت بے حد نفیس اور دلکش ہے حسن ترتیب اور حسن اشاعت دونوں لحاظ سے اس کتاب کو خصوصیت حاصل ہے۔ اس مختصر تبصرے میں کتاب کی ساری خوبیوں کا احاطہ ممکن نہیں۔ مجملاً یہ سمجھ لیجیے کہ (۱) امن کے موضوع پر مختلف ادیبوں کی نگارشات کا اُردو میں یہ پہلا مجموعہ ہے، (۲) تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اُردو کی کوئی کتاب اس اہتمام سے شائع نہیں ہوئی۔ اور (۳) اس کتاب کی گوناگوں خوبیوں کے پیشِ نظر اس کی قیمت بہت کم ہے۔ اس کتاب کو دیکھتے ہی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے لیکن مشاعرے جیسی "واہ واہ" مرتب اور ناشر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ ضرورت ہے کہ ہر اُردو داں اس کتاب کو خرید کر پڑھے اور ہر لائبریری میں یہ کتاب موجود ہوتا کہ اُردو کے ناشروں کو ایسی کتابیں چھاپنے کی جرأت ہو سکے اور ادیبوں کے دل میں بھی کسی پائدار، مفید، تخلیقی کام کا جذبہ اُبھر سکے۔

(ماہ نامہ "معاون" کلکتہ، جون ۱۹۵۵ء)

📖

گیت اور چیخ

ہربنس سنگھ دوست

میری دانست میں ہربنس سنگھ دوست اُردو کے سب سے کم عمر افسانہ نگار ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز چند سال پہلے ہوا ہے لیکن اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے ایسا معلوم ہوتا ہے

فنِ افسانہ نگاری کا باقاعدہ ریاض کیا ہے۔ ان کے بارہ افسانوں کا پہلا مجموعہ "گیت اور چیخ" چند ماہ پہلے شائع ہوا ہے۔ یہ افسانے تکنیکی اعتبار سے چست اور منجھے ہوئے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر دوستؔ کا فن بیدی کے فن سے بہت مماثل نظر آیا۔ یہ مماثلت بذات خود قابل قدر ہے۔ اس مجموعہ کا دیباچہ سہیل عظیم آبادی نے لکھا ہے، جس میں انھوں نے بہت سی پتے کی باتیں کہی ہیں۔

دوستؔ کی زبان ابھی بہت خام ہے۔ اگر وہ اپنی زبان کی طرف خصوصی توجہ دیں تو انھیں جلد مقبولیت حاصل کرنے میں آسانی ہوگی۔

ان کے افسانوں کے پلاٹ سیدھے سادے ہماری زندگی سے لیے ہوئے لیکن اور بجنل ہیں۔ دوستؔ پلاٹ کی تعمیر سے زیادہ ماحول کی تصویر کشی اور کردار نگاری پر زور دیتے ہیں۔ ان کے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی کردار ضرور ابھرتا نظر آتا ہے۔ "ماسٹر جی" تو ایک کردار کا خاکہ ہی ہے، لیکن "برش اور رنگ" کا آرٹسٹ، "پردھان منتری کی بیٹی" کی کامنی اور "عارف بھائی" ہر ایک کا نقش واضح اور بھرپور ہے۔ دوست نے اپنے کرداروں کو محض فرشتہ یا شیطان کے رُوپ میں پیش نہیں کیا، اس لیے کہ ان کے کردار اسی دنیا کے گوشت پوست کے انسان ہیں۔ "بجلی" اور "ایٹم بم پھٹ گیا" میں خود ماحول ہی کردار بن گیا ہے۔

ہربنس سنگھ دوست میں کامیاب افسانہ نگار بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کو کس طرح بروئے کار لاتے ہیں۔ "گیت اور چیخ" کے مطالعہ کی سفارش میں ہر اس ادب دوست سے کروں گا جو اُردو کے جدید ترین افسانہ نگاروں کے متعلق واقفیت حاصل کرنا اور ان کے امکانات کا اندازہ لگانا چاہتا ہے۔

(ماہ نامہ "معاون" کلکتہ، نومبر ۱۹۵۵ء)

OO

۱ آفاق احمد

۲ اظہر غوری

۳ بہار الدّین ریاض

۴ حسن امام درد

۵ خالد رحیم

۶ سیّد محمد حسنین، ڈاکٹر

۷ سیماب سلطان پوری

۸ ضیاء الرحمٰن غوثی

۹ عبد المنّان طرزی

۱۰ وہاب اشرفی

آفاق احمد

ٹی۔وی۔ڈرامے

آفاق احمد کی دلچسپیاں مختلف النوع ہیں۔وہ بہ اِک وقت، ڈرامہ نگار، شاعر اور افسانہ نویس ہی نہیں بلکہ اسپورٹس کے ایک مبصر اور کمنٹیٹر بھی ہیں۔ان کا اشہبِ قلم ادب کے مختلف میدانوں میں اپنے جوہر دِکھاتا ہے۔کھیلوں اور کھلاڑیوں کے بارے میں ان کے پاس معلومات کا خزانہ ہے اور ان کے تعلق سے وہ ایک چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔

آفاق احمد بڑی فعال شخصیت کے مالک ہیں۔وہ سائنس کے گریجویٹ ہوئے، پھر انگریزی ادبیات میں ایم، اے کیا۔عرصے سے سری نگر کے ریجنل انجینئرنگ کالج میں انگریزی کے اُستاد ہیں۔ان کے شاگردوں، عزیزوں اور دوستوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے۔وہ ہر لمحہ اپنے آپ کو جسمانی یا ذہنی طور پر مشغول رکھتے ہیں۔ابھی وہ آپ سے باتیں کررہے ہیں، اچانک وہ اپنے مرغوب پکوان تیار کرنے میں لگ جائیں گے، آپ کو بھی شریکِ طعام کریں گے، پھر آپ سے معذرت چاہیں گے، ریڈیو اسٹیشن جاکر ایک گفتگو ریکارڈ کرآئیں گے اور وہاں سے فارغ ہوکر ٹیلی ویژن کے ”کھیل اور کھلاڑی“ پروگرام میں کھیلوں پر تبصرہ کرنے حاضر ہوجائیں گے۔آدھی رات تک دو الگ الگ ڈرامے لکھ جائیں گے — ایک ریڈیو کے لیے، ایک ٹیلی ویژن کے لیے۔اس دوران کوئی غزل یا آزاد غزل بھی تیار ہوجائے گی اور ممکن ہوا تو کوئی تنقیدی مضمون بھی۔

انتھک کام کرنے کی صلاحیت نے آفاق احمد کی شخصیت کو قابلِ رشک بنادیا ہے۔آفاق احمد کے افسانوں کے دو مجموعے ”تنہائی سے تماشہ تک“ اور ”آخری اسکور“ شائع ہوچکے ہیں۔ان کے ریڈیو ڈراموں کا ایک مجموعہ ”تین ڈرامے“ کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ان کے چھ اسٹیج ڈراموں پر مشتمل ایک کتاب ”تاریخی ڈرامے“ بھی چھپ چکی ہے۔ان کے دو اور مجموعے زیرِ اشاعت ہیں۔کلام کا ایک مجموعہ بھی ترتیب کے آخری مراحل میں ہے۔

یہاں آفاق احمد کی شخصیت یا ان کی ادبی سرگرمیوں کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا مقصود نہیں،

لیکن چونکہ زیرِ نظر مجموعہ ٹیلی ویژن ڈراموں پر مشتمل ہے، اس لیے بحیثیت ڈرامہ نگار مختصراً ان کا تعارف کرانا غیر مناسب نہ ہوگا۔ آفاق احمد نے ۱۹۶۲ء میں چینی حملے کے دوران ریڈیو کشمیر سری نگر کے لیے روزانہ ایک فیچر لکھنا شروع کیا جو دراصل ڈرامہ نگاری کی طرف ان کا پہلا قدم تھا۔ انھیں دنوں انھوں نے ایک باقاعدہ مکمل ڈرامہ ''دہی والی'' لکھا جو ریڈیو کشمیر کے ''جشنِ تمثیل'' میں شامل ہوا اور بے حد پسند کیا گیا۔ آفاق احمد اس کے بعد سے اب تک تقریباً پچاس ریڈیو ڈرامے لکھ چکے ہیں جنھیں عوامی مقبولیت سے سرفراز ہونے کا فخر حاصل ہے۔

ٹی وی ڈرامہ، ریڈیو اور اسٹیج ڈراموں سے مختلف ہے۔ اسے دونوں کا امتزاج کہنا بھی درست نہیں۔ ممکن ہے ریڈیو اور اسٹیج کے مطالبات سے واقفیت رکھنے والے ادیب کے لیے ٹی، وی ڈرامہ لکھنا نسبتاً آسان ہو، لیکن عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ریڈیو کے بعض بہت اچھے ڈرامہ نگار ٹی، وی کے لیے لکھتے ہوئے ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ آفاق احمد اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ وہ ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج تینوں میں یکساں طور پر کامیاب رہے ہیں۔

میرا خیال ہے ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامہ لکھنا، ریڈیو اور اسٹیج کے لیے لکھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ ریڈیو اور اسٹیج پر شاعری اور لفاظی سے بہت کچھ کام نکالا جاسکتا ہے، لیکن ٹی وی کے مطالبات کچھ زیادہ سخت ہیں۔ اس کے تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونا ہر ڈرامہ نگار کے بس کی بات نہیں۔ یوں بھی ٹی وی ایک نیا میڈیم ہے اور ہمارے ملک میں لکھنے والے ٹی وی ڈرامے کی ضرورتوں سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔

ٹی وی ڈرامہ، ریڈیو ڈرامے پر تیزی سے اثر انداز ہو رہا ہے۔ ریڈیو ڈرامہ سماعی ہے اور ٹی وی ڈرامہ بصری اور سماعی دونوں۔ ریڈیو ڈرامے میں حسِ سماعت دوسرے حواس سے رشتہ استوار کرتی ہے۔ ٹی وی ڈرامے میں چونکہ واقعات آنکھوں کے سامنے عمل پذیر ہوتے ہیں اس لیے حواسِ خمسہ کو بہ اِک وقت متاثر کرتے ہیں۔

آفاق احمد ٹی وی ڈرامے کے فنی لوازمات اور آداب سے واقف ہیں، اور پروڈکشن کے مطالبات کو پیشِ نظر رکھ کر ڈرامے تحریر کرتے ہیں۔ سری نگر ٹیلی ویژن سینٹر کی پیدائش کے وقت سے ہی وہ اس کے پروگراموں سے وابستہ رہے ہیں۔ اس لیے انھیں ٹی وی ٹیکنیک کی پیچیدگیوں اور رموز کا علم ہے۔ انھوں نے ٹی وی کے لیے تقریباً دس ڈرامے اور پانچ سلسلہ وار کھیل لکھے ہیں۔ یہ سارے ڈرامے اور سیریلز (serials) سری نگر دور درشن نے تیار کیے ہیں اور ان میں سے کئی دوسرے ٹیلی ویژن مراکز سے بھی دِکھائے جاچکے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے سلسلہ وار ڈرامے ''دھوپ چھاؤں''

کی آٹھ قسطیں (episodes)، ''چوراہا'' کی پندرہ قسطیں، ''اب کیا ہے'' کی اٹھائیس قسطیں، ''بھنور'' کی بارہ قسطیں اور ''اپنے اجنبی'' کی دس قسطیں پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سے ''بھنور'' دوردرشن سری نگر سے پیش ہونے والا پہلا اور اب تک آخری رنگین سیریل ہے۔ ان سب کی مقبولیت کے پیشِ نظر آفاق احمد ٹی وی ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ایک مستحکم شخصیت بن گئے ہیں۔

ٹی وی ڈراموں کا یہ مجموعہ جو آپ کے سامنے ہے، کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان میں اُردو کے ٹی وی ڈراموں کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ لہٰذا اس باب میں اوّلیت کا سہرا آفاق احمد کے سر بندھا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہر ڈرامے میں ان لوازمات کی نشان دِہی خاصی تفصیل کے ساتھ کر دی ہے جن کا لحاظ ہر ڈرامہ نگار کو کرنا چاہیے۔ نئے لکھنے والوں کو خصوصاً اس سے استفادہ کا موقع ملے گا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ٹیلی ویژن ڈرامہ نئے لکھنے والوں کے انتظار میں ہے!

زیرِ نظر مجموعے میں تین ڈرامے شامل ہیں۔ ''وہ بہت اکیلی تھی''، ''کہیں دور'' اور ''کھلونے''۔

''وہ بہت اکیلی تھی'' کا مرکزی خیال اخباروں میں آئے دن چھپنے والی خبروں سے لیا گیا ہے۔ جہیز ہمارے موجودہ معاشرے کی بہت بڑی لعنت ہے۔ اس نے کتنی نئی نویلی دلہنوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک نو بیاہتا دُلہن سسرال والوں کے ظلم کا نشانہ بنتی ہے، اسے جلا کر مار ڈالا جاتا ہے۔ ایک ایماندار پولیس افسر کی انتھک جدوجہد کے بعد اس مظلوم دلہن کے قاتل اپنے کیفرِ کردار کو پہنچتے ہیں، لیکن اس نوخیز دلہن کی لاش اس مدقوق سماج کے لیے آج بھی ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔ یہ ڈرامہ سری نگر دوردرشن سے نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔

''کہیں دور'' بھی سری نگر دوردرشن سے پیش ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس ڈرامہ کا تھیم یہ ہے کہ ہمارا ملک صنعتی انقلاب سے گزرتے ہوئے ایک اَن دیکھی دوڑ کا شکار ہو گیا ہے۔ والدین کی خواہش ہے کہ ان کا بیٹا انجینئر بنے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ ذہین بیٹے کا رجحان اس طرف نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک اچھا ادیب مر جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک اوسط درجے کا انجینئر جنم لیتا ہے۔ اور وہ بھی اپنے اقدار کی پاسداری کے باعث خود کو آج کے معاشرے کا حصہ نہیں بنا پاتا۔

تیسرے ڈرامے ''کھلونے'' کا موضوع خاندانی بہبود ہے جو اس دور میں ہمارے ملک کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی ضرورتیں انسانی کردار کو دیمک کی طرح کھا جاتی ہیں اور ایک بڑے خاندان کی کفالت اچھے طور پر کرنے کی کوشش ایک ہنستے کھیلتے

گھرانے کو برباد کر دیتی ہے۔ یہ ڈرامہ سری نگر دُور درشن سے پیش کیا گیا اور دوسرے ٹی وی اسٹیشنوں سے بھی دکھایا گیا۔ اس ڈرامے کو فیملی ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام ملکی سطح پر ٹی، وی اسکرپٹ کے ایک مقابلے میں خصوصی انعام ملا۔

آفاق احمد کے کردار حقیقی اور مکالمے فطری ہوتے ہیں۔ واقعات کی ترتیب میں حسن اور جامعیت ہوتی ہے۔ ان کے ڈراموں میں جذباتی تصادم بلند آہنگ نہیں ہوتا بلکہ زیریں سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس مجموعے کے ڈرامے مصنف کے گہرے مشاہدے، سماجی بصیرت اور اس کے واضح نقطۂ نظر کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ آفاق احمد ٹی وی ڈرامے کی شاہراہ پر اپنے سفر کے ابتدائی مرحلوں سے بحسن وخوبی گزرے ہیں۔ ابھی ان کے سامنے ایک طویل راستہ ہے۔ لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ٹی، وی، ڈرامے کا مستقبل آفاق احمد کے محفوظ ہاتھوں میں ہے!

(سری نگر، ۲۰ ؍اگست ۱۹۸۴ء، اشاعت کتاب: ۱۹۸۵ء)

OO

اظہر غوری

خار و گُل

اظہؔر غوری بحیثیت شاعر معروف نہیں ہیں، کیونکہ انھوں نے نہ تو اپنے کلام کو شائع ہونے کا موقع دیا اور نہ مشاعروں میں اپنی آواز کا جادو جگایا۔ ان کی بنیادی دلچسپی نثر نگاری سے ہے۔ انھوں نے سیاسی، دینی اور اخلاقی موضوعات و مسائل کے تعلق سے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اور فنِ ترجمہ سے تو اُنھیں خاص شغف ہے۔ عربی زبان و ادب سے ان کی گہری وابستگی کا ہی نتیجہ ہے کہ انھوں نے اس زبان کی کئی اعلیٰ تصانیف کو کمال خوبی سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ان کی نثری تحریریں کئی ہزار صفحات کو محیط ہیں۔ شاید اسی لیے وہ شاعری کو اپنے لیے ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے اور اپنے کلام کو ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ لیکن جادو تو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کبھی کبھی نجی محفلوں میں جب اصرار کے بعد بڑی لجاجت سے اپنا کلام سناتے ہیں تو ان کے شعری جوہر کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بہر حال اپنی دونوں حیثیتوں کو الگ الگ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی نثری نگارشات ابو مسعود اظہر ندوی کے نام سے منظرِ عام پر آتی رہی ہیں۔

اظہر غوری ہماری شعری روایات اور اقدار کا پورا عرفان رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی رسم عام سے الگ ڈگر پر چل کر اپنی شاعری کو تازہ مطالبات اور نئے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ شاعری ان کے جذبہ و احساس کا بے محابا اظہار ہے، لیکن انھوں نے اپنے جذبات و محسوسات کو تجربے اور مشاہدے کی آگ میں بھی تپایا ہے۔ اُن کی بظاہر پُرسکون شخصیت کی تہہ میں کرب و اضطراب کی سرکش لہریں کروٹیں لیتی رہتی ہیں۔ وہ اپنی شاعری کا مقصد اپنے ایک مقطع میں یوں بیان کرتے ہیں:

دل کے زخموں کو عطا کرنا تھا لفظوں کا لباس
اور اظہؔر مقصدِ عرضِ ہنر کوئی نہ تھا

اظہؔر غوری کی شاعری متانتِ فکر سے عبارت ہے جو بہترین سماجی اور تہذیبی اقدار کو جزوِ زندگی بنانے سے حاصل ہوتی ہے۔ ان کے یہاں عصری مسائل کی گونج صاف سنائی دیتی ہے، لیکن وہ آج کے کلیشے زدہ موضوعات مثلاً تنہائی، احساسِ بیگانگی، بے یقینی وغیرہ سے اجتناب کرتے ہیں۔ بلکہ ان

کے یہاں کہیں کہیں اس طرح کا جری لہجہ اُبھرتا ہے:

ہمیں اسی لیے رکھا گیا ہے زنداں میں — نیام ہی میں تو تلوار رکھی جاتی ہے

اب اس کے سامنے جمتا بھی رنگ تو کس کا — جو جسم رقص کناں تھا، وہ سر بریدہ تھا

وہ کبھی کبھی حوادثِ دوراں سے آبدیدہ بھی ہوتے ہیں:

ملا تھا ایک زمانے کے بعد آج اظہؔر — مگر حوادثِ دوراں سے آبدیدہ تھا

لیکن وہ جانتے ہیں کہ اس کا علاج یوں ہے کہ صحیح وقت پر صحیح بیج بویا جائے:

فصل کاٹے گا ندامت کی یقیناً اِک دن — وقت پر بیج جس انسان نے بویا ہی نہیں

اگر ہمت اور حوصلہ ہو تو ایک ادنیٰ چراغ بھی اندھیرے کے بھاری لشکر سے مات نہیں کھاتا:

زمانہ بھر کے اندھیرے شکست دے نہ سکے — اس اِک چراغ میں اظہؔر تھی روشنی کتنی!

اظہؔر غوری اس وقت تک فکرِ سخن کی طرف راغب نہیں ہوتے جب تک محسوسات و تجربات پوری طرح اُنھیں اپنی گرفت میں نہیں لے لیتے۔ وہ خوبصورت لفظیات اور دلکش طرزِ ادا کی اہمیت کے قائل ہیں۔ وہ اپنے اِردگرد کے مسائل سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے چارسُو پھیلی ہوئی بدقوارگی پر جابجا دردمندانہ تبصرے کیے ہیں:

تن آسانو! خبر لو بیٹھتی جاتی ہیں دیواریں
بچیں گے رنگ و روغن سے بھلا دیوار و در کب تک؟

ظفؔر اقبال کا ایک مشہور مطلع ہے:

یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا — کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تُو نہ ملا

اسی زمین میں، لیکن قافیے کی تبدیلی کے ساتھ، اظہؔر غوری کے یہاں بھی ایک غزل ملتی ہے۔ اس کے ایک شعر میں "دُعا" اور "اثر" کے تلازمے سے اُنھوں نے ایک خاص پُراثر کیفیت پیدا کی ہے:

لکھا کے لائے تھے محرومیاں مقدّر میں
تجھے دُعا نہ ملی اور مجھے اثر نہ ملا

اظہؔر غوری ہر طرح کی زمین اور بحر میں اظہار کی یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ عموماً سادہ لیکن روشن الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ابہام اور اشکال سے ان کے مزاج کو نفور ہے۔ اُنھوں نے ایسی

بحروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے، جن کی مثالیں صرف عربی شاعری میں ملتی ہیں۔ مثلاً:

نہیں اس میں شک وہ دشمنِ قلب وجاں تو ہے
حرارت سے مالامال برقِ تپاں تو ہے

اس کا وزن فعولن مفاعیلن فعولن مفاعلن ہے، یا مثلاً یہ شعر:

نہ تو چاک دامنِ دل، نہ عرصۂ دار ہے — مرے چارہ گر! یہ عجیب فصلِ بہار ہے

جس کا وزن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن ہے۔

اظہر غوری کی شاعری ایک سنبھلی ہوئی طبیعت اور صحت مند افتادِ ذہنی کی پیداوار ہے۔ ان کے اسلوب میں روانی، شگفتگی اور دل گداختگی ہے۔ یہ چند اشعار میرے بیان کی تصدیق کریں گے:

اب تو آنکھوں میں سفیدی کے سوا کچھ نہ رہا — اور کیا مجھ کو مرا یوسفِ ثانی دے گا؟

اِک جست میں حل کر دیا اندازِ جنوں نے — وہ عقدہ جو لاینحلِ صاحب نظراں ہے

ہمارے منصف کو دیر کچھ بھی لگی نہ پھانسی کا حکم دیتے
ہم ایسے ناداں سمجھ رہے تھے ابھی ہمارا بیان ہوگا

شکریہ! آپ نے زخموں پہ نمک پاشی کی — شہر میں اور کسے چارہ گری آتی ہے

میری مہمان نوازی کا تھا چرچا ایسا — جو بھی طوفانِ بلا آیا، مرے گھر ٹھہرا

سمجھ لیا تھا سرِ شام تم نہ آؤ گے — تمام رات بھلا انتظار کیا کرتے

اس لیے ہم نرگسِ بیمار کے قائل ہوئے
اس کے جیسا بھی چمن میں دیدہ ور کوئی نہ تھا

اظہر غوری "خار و گُل" کے نام سے اپنا مجموعۂ کلام بصد انکسار پیش کر رہے ہیں، جس میں ۱۵۲ غزلیں اور بہت سے متفرق اشعار شامل ہیں۔ یہ کسی نئے شاعر کا نہیں ایک پختہ مشق شاعر کا کلام ہے۔ ایسے مجموعے کم کم ہی شائع ہوتے ہیں۔

(دہلی، ۱۰ر جون ۱۹۹۷ء)

○○

بہار الدین ریاضؔ

لالۂ صحرا

بہار الدین ریاضؔ کو میں اسی دن سے جانتا ہوں جس دن آل انڈیا ریڈیو میں اپنی پہلی پوسٹنگ کے سلسلے میں کٹک پہنچا تھا۔ ان کا کلام سنا تو ان کی ہونہاری کا قائل ہوا۔ یہ ان کی نوجوانی کے دن تھے۔ اس بات کو اب پورے چالیس سال ہونے کو آئے۔ بہار الدین ریاضؔ کی شاعری کے ابتدائی نقوش اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ انھوں نے بتدریج ترقی کی ہے اور کسب فن کے لیے مسلسل ریاض کرتے ہوئے اپنے تخلص کی لاج رکھی ہے۔ شروع سے ہی زندگی کی بابت ان کا رویہ رومانی اور جذباتی رہا ہے۔ ان کی شاعری اسی رویئے کا اظہار ہے۔ ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں وہ اپنے لب ولہجہ، اپنی فکر اور اپنے طرزِ بیان کے لحاظ سے ایک خوش آہنگ یک رنگی کا احساس دلاتی ہیں۔ ان کا لہجہ نرم، سادہ اور لطیف ہے۔ انھیں نکھرا ستھرا اسلوبِ اظہار مرغوب ہے۔ ان کی شاعری جمالیاتی ذوق کی پروردہ ہے۔ وہ زبان کی شیرینی اور چاشنی پر توجہ دیتے ہیں، لیکن اس میں کہیں تصنع، تکلف یا ظاہری آرائش کو دخل نہیں۔

بہار الدین ریاضؔ نے اکثر معروف شعراء کی مقبول غزلوں کی زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ یہ امتحان سخت ہوتا ہے، لیکن وہ دوسروں کی فکر اور لفظیات سے دامن بچانے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

ان کی نظمیں "شیشے کی دیوار" اور "ممتا" اور ان کی کئی غزلیں پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ ریاضؔ بھی اسی کرب سے دوچار ہیں، جس میں موجودہ انسان مبتلا ہے۔ اس جبر، قید، ظلم وتشدد اور انسانی زندگی کی ناقدری نے ایک ناتمامی اور غیر تکمیلیت کا احساس پیدا کر دیا ہے، جو بہار الدین ریاضؔ کے شعری رویوں پر بھی نمایاں طور پر اثر انداز ہے۔

ایک آدھ آزاد نظم کو چھوڑ کر اُن کی ساری نظمیں پابند ہیں، جن میں ردیف اور قافیے کے علاوہ بندوں کی خاص ترتیب کا بھی التزام ہے۔ ان کے یہاں جدّت واختراع کی کمی محسوس ہو سکتی ہے لیکن

وہ شاعری کے بنیادی اوصاف سے بے خبر نہیں ہیں۔

بہارالدین ریاضؔ کے یہاں جہاں اس طرح کے اشعار ملتے ہیں:

سرِ شام ہی سے بسمل دلِ بے قرار کیوں ہے
مری زندگی کا حاصل ترا انتظار کیوں ہے

ڈھونڈیں کیا چاند میں حسن اور دلکشی
چاند جیسا حسیں اِک زمیں پر بھی ہے

وہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں:

پکڑو مارو کا اِک شور مچا ہے بستی میں
فتنوں کے جنگل کا کالا ناگ گھسا ہے بستی میں

کربلا بن گئی یہ اپنی زمیں آج ریاضؔ
دیکھ تا حدِ نظر کیسا ہے مقتل پھیلا

بہارالدین ریاضؔ اپنے طریقِ اظہار کو زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا نرم اور ملائم لہجہ ان کے اندرونی غم سے ہم رشتہ ہو کر اکثر نمناک ہو اُٹھتا ہے، مگر ان کی شائستگی اور تہذیبی روایات کی پاسداری انھیں سینہ کوبی کرنے سے روکتی ہے۔ ان کی فکر اور اظہار کی سطح ہموار اور سبک ہے، جس کی اثر انگیزی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

''لالۂ صحرا'' سرزمینِ اُڑیسہ کی جانب سے اُردو دُنیا کو نیا تحفہ ہے!

(دہلی، ۸؍جنوری ۱۹۹۹ء)

○○

حسن امام درد

حصارِ درد

حسن امام درد میرے بڑے بھائی ہیں، یہ حقیقت بذات خود اتنی اہم نہیں ہے جتنی یہ کہ انھوں نے مجھے شعروادب کی جانب راغب کرنے میں بالواسطہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میرے اپنے گھر میں شعروادب کی کوئی فضا نہیں تھی۔ میری پرورش ایک قدامت پسند، مذہبی اور اخلاقی ماحول میں ہوئی۔ میرے والد برطانوی دورِ حکومت میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے سے ریٹائر ہوکر آرام وسکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ قرآن، حدیث اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ ان کے معمولات میں شامل تھا، لیکن میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی کوئی ادبی کتاب نہیں دیکھی۔ شعروشاعری سے انھیں مطلق دلچسپی نہ تھی۔ البتہ انھیں نعت کا ایک شعر گنگناتے ہوئے اکثر سنا تھا:

خدا گر محمدؐ کو پیدا نہ کرتا
خدا کی قسم ہے، خدائی نہ ہوتی

ایک دفعہ میں نے اور میرے بڑے بھائی حسن امام نے ان سے گذارش کی کہ وہ اقبال کی "بانگِ درا" منگوادیں، لیکن وہ ٹال گئے۔ میرے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب میری عمر یہی کوئی دس گیارہ سال رہی ہوگی، اور حسن امام صاحب کی اندازاً تیرہ چودہ سال۔ والد کی وفات کے بعد میرے گھر کی فضا پر نانیہالی رشتہ داروں کا اثر بڑھا۔ میرے ماموں منظور احمد نظرؔ سرتاپا شاعر تھے۔ شادؔ عظیم آبادی کے نہایت عقیدت مند شاگرد، بڑے والہانہ انداز میں شعر پڑھتے۔ قریبی گاؤں میں ہومیو پیتھک پریکٹس کرتے تھے۔ اکثر شہر آجاتے اور طویل قیام کرتے۔ ان کی دیکھا دیکھی میرے دو اور ماموں خلیل احمد اور افتخار احمد نے بالترتیب جگرؔ اور دہرؔ تخلص رکھ لیے تھے، اور مشاعروں میں کلام سنایا کرتے تھے۔ موخرالذکر کو قواعد اور کمپوزیشن سے بھی دلچسپی تھی اور انھوں نے کئی کتابیں تالیف کیں۔ مختصر یہ کہ میری نانیہال میں شعروادب کا چرچا تھا۔ ہمارے شہر دربھنگا میں نوحؔ ناروی کے شاگرد سیّد محمد کریم تمناؔ اور حکیم سوزاںؔ سہسرامی کی معرکہ آرائیاں زوروں پر تھیں۔ روایتی اور رسمی غزل گوئی سے الگ

ہٹ کر شعر کہنے والے شعرا بھی تھے۔ کبھی اقبال اور کبھی جوش کے رنگ میں شعر کہنے والے مولانا عبدالعلیم آسی کی شاعری نوجوان ذہنوں کو پسند آتی تھی۔ ان سے بھی ہماری قرابت تھی، اور ہمارے یہاں اُن کا کافی آنا جانا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں ہمارے شہر سے ایک ماہنامہ "ہمالہ" خصوصی اہتمام سے نکلا۔ اس کی ادارت کے لیے بطور خاص ش۔ مظفر پوری کو بلوایا گیا تھا، جو اس وقت نہایت ہر دلعزیز افسانہ نگار سمجھے جاتے تھے۔ اس ماحول اور فضا میں پرورش پا کر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ہی حسن امام صاحب نے دردؔ تخلص اختیار کیا اور شعر کہنے اور افسانے لکھنے لگے۔ میں انھیں اکثر کاپی میں کچھ لکھتے ہوئے دیکھتا۔ نصابی کتابوں کی طرف ان کی توجہ کم دکھائی دیتی تھی۔ اس وقت تک مجھے شعر و ادب سے نفور تھا، اور مجھے اپنے بڑے بھائی کی یہ دلچسپی ناگوار گزرتی۔ میرا خیال تھا کہ شعر گوئی اور افسانہ نگاری محض تضیع اوقات ہے اور اپنی تعلیمی ذمہ داریوں سے جی چرانا ہے۔ میں اپنی والدہ سے حسن امام صاحب کی شکایت کیا کرتا کہ وہ غیر ضروری اور غیر مناسب کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ انھیں کئی بار والدہ کی ڈانٹ بھی سننی پڑی، مگر منہ سے لگی ہوئی یہ کافر ان سے چھُٹ نہ سکی۔ میں یہ سب دیکھتا رہا، اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انھیں دنوں سالانہ نمائش کے موقعے پر ہمارے شہر میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا، جس کے لیے جگر مرادآبادی کا یہ مصرعہ بطور طرح دیا گیا تھا:

نادیدہ اِک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں

حسن امام صاحب کو مشاعرے میں تنہا جانے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ مشاعرہ گاہ ہمارے مکان سے ڈیڑھ دو کیلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور مشاعرہ حسبِ معمول رات کو ہی تھا۔ لہٰذا حسن امام صاحب نے کسی طرح مجھے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ کیا، اور پھر والدہ سے منّت سماجت کر کے اجازت حاصل کر لی۔ حسن امام دردؔ نے بھی اس طرح میں غزل کہی تھی۔ اب یہ یاد نہیں کہ مشاعرے میں پڑھی تھی یا نہیں۔ غالباً یہ پہلا مشاعرہ تھا، جس میں میری شرکت ہوئی، اور نہ جانے اس مشاعرے میں کون سا سحر تھا کہ جب میں وہاں سے واپس آیا، تو میں نے اپنے اندر بھی کچھ لکھنے کی تحریک محسوس کی۔ پہلے افسانے لکھے، پھر شعر بھی کہنے لگا۔ شاید میری پہلی غزل جگر ہی کی زمین میں تھی، جس کا ایک مصرع اوپر درج ہوا ہے۔ اگر حسن امام دردؔ مجھے اس مشاعرے میں نہ لے گئے ہوتے تو شاید میں شعر و ادب کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے دُور ہی رہتا۔

میرے ماموں خلیل احمد جگرؔ محکمہ ڈاک کی ملازمت میں تھے۔ انھیں معیاری رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ ہر مہینے دوسروں کے نام آئے ہوئے پانچ سات پرچے پوسٹ آفس سے اُڑا لاتے تھے۔ ان میں "ساقی"، "ادبِ لطیف"، "ادبی دُنیا"، "ہمایوں"، "عالمگیر"، "نیرنگِ خیال"، "شاہکار" وغیرہ

جیسے اہم ادبی رسائل شامل ہوتے تھے۔ میرے ماموں رسالے پڑھنے کے بعد ہمیں دے دیتے تھے، لیکن میرے چھوٹے ماموں افتخار احمد دہر ناصری جو اُن کے ساتھ ہی رہتے تھے، اکثر ان رسالوں کے پہلے حقدار ہوتے۔ ہماری بے صبری اور خواہشِ دید ان رسالوں کو جلد سے جلد حاصل کرنے کی ترغیب دیتیں۔ اس لیے کبھی میں اور کبھی حسن امام درد ان رسائل کو اپنے ماموں کے سرہانے سے غائب کر دیتے، جس کا اندازہ انھیں ہو جاتا، لیکن وہ اس معاملے میں کبھی برہمی کا اظہار نہ کرتے۔

میں نے اپنی ابتدائی ادبی دلچسپی کے سلسلے میں اپنے دوست منصوب حسن[1] کا ذکر اکثر کیا ہے۔ منصوب حسن دراصل حسن امام درد کے اسکول کے ساتھی تھے، اور پھر رفتہ رفتہ میرے بھی دوست بن گئے۔ عبدالعلیم آسی کی سرپرستی اور رہنمائی میں ہم لوگوں نے ''اُردو ادارہ'' کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی، جس میں مضامینِ نظم و نثر پڑھے جاتے، اور ان پر ناقدانہ اظہارِ خیال ہوتا۔ تنقید کرنے کا اختیار ہر ایک کو تھا۔ کبھی کبھی بزرگ یا سینئر شعرا ہم جیسے نوخیز ادبی رہ نوردوں کی تنقید سن کر سخت ناگواری کا اظہار فرماتے۔ اس ادارے کے پہلے سکریٹری حسن امام درد مقرر ہوئے۔ اس ادارے نے بہار کے افسانہ نگاروں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ معتبر اور نمائندہ افسانہ نگاروں کی ایک فہرست تیار کی گئی اور ہر افسانہ نگار سے اس کا بہترین افسانہ اور اس کے خودنوشت حالات اور فوٹو حاصل کیے گئے۔ اس سلسلے میں بیشتر خط و کتابت حسن امام درد نے کی۔ افسوس ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت کے لیے سرمایے کی فراہمی نہ ہو سکی۔ خود حسن امام درد بھی تلاشِ معاش میں شہر سے باہر چلے گئے۔ اس ادارے کی رپورٹیں ''نقاش'' کلکتہ اور پٹنہ کے ایک دو اخبارات میں باقاعدگی سے شائع ہوتی تھیں۔ انجمن ترقی اُردو ہند کے آرگن ''ہماری زبان'' دہلی کی یکم فروری ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں ''اُردو ادارہ'' کی ایک نشست کی رپورٹ شائع ہوئی تھی، جسے یہاں من و عن نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

> ''اُردو ادارہ در بھنگا، جو بہار کے نوجوان ادیبوں کی سرگرم انجمن ہے، اُس کی پندرہ روزہ نشست ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو جناب مظہر امام مظہر کے دولت کدے پر زیرِ صدارت جناب منصوب حسن منعقد ہوئی۔ حاضرین میں عبدالعلیم آسی، مظہر امام مظہر، منصوب حسن اور حسن امام درد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تمام حاضرینِ وقت نے اپنے اپنے تازہ نگارشات پیش کیے، جن پر فوری تنقید و تبصرہ بھی ہوا۔ اس کے بعد ادارے کی توسیع و تشہیر اور ممبروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے متعلق غور و خوض ہوا۔ خصوصاً بہار کے

---

[1] انھوں نے اپنے نام کا یہی املا اختیار کر رکھا تھا۔ اب وہ عرصے سے کراچی میں ہیں اور انھوں نے اپنے نام کے املا میں تبدیلی کر لی ہے، یعنی اب وہ منسوب حسن ہیں۔)

افسانہ نگاروں کے مجموعے کے بارے میں طے پایا کہ فروری ۱۹۴۶ء کے اوّلین ہفتے سے مجموعے کی ترتیب وتدوین شروع کردی جائے، اس کی طباعت میں زیادہ تاخیر نہ کی جائے، اور فروری تک تمام افسانے مہیا کرلیے جائیں۔"

حسن امام درؔد

سکریٹری، اُردو ادارہ، دربھنگا

حسن امام درؔد اُردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے بھی اوائل عمر سے ہی سرگرم رہے ہیں۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں مظفر پور میں سہ روزہ ترہت اُردو کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ اس کانفرنس میں عبدالعلیم آسؔی کی قیادت میں دربھنگے سے بھی ایک وفد شریک ہوا تھا، جس میں ڈاکٹر دہرؔ ناصری، حسن امام درؔد، منصوب حسن، مطیع الرحمٰن غوثی، اویس احمد دلکش وغیرہ شامل تھے۔ ضمناً یہ تذکرہ کرتا چلوں کہ مجھے بھی اس وفد کے ہمراہ جانا تھا، لیکن عین وقت پر مجھ پر تنفس کا حملہ ہوگیا، اور میں اس تاریخی کانفرنس میں شرکت سے معذور رہا۔ اس موقعے پر ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا۔ کانفرنس اور مشاعرے میں خیؔر بہوروی، عبادؔت بریلوی، روشؔ صدیقی، اخؔتر اورینوی، سلاؔم مچھلی شہری، خماؔر بارہ بنکوی، شفیؔق جونپوری، بسمؔل الٰہ آبادی، وفا براہی، دلؔ لکھنوی، مضطؔر مظفر پوری، عطاؔ کاکوی، عبدالعلیم آسی، عمیر ثاقب، ح۔م۔ اسلم (موجودہ ڈاکٹر سیّد محمد حسنین)، بیتاؔب صدیقی وغیرہ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں چودہ تجاویز بھی منظور ہوئیں، جن میں سے دو تجویزوں کے سلسلے میں حسن امام درؔد نے عملی حصہ لیا۔ "ہماری زبان" کی اشاعت ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۵ء میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق ان تجاویز کی تفصیل درج ذیل ہے:

"تجویز ۴: ترہت اُردو کانفرنس کا یہ اہم اجلاس تجویز کرتا ہے کہ اُردو کے تمام اخبارات ورسائل نستعلیق کتابت کی بجائے ٹائپ میں شائع کیے جائیں تاکہ لیتھو کی پیدا کی ہوئی دُشواریوں کا سدِّ باب ہوسکے۔

محرک: سیّد منصوب حسن، دربھنگا

موید: حسن امام درؔد، دربھنگا

تجویز ۵: ترہت اُردو کانفرنس کا یہ اہم اجلاس ضروری سمجھتا ہے کہ میتھلی زبان جو ترہت کی قدیمی ترقی یافتہ زبان ہے، اس کے شہ پاروں کو اُردو میں منتقل کیا جائے اور اس کے لیے دونوں زبان کے جاننے والے افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے، جو اس

خدمت کو انجام دے سکے۔

محرک: سید منصوب حسن، در بھنگا

موید: حسن امام درؔد، در بھنگا

ان تجویزوں پر عمل نہیں ہو سکا، لیکن ان کی معقولیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ آج سے پوری نصف صدی پہلے پیش کردہ یہ تجویزیں زبان حال سے اپنے محرک و موید کی ذہانت، بصیرت، صلاحیت اور دُور اندیشی کا اعلان کر رہی ہیں۔

حسن امام صاحب میرے بھائی ہیں۔ ہم لوگ گویا ساتھ ہی پلے بڑھے ہیں۔ ان کی زندگی کے نشیب و فراز کی بہت سی یادیں حافظے میں محفوظ ہیں، لیکن ان ساری باتوں کا ذکر یہاں بے محل ہوگا۔ البتہ ایک نقش جو میرے ذہن پر گہرا ہے، وہ ان کے ذوقِ مطالعہ سے متعلق ہے۔ ان کے پڑھنے کی رفتار مجھ سے زیادہ تیز ہے، اور ان کا انہماک بھی مجھ سے زیادہ ہوتا ہے۔ کتابیں رسالے میں حاصل کرتا تھا اور مطالعہ وہ پہلے کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں جیب خرچ کی معمولی رقم سے کوئی تازہ رسالہ بڑے شوق اور چاؤ سے ریلوے بک اسٹال سے خرید کر لایا اور اس سے پہلے کہ وہ میری تحویل میں آئے، حسن امام صاحب اسے اُچک لیتے اور اس کے مطالعے میں محو ہو جاتے۔ میں دل ہی دل میں کُوھتا رہتا، مگر احتراماً کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ بس اشک آلود آنکھوں کے ساتھ دُعا کرتا رہتا کہ انھیں جتنا بھر اور جو کچھ پڑھنا ہے، وہ جلد ختم کر لیں تا کہ میری باری آسکے۔

حسن امام درؔد کا کلام اور ان کے افسانے ہفتہ وار ”نقاش“ کلکتہ، ماہنامہ ”نغمہ و نور“ کلکتہ اور دوسرے رسالوں میں باقاعدگی سے ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء کے دوران چھپتے رہے۔ اس کے بعد وہ باقاعدگی نہ رہی، کیونکہ انھیں فکر معاش میں در بھنگا چھوڑنا پڑا۔ وہ واپس تو آئے مگر گھر کی ذمہ داریاں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ انھیں ادب کی جانب توجہ دینے کا کم موقع ملتا تھا۔ پھر ملازمتوں کے سلسلے میں وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہے۔ لیکن ان حالات میں بھی انھوں نے شاعری جاری رکھی۔ ابتدا میں ان کی شاعری سے زیادہ ان کے افسانے ہمیں متاثر کرتے تھے۔ ضیاؔ عظیم آبادی نے ملک کے نامور افسانہ نگاروں کا ایک مجموعہ ”گلابی بادے“ کے نام سے شائع کرایا تھا، جس میں اختر اورینوی، انور عظیم اور دوسرے افسانہ نگاروں کے ساتھ حسن امام درؔد کا بھی ایک افسانہ ”چیخ“ شامل تھا۔ اس مجموعے کی مرتب کی حیثیت سے ریحانہ سلطان پوری کا نام تھا۔ ”گلابی بادے“ میں حسن امام درؔد کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

”انھیں قدرت نے افسانہ لکھنے کا ایک خاص سلیقہ عطا کیا ہے، اور ان کی تحریر میں وہ

بات پائی جاتی ہے جو اکثر مشاہیر کے یہاں کمیاب ہے۔ مگر بہاری ہیں، اس لیے کبھی
اپنی شہرت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اگر یہ اپنی تحریروں سے مسلسل ملک کو روشناس
کراتے رہتے تو آج ان کا شمار بھی صفِ اوّل کے فنکاروں میں ہوتا۔"

ان کے افسانے "نقاش" کلکتہ "تجلی" کلکتہ "نغمہ و نور" کلکتہ "نئی کرن" دربھنگا "صدائے عام" پٹنہ "معاون" کلکتہ وغیرہ میں ۱۹۴۴ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیان شائع ہوئے۔ بعد میں حسن امام دردؔ نے افسانہ نگاری گویا ترک کردی۔ ۱۹۵۷ء میں ان کی ایک غزل مشہور ترقی پسند ماہنامہ "شاہراہ" میں بھی شائع ہوئی تھی۔

حسن امام دردؔ وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان کا ایک تحقیقی نوعیت کا مقالہ "متھلا اور ادب" کے عنوان سے "نقاش" کے عید نمبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ میں سمجھتا ہوں آج بھی یہ مضمون حوالوں کے لیے کام آسکتا ہے۔

اب حسن امام دردؔ اپنا شعری مجموعہ "حصارِ درد" کے نام سے منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔ وہ شعر سوچ سمجھ کر کہتے ہیں، اور خیالات کو نظم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں شروع سے ہی زندگی کے مسائل سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ دِکھائی دیتا ہے۔ وہ عشق و محبت، ہجر و وصال کے موضوعات سے اجتناب کرتے نظر آتے ہیں، ہر چند یہ ہمارے غزل گو شعرا کے مرغوب موضوعات رہے ہیں۔ اُن کی شاعری محض کیف و انبساط حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں۔ وہ اسے اصلاحِ معاشرہ کا وسیلہ بھی سمجھتے ہیں۔ اُن کے کلام میں جو سیاسی اور سماجی تبصرے ملتے ہیں، وہ قابلِ توجہ ہیں۔ ان کے افسانے بھی اس لائق ہیں کہ انھیں مرتب کر کے مجموعے کی شکل میں شائع کیا جائے۔ خدا کرے یہ افسانے یا ان کے تراشے محفوظ ہوں۔

(دہلی، ۱۹۹۹ء)

OO

خالد رحیم

جانوروں کا مشاعرہ اور بچوں کی نظمیں

بچے مستقبل کی امانت ہوتے ہیں۔ آج کا بچہ کل باپ کہلاتا ہے۔ ورڈ زورتھ کا مشہور شعری بیان ہے:

Child is the father of man

خواب اور اُمید مستقبل سے عبارت ہیں۔ اگر ہم بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی برتتے ہیں تو گویا مستقبل کو ہم ایک خطرناک راستے پر ڈالتے ہیں، جس کی منزل کھائی ہے۔ بچوں کو نکھارنا، سنوارنا، ان کی ذہنی اور تہذیبی نشو و نما میں حصہ لینا ہمارا فریضہ ہے۔

بچوں کی شخصیت کی تعمیر کے لیے ایسا ادب تخلیق کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جنھیں وہ بہ رضا و رغبت قبول کرسکیں ـــــ یعنی ایسا ادب جو اُن کے لیے موزوں ہو اور جس سے وہ با آسانی مانوس ہوسکیں، جس سے بچے تعلیمی اور تخلیقی سطح پر دلچسپی لے سکیں۔ ظاہر ہے کہ بغیر لطافت اور چاشنی کے کوئی ادب بچوں کے ذہن کے لیے قابلِ تسلیم نہیں ہوسکتا۔ بچوں کے ادب کے لیے موضوعات اور اسالیب بیان کا منتخب کرنا اُن کی نفسیات کے بنیادی عناصر سے اچھی طرح واقف ہوئے بغیر ممکن نہیں۔

اُردو ادب میں بچوں کا ادب تخلیق کرنے والوں کو درخوراعتنا نہیں سمجھا جاتا، حالانکہ بچوں کا ادب پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے بعض بنیادی مطالبات کا ذکر اُوپر کیا گیا۔ پھر لکھنے والے کو زبان و بیان پر ایسی قدرت بھی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے موضوع کو اتنے سادہ اور صاف لب و لہجہ میں پیش کرسکے کہ بچے کا غیر پیچیدہ ذہن بھی اس کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہو جائے۔

اُردو کے بہت سے برگزیدہ، مستند اور مسلّم الثبوت ادیبوں اور شاعروں نے بچوں کا ادب تخلیق کیا ہے۔ لیکن ان کے ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے عموماً اس طرح کی کوششوں کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ جن اکابرینِ ادب نے بچوں کے لیے نثر اور نظم میں اپنے تخلیقی جوہر کا جادو جگایا ہے، اُن میں مندرجہ ذیل ناموں میں سے کئی نام دیکھ کر شاید بہتوں کو حیرت ہو:

''انشاءاللہ خاں انشآ، نظیر اکبر آبادی، مرزا غالب، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، اسمٰعیل میرٹھی، اکبرالٰہ آبادی، علامہ اقبال، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، نظم طباطبائی، افسر میرٹھی، سرور جہان آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، ڈاکٹر ذاکر حسین، کرشن چندر، میرزا ادیب، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی، شفیع الدین نیر، محمد حسین حسان، جگن ناتھ آزاد، زکی انور، مظفر حنفی، مناظر عاشق ہرگانوی، نادم بلخی، علقمہ شبلی، سراج انور اور بہت سے دوسرے۔''

بچوں کے لیے روشنی پھیلانے والے ان تابندہ ستاروں میں ایک نام خالد رحیم کا بھی ہے۔ خالد رحیم بحیثیت شاعر محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ سرزمینِ اڑیسہ سے وابستہ جن شعراء نے اُردو دُنیا میں اپنی خلاقانہ قوتوں کا لوہا منوایا، ان میں خالد رحیم کا نام نمایاں ہے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''عکس در عکس'' کئی سال پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً بچوں کے لیے منظومات بھی لکھتے رہے ہیں، جن میں سے بیشتر کی اشاعت بچوں کے بعض معتبر رسالوں میں ہو چکی ہے۔ ''جانوروں کا مشاعرہ'' ان کی ایک نسبتاً طویل نظم ہے۔ بچوں کے لیے ایسی دلچسپ اور معنی خیز نظمیں کم لکھی گئی ہیں۔ شیر، مرغا، بکری، گدھا وغیرہ بحیثیت شاعر مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں۔ اُن کے اشعار اُن کی اپنی جسمانی اور فطری خصوصیات کو بڑے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان میں مزاح بھی ہے، طنز بھی اور پوشیدہ پیغام بھی۔ تخلص کے انتخاب میں بھی خالد رحیم نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے، مثلاً شیر کا تخلص گرج، مُرغے کا ککڑوں کوں، بکری کا میں، گدھے کا ڈھینچو وغیرہ۔

خالد رحیم کی ایک خصوصیت ان کی زود گوئی بھی ہے۔ وہ چلتے پھرتے شعر کہہ لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے اِس مجموعے میں شامل کئی نظمیں انھوں نے اسی بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ کہی ہیں۔ ایسی نظموں میں ''وہ بچہ ہے سب سے اچھا''، ''اسکول کی گھنٹی''، ''ببلو''، ''میری اُردو بولی'' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس مجموعے میں پانچ قوالیاں بھی شامل ہیں، جن کا الگ ذائقہ ہے۔

بچوں کے لیے نظموں کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں، اُن میں خالد رحیم کا یہ مجموعہ جو ''جانوروں کا مشاعرہ اور بچوں کی نظمیں'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے یقیناً ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

(دہلی، ۱۹۹۴ء)

OO

ڈاکٹر سیّد محمد حسنین

تلاش و جستجو

شاید بہتوں کے لیے یہ حقیقت حیرت اور دلچسپی کا باعث ہوگی کہ ممتاز نثر نگار پروفیسر سیّد محمد حسنین کی ادبی زندگی کی ابتدائی محبتوں میں شعر گوئی بھی شامل رہی ہے۔ جب جذبہ و احساس رومانویت اور جمال پسندی کے پروردہ ہوں تو شعری محرکات اپنا وسیلۂ اظہار خود تلاش کر لیتے ہیں، خواہ وہ نظم کی صورت میں ہو یا نثر کی شکل میں۔

یہ بات بھی شاید اب کم لوگوں کو یاد ہوگی کہ پروفیسر سیّد محمد حسنین جو اپنے تحقیقی کام اور خصوصاً اپنی انشائیہ نگاری اور فن انشائیہ سے اپنے شغف کی بنا پر پہچانے جاتے ہیں، ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا تھا۔ بچوں کے لیے لکھی ہوئی ان کی ایک طویل کہانی کتابی صورت میں "ثریا کا خواب" کے عنوان سے ۱۹۴۲ء میں ہی، جب وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے، شائع ہو گئی تھی۔ ان کی یہ کہانی لیوس کیرول کی مشہور تصنیف "ایلس اِن ونڈر لینڈ" (Alice in Wonderland) سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ پروفیسر سیّد محمد حسنین ان دنوں ح۔م۔ اسلم عظیم آبادی تھے اور اسی نام سے ان کا پہلا باقاعدہ افسانہ "جب رات کے گیارہ بجے تھے" ماہنامہ "ندیم" گیا میں ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ ح۔م۔ اسلم کے افسانے کلیم الدین احمد کے "معاصر" میں اشاعت کے سبب محدود سنجیدہ حلقے میں توجہ کے ساتھ پڑھے گئے۔ "دولن بھابھی" ان کے مقبول افسانوں میں سے ہے۔ "اور جب روشنی ہوئی" ("عصرِ جدید" کلکتہ، سلور جوبلی نمبر، ۱۹۴۵ء) کا شمار بھی ان کے کامیاب افسانوں میں ہوتا ہے۔ غالباً ۱۹۵۰ء کے بعد ان کا کوئی افسانہ شائع نہیں ہوا۔ وہ اپنے تحقیقی مقالے کے سلسلے میں مصروف ہو گئے۔ پھر انشائیہ ان کا خاص موضوع بن گیا۔ ان کا کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ البتہ مئی ۱۹۶۸ء میں شائع شدہ ان کی کتاب "نیلِ مرام" میں، جو افسانوں، انشائیوں اور رپورتاژ پر مشتمل ہے، ان کے سات افسانے شامل ہیں۔ غالباً ان کے افسانوں کی مجموعی تعداد اتنی ہی ہے۔ بر سبیل تذکرہ "کہانوی ادب" کی اصطلاح ان کی اختراع ہے۔ مجھے ہمیشہ اس سے اختلاف رہا اور میں نے ان سے ذکر بھی

کیا، مگر ان کا کہنا تھا کہ مجھے اس کے غلط ہونے کا احساس ہے، مگر اس میں جو معنوی وسعت ہے، وہ "افسانوی ادب" میں نہیں۔ تحقیق کی طرف ان کا جھکاؤ، ظاہر ہے، منصبی اور پیشہ ورانہ ضرورت کے تحت رہا ہوگا، لیکن انھوں نے اپنے تحقیقی کام میں جس انہماک، دلجمعی اور دقت نظری کا ثبوت دیا، اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ انھوں نے مرزا محمد علی فدوی پر جو تحقیقی مقالہ سپرد قلم فرمایا، وہ ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس مقالے پر انھیں پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ سید محمد حسنین کو ریاست بہار میں اُردو کے پہلے "ڈاکٹر" ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ڈاکٹر حسنین کے ادبی دائرۂ کار میں شخصی خاکہ نگاری کی بھی خاص اہمیت رہی ہے۔ انھوں نے بعض شخصیتوں کے بڑے خوبصورت مرقعے پیش کیے ہیں۔ ان میں اختر اورینوی، پروفیسر فضل الرحمٰن، شکیلہ اختر، قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد اور فخر الدین علی احمد خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سیّد محمد حسنین کسی ایک موضوع، ایک صنف یا ایک ادبی جہت پر بند نہیں رہے۔ خوب سے خوب تر کی جستجو اور نئے جہانوں کی دریافت ہمیشہ ان کا مطمحِ نظر رہا۔ انشائیہ سے دلچسپی پیدا ہوئی تو اسے حرزِ جاں بنالیا۔ نہ صرف خود خوبصورت انشائیے لکھے بلکہ اس صنف کی تاریخ اور تنقید کو بھی اپنے مطالعے اور نتائج فکر کا محور بنایا۔ انھوں نے اُردو کے بہترین انشائیوں کا ایک نہایت جامع انتخاب بھی کیا اور ان سب پر مشتمل ایک نہایت وقیع کتاب "انشائیہ اور انشائیے" کے نام سے پیش کی جو مختلف جامعات کے نصاب میں شامل ہے اور جس کے اب تک پانچ سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ مختلف وقتوں میں افسانہ، تمثیل، شاعری، خاکہ، انشائیہ، رپورتاژ، تنقید و تحقیق ڈاکٹر سیّد محمد حسنین کی ادبی اور علمی سرگرمیوں کے جولاں گاہ رہے۔

ڈاکٹر سیّد محمد حسنین کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد گیارہ ہے۔ ان میں سے ساہتیہ اکیڈمی کا شائع کردہ اختر اورینوی پر مونوگراف انگریزی میں ہے۔ زیر نظر کتاب "تلاش و جستجو" ان کی بارہویں تصنیف ہے۔ ان کے علاوہ اُن کا تحقیقی مقالہ "مرزا محمد علی فدوی: عصر، حیات، شاعری اور کلام" دو جلدوں میں ہے۔ ڈاکٹر حسنین کا ایک بڑا کارنامہ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام مولانا شبلی نعمانی کے خطوط کی تدوین ہے جو خود شبلی کی تحریر میں شائع کیے گئے ہیں۔ انھوں نے نظیر اکبرآبادی کی سوانح حیات مرتبہ عبدالغفور شہباز کی تدوین بھی کی ہے۔ ڈاکٹر حسنین نے مشہور تاریخ داں اور محقق پروفیسر سیّد حسن عسکری کے مقالات بھی مرتب کر کے شائع کرائے ہیں۔ "انشائیہ اور انشائیے" کا ذکر پہلے آچکا ہے جو ان کی سب سے مقبول تالیف ہے۔ افسوس ہے کہ ان کی اچانک اور غیر متوقع موت نے انھیں اپنے کئی ادھورے کاموں کو مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ایسے مضامین کی بھی بڑی تعداد ہے جو

رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی بیگم ڈاکٹر نوشابہ حسنین نے ان مضامین کو مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کرانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ "تلاش و جستجو" انھیں کی مرتب کردہ کتاب ہے، جس سے ان کی محنت اور ذوق لطیف کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حسنین کے مضامین کا ایک اور مجموعہ "خس و خار" کے نام سے انھوں نے مرتب کر لیا ہے، جو زیر اشاعت ہے۔

جن برگزیدہ شخصیتوں نے ڈاکٹر سید محمد حسنین (یا ح۔م۔ اسلم عظیم آبادی) کی کتابوں کے پیش لفظ یا تعارف لکھے، ان میں رشید احمد صدیقی، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، احتشام حسین، شکیلہ اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر مختار الدین احمد، پروفیسر نور الحسن اور خلیق احمد نظامی جیسے نام شامل ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین نے درس و تدریس کا کام جس ڈسپلن، جس نظم و ضبط، جس سلیقہ اور جس عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ کیا، اس کی مثال آج کے جامعات میں مشکل سے ملے گی۔ انھوں نے اپنے پیش رووں میں پروفیسر فضل الرحمٰن، پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر اختر اورینوی جیسے مستند اساتذہ کی نہ صرف آنکھیں دیکھی تھیں بلکہ ان کے پُر وقار طریقۂ تعلیم اور خطبات سے بہرہ یاب بھی ہوئے تھے۔ انھیں درس و تدریس کے معیاروں کا احساس بھی تھا اور براہِ راست تجربہ بھی۔ انھوں نے اپنے شعبے میں ویسی ہی فضا قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین نے اپنی پوری زندگی اُردو زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنے اور فروغ دینے میں گزاری۔ اب ایسے بے ہمہ اور باہمہ، اپنے کام سے مخلص، تن من دھن سے کام کرنے والے شاید آئندہ پیدا نہ ہوں۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو اپنی زندگی کا کوئی لمحہ فروعی باتوں میں ضائع نہیں کرتے اور جن کا ہر لمحہ قیمتی اور فیض رساں ہوتا ہے!

(دہلی، ۲۰۰۲ء)

OO

سیماب سلطان پوری

کھلا آکاش

سیماب سلطان پوری کا نام آتے ہی دہلی کے سب سے زیادہ فعّال، سب سے زیادہ زندہ، سب سے زیادہ متحرک ادبی ادارے "حلقۂ تشنگانِ ادب" کا خیال پردۂ ذہن پر کوندے کی طرح لپکتا ہے۔ یہ ادارہ گذشتہ چھتیس سال سے مسلسل سرگرمِ عمل ہے، اور ہر ماہ اپنی شعری نشست الگ الگ صاحبِ ذوق کے یہاں منعقد کرتا ہے، تاکہ اس پھیلے ہوئے شہر کے ہر علاقے میں شعروادب کی روشنی پہنچتی رہے۔ اب تک اس ادارے کی جانب سے ساڑھے تین سو سے زیادہ نشستیں منعقد ہو چکی ہیں۔ سیماب سلطان پوری پچھلے چھبیس ستائیں سال سے اس حلقے کے سکریٹری ہیں۔ لیکن رسمی عہدیدار نہیں۔ وہ اس حلقے کی رُوح ورواں ہیں۔ سب کو ساتھ لے کر چلنا اور ہر ماہ چالیس پینتالیس شعراء کو محض ان کے ذوق اور اُردو زبان سے ان کی محبت کی بنا پر جمع کر لینا، سیماب کا ایسا کارنامہ ہے جس کی کوئی اور مثال کم از کم مملکتِ ہند کے دارالخلافہ میں نہیں ملتی۔

سیماب کا اصل نام دھرم ویر دھیر ہے۔ ان کا تعلق ریاست کپورتھلہ کے سلطان پور لودھی سے ہے۔ اب یہ پنجاب میں کپورتھلہ ضلع کا حصہ ہے۔ اسی مناسبت سے وہ اپنے آپ کو سیماب سلطان پوری کہتے ہیں۔ اُن کا تعلق مجروحؔ صاحب کے سلطان پور سے نہیں، جو اُتر پردیش میں ہے۔

سیماب سلطان پوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل کے موضوعات اور مضامین بڑی حد تک متعین ہیں۔ غزل گو شاعر اپنے لہجے اور اسلوب سے پہچانا جاتا ہے۔ سیماب جو کچھ بھی کہتے ہیں، اسے بہ اندازِ دیگر کہنے کی کوشش کرتے ہیں، کہیں رمزیہ لہجہ اختیار کر کے، کہیں بیان کو ایک نیا زاویہ دے کر۔ ان کے شعری مزاج میں ایک نرمی اور نفاست ہے، جو صرف ریاضت، مشق اور بالیدہ شعری شعور سے نہیں آتی، بلکہ اس میں افتادِ طبع اور اسلوبِ حیات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ ان کی غزل پڑھتے ہوئے تازگی اور تازہ دمی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں کبھی کبھی اظہار کی ایسی بے ساختگی در آتی ہے کہ سننے یا پڑھنے والا چونک اُٹھتا ہے۔ اظہار کی یہ غیر متوقع کیفیت ایک ایسے اہتزاز سے دوچار کرتی ہے

جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے:

مٹھی میں لے کے خاک ہوا میں اُچھال دی
ایسی نہ زندگی کی کسی نے مثال دی

مسافر کا سفینے سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا وہ دریا پار کرتے ہی سفینہ چھوڑ جاتا ہے

سچ بولنا چاہیں بھی تو بولا نہیں کرتے
اس دَور میں آئینے بھی ایسا نہیں کرتے

مجھے عادت ہے دامن تھامنے کی مگر یہ شہر ہے پر چھائیوں کا

اسے ہی حق ہے ترے حسن کو بیان کرے
کہ جس نے شاخ پہ کِھلتا گلاب دیکھا ہے

ایسے گزر گیا وہ مجھے دیکھتا ہوا جیسے میں آدمی نہ ہوا حادثہ ہوا

چند رِشتوں میں ہی محدود نہ ہو کر رہ جاؤں
اس قدر چاہو نہ اے چاہنے والو! مجھ کو

اب تو ہر بھیس میں لگتی ہے یہ عریاں عریاں اپنی تہذیب کی کیا شکل بنا دی ہم نے

جینے مرنے کے لیے کچھ تو بہانہ چاہیے
ڈھونڈ لا ایسی پریشانی کہ جس کا حل نہ ہو

بہت چھوٹا سا مٹّی کا دِیا ہوں میں سورج ڈوبنے پر جاگتا ہوں

مرا مزاج ہے خوشبو ، سفر مری منزل
ہوا چلے تو میں گھر میں کہاں ٹھہرتا ہوں

جس نے آنکھوں سے سمندر نہیں دیکھا اب تک کیسی تشریح کیے جاتا ہے گہرائی کی

یہ سوچ نام کی لڑکی ہے یوں تو آوارہ
ذرا سا چھو لو تو کیسی چھوئی موئی سی لگے

نہ کر مجبور کچھ بھی مانگنے پر اے خدا مجھ کو مجھے خاموش رہنے دے، تجھے شرمندگی ہوگی

نازک نگاہ ہم سا نہیں کوئی دہر میں
پھولوں پہ دیکھ لے جو ہوا کے نشان بھی

سیماب سلطان پوری زندگی کے منفی پہلوؤں سے آشنا ہیں، اور ان کا اظہار کرنے میں کسی تامل سے کام نہیں لیتے، لیکن وہ زندگی کے ناروا اور نامساعد رویوں کے مرثیہ خواں نہیں۔ اُنھوں نے زندگی کو جس طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے، اسی طرح انھیں شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ سیماب حیاتِ انسانی کی خوبصورت قدروں کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری انسان دوستی اور انسانیت سے محبت کی نقیب ہے۔ نامناسب حالات میں زندگی کرنے کا ولولہ، گردوپیش کے جبر و استحصال سے نبرد آزما ہونے اور اپنی دُنیا آپ بنانے کا حوصلہ، ان کی شاعری کے طربیہ عناصر ہیں۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے:

میں اِک چراغ لاکھ چراغوں میں بٹ گیا
رکھا جو آئینوں نے کبھی درمیاں مجھے

دریا ہوں، آرزو ہے سمندر سے جا ملوں
رکھتی ہے میری تشنہ لبی ہی رواں مجھے

جب دِلوں کے رنگ ملتے ہوئے ہوں تو ہم رشتگی استوار ہوتی ہے۔ خاموشی، گفتگو اور دل کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ انسانی اخوّت اور محبت بھی اسی منزل پر کامیاب و بامراد ہوتی ہے۔ سیماب کہتے ہیں:

دیر تک اِک دوسرے کے ساتھ ہم چلتے رہے
میں نے سب کچھ سن لیا، اس نے کہا کچھ بھی نہیں

جب انسان دوسروں کے دُکھ درد کو اپنے دل میں سمیٹ لیتا ہے تو اس کے وجود کی معنویت نکھر آتی ہے۔ دوسروں کے پتوں سے اپنا پتہ دریافت کرنا بھی عرفان ہی کی ایک منزل ہے:

میں نے دیکھا ہے بیاضِ زندگی کو غور سے
سب کے ہیں اس میں پتے، میرا پتہ کچھ بھی نہیں

سیماب سلطان پوری کی شاعری میں سنجیدگی، متانت، توازن اور تہذیب اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کے آمیزے سے اکثر اشعار ہمیں ایک خاص طرح کے جمالیاتی کیف سے ہم کنار کرتے ہیں۔ دل لہو ہو تو زندگی حنا رنگ ہوتی ہے، اور خود کو جلا کر مٹّی کا معمولی دِیا بھی سورج بن جاتا ہے:

دل لہو ہو تب ہی جلتا ہے ہتھیلی پر چراغ
سبز پتوّں کے سوا ورنہ حنا کچھ بھی نہیں

ہو اگر روشن تو بن جاتا ہے سورج رات کا
ورنہ اے سیماب! مٹّی کا دِیا کچھ بھی نہیں

''چراغ'' اور ''دِیا'' اُردو شاعری کے مانوس استعارے ہیں، جو زندگی اور اس کے تحرک، اس کی

مزاحمت اور مقاومت کی علامت ہیں۔ جمیل مظہری کا مشہور شعر ہے:

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی

آج کے شاعر عرفان صدیقی نے ایک حقیقی لیکن حوصلہ افزا رویہ اختیار کیا ہے:

رات کو جیت تو سکتا نہیں، لیکن یہ چراغ
کم سے کم رات کا نقصان بہت کرتا ہے

سیماب سلطان پوری ایک حساس شاعر ہیں۔ ان کے باطن کی آواز ان کے کلام میں سنائی دیتی ہے۔ وہ زندگی کو بہتر شکل میں دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ ان کے تجربات و مشاہدات نے انھیں دل برداشتہ نہیں کیا، بلکہ انھیں ایک نئی تاب و توانائی عطا کی ہے۔ وہ زندگی کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں کے شاعر نہیں۔ وہ حیات کی رنگارنگی کو اپنی تمام وسعتوں اور گہرائیوں سمیت دیکھتے ہیں۔ مسرّت اور رنج ان کی شاعری میں گلے ملتے نظر آتے ہیں۔

سیماب کے یہاں کلاسیکی رکھ رکھاؤ بھی ہے اور نیا رنگ و آہنگ بھی۔ دونوں کے امتزاج اور اشتراک سے اُنھوں نے اپنے لیے ایک ایسا راستہ نکالا ہے جو فوری طور پر متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں ایک سنبھلا ہوا لہجہ ملتا ہے۔ وہ الفاظ کے جمالیاتی دروبست کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اپنے جذبات، احساسات اور تجربات کو خوش آہنگی کے ساتھ شعری جامہ پہنانا سہل نہیں۔ سیماب سلطان پوری یہ کارِ مشکل آسانی سے انجام دیتے ہیں۔

سیماب کا ایک مجموعۂ کلام ''عکس بر آب'' کئی سال پہلے شائع ہوا تھا، اور سنجیدہ ادبی حلقوں میں اس کی خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔ ان کے نئے مجموعے ''کھلا آکاش'' کا نام بڑا معنی خیز ہے۔ یہ آگے کا قدم ہے۔ یقیناً یہ مجموعہ نئے اور وسیع تر آفاق کی نشان دہی کرے گا۔

(دہلی، ۲۰۰۳ء)

○○

ضیاءالرحمٰن غوثی

بہار میں بچوں کا ادب: آزادی کے بعد

بچوں کے ادب یا ادبِ اطفال کی اہمیت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہیں۔ ہر چند اب بھی اُردو ادب میں اسے وہ مرتبہ حاصل نہیں ہے جو اس کا جائز حق ہے۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لیے تخلیقی صلاحیت، تجربہ، مشاہدہ، بچوں کی نفسیات اور ان کی پسند اور ناپسند سے واقفیت کے ساتھ ساتھ زبان پر دستگاہ بھی ضروری ہے۔ یعنی ایسی زبان لکھنے پر قدرت، جو نہ صرف یہ کہ بچوں کی ذہنی سطح سے مطابقت رکھے، بلکہ ان کے ذہن و شعور کو جلا بھی دے سکے۔ یہ پہلے ہی تسلیم کرنا ہوگا کہ بچوں کا ادب تفریحی ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحی بھی ہوتا ہے۔ یعنی یہ ادب بچوں کو ایک بہتر انسان بننے میں مدد کرتا ہے۔ اُن میں بے خوفی، محبت، انسانیت، حب الوطنی، رواداری، ہمّت اور حوصلہ پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ ایسے ادب کی تخلیق بچوں کی فطری وابستگیوں، ان کی نفسیاتی ضرورتوں اور ان کے جبلّی تقاضوں کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ بچوں کے لیے لکھتے وقت ان کی دلچسپی کا لحاظ رکھتے ہوئے تخیل کے ذریعے نئے نئے رنگوں کی آمیزش کرنی پڑتی ہے۔ بچوں کے جذبۂ تجسس کو آسودہ کرنا بھی ایسے ادب کا خاص مقصد ہونا چاہیے۔

بچوں کو نکھارنا، سنوارنا، ان کی ذہنی اور تہذیبی نشو و نما میں حصہ لینا ہمارا فریضہ ہے۔ بچے مستقبل کی امانت ہیں اور آنے والے زمانے کی تعمیر انھیں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لیے ان کی مناسب تربیت کرنی اور انھیں صحیح راستہ دکھانا بھی ادبِ اطفال کی ذمہ داری ہے۔ انھیں صرف وہی نہیں دینا ہے جسے وہ پسند کرتے ہیں، بلکہ انھیں وہ بھی دینا ہے جو اپنی ناسمجھی کی بنا پر انھیں پسند نہیں۔ مرض کے علاج کے لیے کڑوی گولی بھی کھلانی پڑتی ہے، لیکن بچوں کو ایسی دوا شکر کے ساتھ ملا کر کھلانی چاہیے۔ بچوں کے ادب میں پیغام کی آمیزش ہوتی ہے، لیکن پیغام ادب میں اس طرح چھپا ہوا ہونا چاہیے جس طرح پھول میں خوشبو۔

بچوں کے لیے یا ان کی ذہنی سطح کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہمارے برگزیدہ ادیبوں اور شاعروں

نے بہت سی قابلِ قدر تخلیقات پیش کی ہیں۔ان میں نظیر اکبر آبادی، غالبؔ، محمد حسین آزاد، حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد، اقبالؔ، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الٰہ آبادی، تلوک چند محرومؔ، چکبستؔ، حفیظ جالندھری، دُرگا سہائے سرورؔ، امتیاز علی تاجؔ، عظیم بیگ چغتائی، ڈاکٹر ذاکر حسین، کرشن چندر، شفیع الدین نیر، جگن ناتھ آزاد جیسے نام شامل ہیں۔فہرست مکمل نہیں ہے۔اس میں کئی اور بڑے نام بہ آسانی شامل کیے جاسکتے ہیں۔

نظیر اکبرآبادی چوں کہ خود معلّم تھے، اس لیے انھوں نے تدریسی ضرورتوں کے تحت کئی مقبول نظموں مثلاً ''گلہری کا بچہ''، ''تربوز''، ''کنکورے اور پتنگ'' وغیرہ کی تخلیق کی۔ مرزا غالبؔ نے ایک طویل نظم ''قادر نامہ'' اپنے بھانجے زین العابدین عارف مرحوم کے بیٹوں کی تعلیمی ضرورت کے لیے لکھی۔اقبالؔ کی نظموں ''ایک گائے اور بکری''، ''ایک پہاڑ اور گلہری''، ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، ''ترانہ ہندی''، ''بچے کی دعا'' وغیرہ سے کون واقف نہیں۔ حفیظؔ جالندھری کی تصنیف ''عمر عیار'' بہت مقبول ہوئی۔ان کی منظومات میں ''بول میرے مرغے''، ''چڑیا چڑے کی کہانی''، ''عید کا دن''، ''شبِ برات''، ''دیوالی'' وغیرہ مشہور ہیں۔ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی کہانی ''ابو خاں کی بکری'' کے حوالے سے خاص پہچان رکھتے ہیں۔کرشن چندر کی ''ایک گدھے کی سرگزشت'' کو کلاسیکی درجہ حاصل ہے۔

بچوں کے لیے بِہار کے لکھنے والوں میں عبدالغفور شہبازؔ، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، زکی انور، شکیل الرحمٰن، نادم بلخی، ضیا عظیم آبادی، علقمہ شبلی، انجم جمالی، رضوان رضوی، مناظر عاشق ہرگانوی، ناوک حمزہ پوری، م۔ق۔خاں، قمر زاہدی، تمنا مظفر پوری، فراغ روہوی وغیرہ کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔جمیل مظہری کی نظم ''گلو بابو'' ایک معرکتہ الآرا نظم ہے۔ اُنھوں نے لوریاں بھی لکھی ہیں۔ح۔م۔اسلم عظیم آبادی (پروفیسر سیّد محمد حسنین) نے ''ثریا کا خواب'' کے عنوان سے بچوں کے لیے ایک طویل کہانی ۱۹۴۲ء میں شائع کرائی تھی۔یہ کہانی لیوس کیرول کی مشہور تصنیف ''ایلس اِن ونڈرلینڈ (Alice in Wonderland) سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ میں بھی بچوں کے لیے وقتاً فوقتاً نظمیں، غزلیں اور مضامین لکھتا رہا ہوں۔ بِہار میں بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے والوں کی تعداد کبھی کم نہیں رہی ہے۔

ضیاء الرحمٰن غوثی اوائل عمر سے ہی ادب اور صحافت سے وابستہ رہے ہیں۔ادبی اور صحافتی ذوق انھیں اپنے والد جناب مطیع الرحمٰن غوثی سے ورثے میں ملا۔ضیاء الرحمٰن نے کم عمری میں ہی اپنے گاؤں جروعہ (حاجی پور، بہار) سے بچوں کا ایک قلمی رسالہ نکالا۔ادبِ اطفال سے ان کی خاص دلچسپی کے اظہار کا پہلا باقاعدہ نمونہ ماہ نامہ ''مسرّت'' کی صورت میں ظاہر ہوا جو ۱۹۶۶ء میں پٹنہ سے نکلا اور ۱۹۶۹ء تک جاری رہا۔غوثی اس رسالے کے مالک، مدیر، پرنٹر پبلشر سب کچھ تھے۔''مسرّت'' ہر چند

بچوں کا رسالہ تھا، لیکن اس کے قلمی معاونین میں بہت سے معروف قلم کار شامل تھے۔ جہاں تک یاد آتا ہے "مسرت" میں میری بھی ایک نظم اور میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔

مکروہات زمانہ کے باوجود ضیاء الرحمٰن غوثی کی دلچسپی بچوں کے ادب سے برقرار رہی۔ اسکول میں تدریسی خدمات انجام دینے کے باعث انھیں بچوں کی نفسیات اور ان کی پسند ناپسند کا اندازہ ہوا۔ وہ طویل عرصے تک بہار ٹکسٹ بک کارپوریشن کے شعبۂ اُردو سے وابستہ رہے، اور اس طرح انھوں نے بچوں کی نصابی کتب کی ترتیب، ادارت اور اشاعت کا عملی تجربہ حاصل کیا۔ ادب اور صحافت کے تعلق سے ان کے تجربات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ وہ کم و بیش تیس سال تک دہلی ایڈمنسٹریشن میں انفارمیشن آفیسر، پھر حکومت دہلی میں ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن اور اس کے ماہانہ رسالے "دِلّی" کے ایڈیٹر رہے۔ اس دوران میں اخباروں اور رسالوں کے لیے باقاعدگی سے لکھتے رہے اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی ان کی بات چیت نشر ہوتی رہی۔ بچوں کے تعلق سے ذکی احمد کی نظموں کا مجموعہ "جھولا" اور کرن شبنم کی کہانیوں کا مجموعہ "پھلواری" انھیں کی نگرانی میں شائع ہوا۔ انھوں نے کرن شبنم کے اشتراک سے بچوں کے لیے ایک معلوماتی کتاب "رادھا اور رفیق" کے نام سے تالیف کی جو قومی یک جہتی کے فروغ کے سلسلے میں ایک قابلِ تحسین کوشش ہے۔

اور اب ضیاء الرحمٰن غوثی نے "بِہار میں بچوں کا ادب: آزادی کے بعد" کے عنوان سے ایک عمدہ کتاب تصنیف کی ہے۔ یہ اپنے موضوع پر اُردو میں واحد کتاب ہے، اور اپنی نوعیت کی پہلی کوشش۔ یہ کوئی مبسوط تحقیقی مقالہ نہیں ہے، لیکن اس موضوع پر آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لیے بنیادی مواد ضرور فراہم کرتا ہے۔ سادہ لیکن دلکش اسلوب میں لکھی ہوئی یہ کتاب زیادہ سے زیادہ پذیرائی کی مستحق ہے۔

(دہلی، ۲۰۰۳ء، اشاعت کتاب: ۲۰۰۵ء)

OO

عبدالمنان طرزی

رفتگاں وقائماں

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت پرانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا فروغ اٹھارویں صدی عیسوی میں ہوا۔ بیشتر تذکرے شعراء کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کے نمونوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ تیقن سے یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو کا سب سے پہلا تذکرہ کس نے لکھا۔ مرزا محمد رفیع سودا، خان آرزو، محمد یار خان خاکسار وغیرہ کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے اردو شعراء کے تذکرے مرتب کیے تھے۔ مگر ان کے مسودے/مخطوطے کہیں دستیاب نہیں ہیں۔ جو تذکرے موجود ہیں ان میں میر کے ''نکات الشعراء''، حمید اورنگ آبادی کے ''گلشن گفتار'' اور قائم چاند پوری کے ''مخزنِ نکات'' کو اوّلیت حاصل ہے۔ اب عام طور پر ''نکات الشعراء'' کو اردو کا پہلا موجود تذکرہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ گارساں دتاسی، محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ اسی رائے کے حامی ہیں۔ دستیاب عمدہ تذکروں کی فہرست طویل ہے۔ لکشمی نرائن شفیق کا ''چمنستان شعراء''، میر حسن کا ''تذکرہ شعرائے اردو''، علی ابراہیم خلیل کا ''گلزار ابراہیم''، مصحفی کا ''تذکرہ ہندی گویاں'' اور میرزا علی لطف کا ''گلشن ہند'' عام طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔

تذکروں میں کہیں کہیں جو تنقیدی اشارے ملتے ہیں انھیں قصرِ تنقید کے خشت اول کی حیثیت حاصل ہے۔ ان تذکروں کے حوالے اب بھی اسناد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب کی تاریخ لکھنے کا رواج بعد میں ہوا۔ محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' تذکرہ اور تاریخ کی درمیانی کڑی ہے۔ ہمارے یہاں معتبر ادبی تاریخیں بہت کم ہیں۔ ''گل رعنا'' (مولوی عبدالحیٔ) ''تاریخ ادب اردو'' (رام بابو سکسینہ/ مرزا محمد عسکری) ''شعرالہند'' (عبدالسلام ندوی) ''خم خانہ جاوید'' (لالہ سری رام) ''تاریخ ادب اردو'' (ڈاکٹر جمیل جالبی) وغیرہ کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ کچھ مختصر تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں۔ جن میں ''مختصر تاریخ ادب اردو'' (ڈاکٹر اعجاز حسین) ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' (پروفیسر احتشام حسین) ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' (ڈاکٹر سلیم اختر) اور ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' (ڈاکٹر انور سدید)

مقبول ہیں۔ مؤخر الذکر چونکہ بعد میں لکھی گئی ہے، اس لیے زیادہ جامع ہے۔ صوبائی، علاقائی سطح پر بھی کچھ ادبی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، کیونکہ ادبی تاریخوں پر سردست گفتگو مقصود نہیں ہے۔

دربھنگہ کی علاقائی زبان میتھلی ہے اور یہیں وِدیاپتی جیسا بلند مرتبت شاعر پیدا ہوا جسے ہندوستان کے عظیم ترین شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس علاقے میں کئی سو سال سے اردو نہ صرف بول چال کی زبان رہی ہے بلکہ اس زبان میں علمی اور ادبی کام بھی باقاعدگی سے ہوتا رہا ہے۔ خصوصاً شعر و شاعری کا چرچا ہمیشہ رہا ہے اور یہاں کئی باکمال شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ آج بھی کئی شاعر ملک گیر شہرت رکھتے ہیں۔ شمالی بہار کے مرحوم اردو شاعروں کا ایک عمدہ تذکرہ شاداں فاروقی نے ''بزم شمال'' کے نام سے کئی سال پہلے شائع کرایا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ جو زندہ شاعروں پر مشتمل ہے، عرصے سے محتاج اشاعت ہے۔

ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نے شمالی بہار کے ایک اہم علاقے ''دربھنگہ'' (یعنی وہ وسیع ''قدیم دربھنگہ'' جس میں سمستی پور اور مدھوبنی کے موجودہ اضلاع بھی شامل ہیں) کی ادبی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ اب تک نثر میں بھی دربھنگے کا کوئی ادبی تذکرہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ''رفتگاں و قائماں'' دربھنگے کا پہلا اُردو تذکرہ ہے جسے عبدالمنان طرزی نے قلم بند کیا ہے اور وہ بھی نظم میں۔ مجھے اردو کے کسی منظوم تذکرے کا علم نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پروفیسر عبدالمنان طرزی کا تذکرہ ''رفتگاں و قائماں'' خاص اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ اسے باقاعدہ تذکرہ کہنا شاید مناسب نہ ہو، اسے ایک طرح کی منظوم تعارفی ڈائرکٹری کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ جو حواشی ہیں وہ اچھے خاصے تفصیلی اور معلوماتی ہیں اور ان کی بناء پر اسے تذکرہ تسلیم کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہونا چاہیے۔

قریباً چوبیس سو اشعار، ردیف اور قافیے کی پابندی کے ساتھ، ایک ہی بحر میں، مثنوی کی ہیئت میں، لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ طرزی نے واقعی محنت کی ہے۔ یہ قابل لحاظ کام ہے اور ہر اعتبار سے لائق ستائش ہے۔ مجھے اس کی دیرپاپذیرائی کا یقین ہے۔ ''رفتگاں و قائماں'' زندہ رہنے والی کتاب ہے۔

(دہلی، ۲۷ر ستمبر ۲۰۰۱ء)

OO

وہاب اشرفی

تاریخِ ادبیاتِ عالم

وہاب اشرفی کو میں اس وقت سے جانتا ہوں، جب وہ کلکتہ میں بی اے کے طالب علم تھے اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ ان کی ابتدائی محبتوں میں شامل تھا۔ انھوں نے ٹینی سن کی مشہور نظم "Enoch Arden" کا ایک خوبصورت ترجمہ انھیں دنوں کیا تھا، جسے میں نے اپنے تعریفی نوٹ کے ساتھ کلکتہ کے ماہ نامہ ''معاون'' میں چھاپا تھا جس کی ادارت کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ وہاب اشرفی کی ذہانت و فطانت، ذوق لطیف اور حسِ مزاح نے مجھے شروع سے ہی متاثر کیا اور عمر کے تفاوت کے باوجود ان سے جو دوستانہ بے تکلفی قائم ہوئی وہ آج تک برقرار ہے۔

وہاب اشرفی نے ادبی، علمی اور تدریسی محاذ پر کامیابی کی منزلیں تیزی سے طے کیں اور اب ان کا شمار موجودہ دور کے معدودے چند معتبر نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ''قدیم ادبی تنقید'' کے ''پیش لفظ'' میں کلیم الدین احمد نے انھیں دادِ سخن دی ہے اور اپنے تحقیقی مقالے ''شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری'' کی داد وہ قاضی عبدالودود جیسے سخت گیر محقق سے بھی پا چکے ہیں۔

وہاب اشرفی کے علمی اور ادبی اکتسابات کا دائرہ وسیع ہے۔ وہ انگریزی، اُردو اور فارسی ادبیات میں ایم اے ہیں۔ ان کے حریف بھی انگریزی ادب کے باب میں ان کی وسعت مطالعہ کے قائل ہیں۔ اُردو کے اساتذہ میں ان کی اہمیت مسلم ہے اور فارسی میں ان کی دستگاہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی وجہی کی ''قطب مشتری'' کے جائزے پر مشتمل ایک مختصر کتاب لکھی تھی جس پر بعد میں اضافہ ہوتا رہا اور اب اس کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعے ''معنی کی تلاش'' (۱۹۷۸ء) سے پہلے ہی تنقید نگاروں کی پہلی صف میں جگہ بنالی تھی۔ اپنا مشہور مضمون ''افسانے کا منصب'' انھوں نے اس وقت لکھا جب فن افسانہ کو دوسرے درجے کی صنف قرار دیا جارہا تھا۔ وہ ''کنکریٹ (Concrete) شاعری'' اور ''نثری شاعری'' پر اظہارِ خیال کرنے والے اوّلین ناقدوں میں ہیں۔ بلکہ ''کنکریٹ شاعری'' پر

اب تک اُردو میں وہاب اشرفی کے ماسوا کسی اور کا سیر حاصل باقاعدہ مضمون نہیں ملتا۔ نثری شاعری پر بھی انھوں نے اس وقت لکھا، جب اس پر کم از کم ہندوستان میں کسی سرکردہ نقاد نے قلم نہیں اٹھایا تھا، نہ شمس الرحمٰن فاروقی نے، نہ گوپی چند نارنگ نے۔

انگریزی ادب پر عموماً اور اس زبان کے جدید ادب پر خصوصاً اپنی گہری نظر اور وسیع معلومات کی دھاک وہاب اشرفی نے اسی وقت بٹھادی تھی جب ''مورچہ'' گیا کے صفحات میں محمود ہاشمی سے ان کا مناظرہ ہوا۔ اس کا شاخسانہ یہ تھا کہ لکھنؤ میں شمس الرحمٰن فاروقی کی رہائش گاہ پر ''اُردو افسانے میں انحراف کی ٹیڑھی لکیر'' کے موضوع پر ایک سمپوزیم کا اہتمام کیا گیا جس کا ایک رپورتاژ محمود ہاشمی نے ''اوڈی تاژ'' کے نام سے ''شب خون'' میں شائع کرایا۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ یہ جدیدیت اور ''شب خون'' کے عروج کا زمانہ تھا۔ ان دنوں وہاب اشرفی ہفتہ وار ''مورچہ'' گیا (مدیر: کلام حیدری) میں ''میرا صفحہ'' کے عنوان سے ایک کالم لکھ رہے تھے۔ انھوں نے محمود ہاشمی کے مضمون کے عنوان پر اعتراض کیا اور سمپوزیم کے محتویات کے تعلق سے کئی سوالیہ نشانات قائم کیے۔ اس کا ایک جارحانہ جواب ''مورچہ'' ہی کے صفحات میں محمود ہاشمی نے دیا۔ پھر تو جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ چل نکلا۔ محمود ہاشمی کی کوردبتی نظر آئی، تو شمس الرحمٰن فاروقی بھی ان کے دفاع میں ''مورچہ'' کے صفحات پر اُتر آئے۔ وہاب اشرفی نے سب کا مسکت اور دنداں شکن جواب دیا۔ یہ معرکہ آرائی ایک سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہی۔ اس کی بنا پر وہاب اشرفی کے علم وفضل خصوصاً انگریزی ادب اور یونانی صنمیات وغیرہ کے بارے میں ان کی معلومات کا سکّہ پڑھنے والوں کے ذہن ودل پر بیٹھ گیا۔ اس ساری بحث کو ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے ''معرکہ وہاب اشرفی، محمود ہاشمی، شمس الرحمٰن فاروقی'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

انگریزی (اور امریکی) ادب کے نمونوں سے ہماری کچھ نہ کچھ واقفیت رہی ہے کیونکہ یہاں انگریزی تعلیم کا رواج رہا ہے۔ مگر دوسری غیر ملکی زبانوں کے ادب کے بارے میں ہمارا علم واجبی سا ہے۔ زیادہ سے زیادہ چند جرمن، فرانسیسی اور روسی شاعروں اور ادیبوں کے نام اور کام سے اُردو کا پڑھا لکھا طبقہ کسی حد تک آشنا ہے۔ وہاب اشرفی عالمی ادب سے اپنے ادب کا تقابلی مطالعہ کرنے اور آفاقی تناظر کی روشنی میں اپنے ادب کی رگوں میں خون تازہ نفوذ کرنے پر اصرار کرتے رہے ہیں۔ اپنے تنقیدی مضامین کے دوسرے مجموعے ''آگہی کا منظر نامہ'' (۱۹۸۹ء) کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

''ادب کو سڑنا گلنا نہیں ہے تو اس کی تازگی برقرار رکھنا پڑے گی اور اس کے لیے عالمی سطح پر ادبی رویوں کے تبدل وتغیر پر نگاہ رکھنی پڑے گی اور اس کے لیے وسیع اور گہرے تقابلی

مطالعے کا چیلنج قبول کرنا پڑے گا، ورنہ ادبی تفہیم کا لامتناہی پس منظر آنکھوں سے اوجھل رہے گا اور اگر ایسا ہوا تو پس ماندگی مقدر بن جائے گی۔ میرا موقف یہ ہے کہ جہاں ادب کے کچھ مقامی مطالبات ہیں، وہاں آفاقی تناظر بھی اس کا نصب العین ہے۔ کوئی نقاد اس احساس کے ساتھ کچھ لکھتا ہے تو گویا اس کی کاوش ہے کہ وہ اپنے ادب کو نئے رنگ و روغن دے کر اسے عالمی سطح پر لا کھڑا کرے۔"

وہاب اشرفی کا نقطۂ نظر واضح ہے۔ ان کی کتاب "تاریخ ادبیات عالم" ان کے تنقیدی اور ادبی موقف پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نقشہ اور منصوبہ انھوں نے بہت پہلے سے بنا رکھا تھا۔ اُردو زبان و ادب سے انھیں جو شغف ہے اور اسے عالمی معیاروں کے مطابق دیکھنے کی جو آرزو ہے، اس کی تکمیل اسی طرح کے منصوبے سے ہو سکتی تھی۔

وہاب اشرفی کی "تاریخ ادبیات عالم" اُردو میں اپنے نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یہ سات ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس بڑے کام کا بیڑا وہاب اشرفی نے اٹھایا۔ اس کی پہلی جلد میں مصری، اشوری، یونانی، چینی، عبرانی، کیلٹی، ہسپانوی، لاطینی، سنسکرت، پالی اور فرانسیسی، اور دوسری جلد میں جرمن، امریکی، اسکینڈ نیویائی، تامل، فارسی، عربی کے چھ سات ہزار سال کے ادبی سرمایے کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ دوسری جلد میں مصری، یونانی، لاطینی اور سنسکرت ادب کے ان ادوار کے احوال بھی درج ہیں، جن کا احاطہ پہلی جلد میں نہیں ہو سکا تھا۔ تیسری جلد میں اطالوی اور روسی کے علاوہ ڈنمارک اور اسکاٹ لینڈ کے ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں قبل از مسیح کے بعض شاعر اور فنکار جائزے میں آنے سے رہ گئے تھے، لہٰذا اس کا ازالہ کرتے ہوئے تیسری جلد میں یونانی، فرانسیسی، ہسپانوی، کیلٹی اور سنسکرت ادبیات پر مزید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ چوتھی جلد اس لحاظ سے مزید اہم ہے کہ اس میں سوئڈش، پرتگالی، ڈچ، پنجابی، مراٹھی اور بنگالی ادب کے اعلیٰ نمونوں پر پہلی بار تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ جرمن اور تامل ادب کے حوالے سے بھی نئی باتیں سامنے لائی گئی ہیں۔ انگریزی ادب کا خصوصی جائزہ پانچویں اور ساتویں (یعنی آخری) جلد میں ملتا ہے۔ اُردو ادب کی پوری تاریخ کا مختصراً احاطہ کرنے کی کوشش پانچویں، چھٹی اور ساتویں جلد میں کی گئی ہے۔ ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں مثلاً ملیالم، کنڑ اور تلگو ادب پر گفتگو پانچویں، چھٹی اور ساتویں جلد میں ملتی ہے۔ فارسی ادب کے احوال چھٹی اور ساتویں جلد میں مرقوم ہیں۔ چھٹی جلد میں ترکی کے علاوہ روسی ادب کا بھی تذکرہ ہے۔ مختصر یہ کہ یہ ساتوں جلدیں غیر ملکی اور ملکی ادب کے تقریباً تمام رنگوں کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

"تاریخ ادبیات عالم" صرف معلومات کا خزانہ یا اطلاعات کی کھتونی نہیں۔ اس میں خود مصنّف کا ذوق ادب سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسے محض ادب کی تاریخ کے طور پر نہیں، بلکہ ادب میں جاری و ساری روح کی لطافتوں سے لطف و حظ حاصل کرنے کے لیے پڑھا جانا چاہیے۔ ممکن ہے اس قاموسی کتاب میں اس منصوبہ بندی کی کمی محسوس ہو جو اس نوع کے Encyclopaedic کام کا تقاضہ ہوتی ہے، لیکن وہاب اشرفی کا کارنامہ یہ ہے کہ یہ ان کی انفرادی دماغ سوزی کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کے کام کسی انجمن یا ادارے کی جانب سے مصنّفین اور مولّفین کی ایک جماعت کرتی ہے اور تجربات بتاتے ہیں کہ ہمارے یہاں اس میں بھی ناکامی ہوتی رہی ہے۔ دراصل ہم سب محنت طلب کام کرنے سے جی چراتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہاب اشرفی کے کام کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے۔ عالمی شعر و ادب کے مختلف ظواہر کو اور اس کی نیرنگیوں کو اس دلکش پیرائے میں بیان کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ کتاب اس نوعیت کی تاریخ نہیں ہے کہ کون شاعر یا ادیب کب پیدا ہوا، کیسی زندگی جیا، کون کون سی کتابیں لکھیں، بلکہ وہاب اشرفی نے دنیا کے مختلف ادب کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے الگ اور دور ہونے کے باوصف کن کن ممالک کے شعر و ادب کے کون کون سے گوشے اتصال اور یگانگت کے رشتے میں منسلک ہیں۔ ان میں کتنی مماثلتیں ہیں اور ان قربتوں میں دوریوں کے کتنے پہلو ہیں۔

دنیا کے کسی ایک علاقے کی ادبی تاریخ کو بھی پچاس، ساٹھ یا سو صفحات میں سمیٹنا مشکل ہی نہیں، محال ہے۔ لیکن وہاب اشرفی نے پورے سمندر کو نہ سہی، سمندر کے ایک حصّے کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انسانی جذبات کی نوعیت ہر ملک میں یکساں ہے۔ محبت، نفرت، وفا، بے وفائی، ہمدردی، ظلم، صلح و جنگ، فتح و شکست، رنج و غم ــــ یہ سارے موضوعات ادبی تخلیقی سرگرمیوں کے محرّک رہے ہیں، لیکن ہر ملک کا لکھنے والا اپنی زمین کی بو باس سے بھی اپنے مشام ادب کو معطّر رکھتا ہے۔ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا ہوں کہ ہم اُردو والوں کو دوسرے ممالک کے تجربے سے اور اس کے سود و زیاں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ بڑا ادب پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دوسروں کے ادب کی ہواؤں میں بھی سانس لیں۔ ہمیں اپنی اجتماعی اور اخلاقی سرحدوں کو وسعت دینی چاہیے، اپنے ادب کو انسانی ترکے کا حصّہ بنانے کے لیے جغرافیائی حد بندیوں سے اوپر اُٹھنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں وہاب اشرفی کی "تاریخ ادبیات عالم" کا مطالعہ بھی کئی طرح سے فیضان پہنچا سکتا ہے۔ یہ کتاب ان سوالوں تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے کہ مشرق اور مغرب کے ادب کا فرق کیا محض سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کا فرق ہے؟ یا کیا اس کا تعلق محض ادبی مذاق سے ہے؟ یا حقیقت تک

رسائی کے لیے دونوں کے راستے الگ الگ ہیں؟

ہر ملک کی اپنی کچھ مخصوص اخلاقی اور تہذیبی قدریں ہوتی ہیں جو شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کسی ملک کی ادبیات کی تاریخ سے وہاں کے لوگوں کی فکر کے دھاروں، ان کے ادبی مذاق اور زندگی کی بابت ان کے رویوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ادب اور ادبی تاریخ کو ایک کُل کی حیثیت سے دیکھنے کا عمل ہمیں وہاب اشرفی کے یہاں نظر آتا ہے۔ ہر چند کہ جغرافیائی، نسلی اور طبعی اختلافات و تضادات نے دوریاں بھی پیدا کی ہیں، لیکن ان کے باوجود بہت سے معاملات میں انسان ایک ہی طرح سوچتا رہا ہے۔ بہت سی آفاقی سچائیاں ہیں جو قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "تاریخ ادبیات عالم" انھیں سچائیوں کی بازیافت کی ایک مستحسن کوشش ہے!

("تاریخ ادبیات عالم" جلد ۲، ۱۹۹۸ء نظر ثانی: ۲۰۰۵ء)

OO

رائیں

۱ آغاعماد الدین احمد
۲ آل احمد سُرور
۳ اثر انصاری
۴ احمد کفیل
۵ اشرف قادری
۶ انور مینائی
۷ بشیراحمد نحوی، ڈاکٹر
۸ پروین کمار اشک
۹ پریمی رومانی
۱۰ پورن سنگھ ہُنر
۱۱ پی۔پی۔ سریواستو، رِند ساغری
۱۲ ترنّم ریاض
۱۳ حرمت الاکرام
۱۴ حرمت الاکرام
۱۵ حفیظ شاھد
۱۶ حکیم رازی ادیبی
۱۷ حنیف ترین سنبھلی
۱۸ رضا اشک
۱۹ رفعت اختر، ڈاکٹر
۲۰ رونق شہری
۲۱ سجّاد سیّد
۲۲ سلیم آغا قزلباش
۲۳ سیّد احمد شمیم
۲۴ شاکر خلیق
۲۵ شاھد ساگری
۲۶ شاھد کلیم
۲۷ شاھد ماھُلی
۲۸ شمس رمزی
۲۹ شہریار
۳۰ شہود عالم آفاقی
۳۱ ظہیر غازی پوری، نعمان ھاشمی، مختار احمد عاصی
۳۲ عبدالعلیم آسی
۳۳ غوث محمد غوثی
۳۴ قوس حمزہ پوری
۳۵ قیصر شمیم
۳۶ قیصر عثمانی
۳۷ کفیل آزر
۳۸ کلدیپ گوھر
۳۹ محسن رضا رضوی
۴۰ مناظر عاشق ھرگانوی
۴۱ منصور عمر
۴۲ منظر حسین، ڈاکٹر
۴۳ منظور عثمانی
۴۴ نادم بلخی
۴۵ ناشاد اورنگ آبادی
۴۶ نذیر فتح پوری
۴۷ نوبھار صابر
۴۸ وکیل اختر
۴۹ وحید عرشی

آغا عمادالدین احمد

لوح و قلم

شاعری کی طرح روز بروز ہماری نثر بھی تجریدی ہوتی جارہی ہے۔ گنجلک، مبہم، اکثر اہمال کی سرحدوں میں داخل ہوتی ہوئی۔ نئے لکھنے والے عموماً وہی رنگ اختیار کرتے ہیں، جو "زمانے کا دستور" ہو چلا ہو، ورنہ انھیں "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ" والی پھبتی سُننی پڑتی ہے۔ آغا عمادالدین احمد بھی نئے لکھنے والے ہیں، لیکن شکر ہے کہ انھوں نے "اگلے وقتوں" کا ایک فرد بننا گوارا کرلیا ہے اور یہی "عیب" کہ ان کی تحریریں بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہیں، اُن کا سب سے بڑا وصف بن گیا ہے۔

آغا عمادالدین احمد میرے ہم وطن ہی نہیں، بلکہ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں میرے رفیق بھی رہ چکے ہیں۔ اُن کی ذہنی اور ادبی صلاحیتوں سے میں بہتوں کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ چند سطریں جو اس وقت قلم برداشتہ لکھی جارہی ہیں، میرے جذباتِ مسرّت و محبت کا اظہار ہیں جو آغا عماد کی ادبی مصروفیت کا حال جان کر میرے دل میں پیدا ہوئے ہیں۔

"ذاکر صاحب" کے علاوہ، جو چند یادوں کا مجموعہ ہے، اس کتاب میں جتنے مضامین شامل ہیں، ان کی نوعیت تاثراتی تنقید کی ہے۔ تنقید شاید مناسب لفظ نہیں، تبصرہ کہنا مناسب ہوگا۔ بلکہ تنقید و تبصرہ کے چکّر میں پڑے بغیر انھیں محض تاثراتی مضامین کہہ لیا جائے تو کیا ہرج ہے! مصنّف نے ان مضامین میں اپنے تاثرات و تعصّبات پیش کیے ہیں — شاید تعصّبات زیادہ۔ بہرحال، یہ ان کی اپنی رائیں ہیں، اور اپنی رائے کے اظہار کا حق ہر شخص کو حاصل ہے، خواہ آپ اس سے متفق ہوں یا نہ ہوں!

آغا عمادالدین نے عموماً ایسے ہی شاعروں پر قلم اٹھایا ہے جو زیادہ معروف نہیں ہیں۔ ایسی

شخصیتوں کو متعارف کرانا اور ان کے کلام کا جائزہ لینا بذاتِ خود ایک قابلِ قدر کام ہے اور آغا عماد ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ یہ کارِ خیر انجام دے رہے ہیں۔

آغا عماد الدین تصویروں میں رنگ بھرنے کے قائل نہیں۔ صرف چند لکیروں سے ہی وہ اپنے فن کو صورت بخشنا جانتے ہیں۔ ان کے تبصروں میں تفصیل و اطناب نہیں، انھیں اجمال اور اختصار عزیز ہے۔ انھیں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں علمیت کا خواہ مخواہ مظاہرہ نہیں ہوتا۔ وہ سادگی کے حسن سے واقف ہیں اور اِس حسن کی مشاطگی کا ہنر جانتے ہیں!

آغا عماد الدین کی زبان صاف، رواں اور دلکش ہے۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہو یا نہ ہو، لیکن اُن کی تحریروں میں سفید پھولوں کا ستھرا پن ضرور ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ سفید پھول کبھی کبھی رنگین پھولوں سے زیادہ کشش انگیز ہوتے ہیں!

(امیر منزل، در بھنگا، ۱۲؍مارچ ۱۹۶۳ء، اشاعت کتاب: اپریل ۱۹۶۳ء)

📖

آل احمد سُرور

آل احمد سُرور، دانش ور، نقّاد و شاعر

میں آل احمد سُرور کو آج کے اُردو ادب کا ضمیر سمجھتا ہوں۔ وہ ایک بلند پایہ نقاد، ایک بڑے مفکّر اور دانش ور ہیں۔ اُردو ادب اور شاعری کی پرکھ اور تفہیم کے لیے جس شعور، معروضیت اور مذاقِ سلیم کی ضرورت ہے، وہ موجودہ دَور میں آل احمد سُرور سے زیادہ کسی اور کو میسر نہیں۔ اُن میں آج بھی جاننے، دیکھنے بھالنے اور سیکھنے سمجھنے کی خواہش مُردہ نہیں ہوئی ہے۔ انسانیات (Humanities) یعنی عمرانیات، نفسیات، فلسفہ، تاریخ، فنونِ لطیفہ وغیرہ کی بابت ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ کسی نئی ادبی تحریک اور رجحان سے اغماض نہیں برتتے۔ وہ اسے صحیح تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تخلیق کار کی حیثیت سے بھی انھوں نے اپنے ہم عصر ناقدوں کے مقابلے میں بہتر شاعری کی ہے۔

آل احمد سُرور مزاج کے اعتبار سے مشرقی ہیں اور دماغ کے اعتبار سے مغربی۔ وہ مغربی اُصولوں، نظریوں اور تجربوں سے مدد لینا مفید سمجھتے ہیں مگر وہ اپنے تہذیبی سرمایے کے قابلِ قدر حصوں کو اتنے ہی

احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سرور صاحب بہ اِک وقت دل، دماغ اور مذاق کی اعلیٰ اور پاکیزہ صفات اور صلاحیتوں کے ساتھ ایک محکم، متوازن اور توانا شخصیت کے مالک ہیں — شخصیت، جو اپنے اندر بڑا گداز، بڑی دلآویزی اور بڑی انفرادیت رکھتی ہے!

(مرتبہ: شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء)

اثر انصاری

اثر انصاری: فکر وفن کے آئینے میں

مجھے بارہا ایسا محسوس ہوا ہے کہ ہماری نئی شاعری رس، حلاوت اور گھلاوٹ سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ کُھردراپن، درشتی، تلخی، یبوست آج کی شاعری کے طرۂ ہائے امتیاز ہیں۔ ہمارے برگزیدہ، عالم و فاضل ناقدین بھی ایسے ہی کلام کی ہمّت افزائی کرتے ہیں، جسے یا تو پڑھا ہی نہ جاسکے یا اگر اپنی دانش وری کا رعب جمانے کے لیے اسے پڑھنا ضروری ہو تو پھر رو رو کر پڑھا جائے۔ اثر انصاری اس اعتبار سے آج کے شاعر نہیں ہیں، اور شکر ہے کہ نہیں ہیں۔ وہ ان شاعروں میں بھی نہیں ہیں جن کا نام پیشہ ور ناقدین کے سکّہ بند مضامین میں ٹنکا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچّے اور کھرے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی داد اب سے بیس سال پہلے احتشام حسین جیسے دیدہ ور نقّاد دے چکے ہیں۔ مجھے اثر انصاری کے کلام میں دل کو موہ لینے والی کیفیت ملتی ہے، یعنی یہ شاعری ہماری نفسیات کی جوابی صلاحیتوں کو مہمیز دیتی ہے۔ اس میں خیال کی رعنائی بھی ہے اور فنی بلوغ بھی۔ اثر انصاری نے "افکارِ پریشاں" سے ہی اپنی اہمیت منوالی تھی۔ ان کا تیسرا مجموعہ "زبانِ غزل" قارئین اور ناقدین سے سنجیدہ توجّہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ اگر مجھے ان کی شاعری پر مختصر ترین الفاظ میں تبصرہ کرنا ہو تو میں ان کا ہی ایک شعر پیش کروں گا:

اس ادا سے ہے مخاطب وہ لبِ خوش گفتار
جس طرح موجِ صبا پھول کترتی جائے

اثر انصاری کی خوش گفتاری سچ مچ پھول کترتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کسی شاعر کا یہ بڑا کارنامہ ہے۔

(مرتب: ایم۔ نسیم اعظمی، ۱۹۹۸ء)

احمد کفیل

حسن نعیم اور نئی اُردو غزل

یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک کے انتہا پسندانہ اثرات سے شعوری طور پر آزاد ہونے کی کوشش کے باوجود نئی تخلیقات ترقی پسند فکر سے بے نیاز نہیں ہوئی تھیں، لیکن اسلوب و اظہار میں تازہ کاری کے نقوش نمایاں ہونے لگے تھے۔ چھٹی دہائی کے ختم ہونے سے پہلے جن شاعروں نے اپنی شناخت قائم کرلی ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، باقر مہدی، شہاب جعفری، وحید اختر، شاذ تمکنت اور حسن نعیم کے نام آتے ہیں۔ شہریار اور محمد علوی ابھی سامنے نہیں آئے تھے اور بحیثیت غزل گو بانی کے طلوع ہونے میں دیر تھی۔ بلراج کومل کے ماسوا اوروں کا تعلق نظم و غزل دونوں سے تھا۔ حسن نعیم خالص غزل گو تھے اور اس صنف کی آبیاری کے لیے وہ آخری دَم تک اپنے دل و جگر کو لہو کرتے رہے۔ ان کی انا پسندی بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی مگر حسینۂ غزل کے سامنے وہ دوزانو ہو کر بیٹھتے تھے۔ انھوں نے اپنی آرام و آسائش کی زندگی، اپنا منصب اور مرتبہ، اپنی شخصیت کے ساتھ وابستہ گلیمر، سب کو اپنی غزل کے لیے قربان کر دیا۔ غزل نگاری ان کے لیے اصول حیات اور مقدس خواب کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی لیے میں انھیں ''شہیدِ غزل'' کہتا ہوں!

نئی غزل کے بنیاد گزاروں میں ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ابن انشاء کے نام بطور خاص لیے جاتے ہیں۔ حسن نعیم کی غزل ان کے درمیان بھی سفر کرتی ہے اور ان سے الگ بھی ہے۔ ان کے اسلوب کا کھرا پن اور ان کا مردانہ لہجہ دوسروں سے مختلف شناخت رکھتا ہے۔ سُکڑی سمٹی ہوئی محدود موضوعات اور لفظیات کی غزل کے مقابلے میں حسن نعیم کی غزل پہلی نظر میں وسعت اور تنوّع کا احساس دلاتی ہے۔ ان کے یہاں خیالات اور افکار کا وفور ہے اور اُن کے اظہار کے لیے مناسب اور موزوں الفاظ کا وافر ذخیرہ۔ ان کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ وہ کچھ نیا کہنا چاہتے ہیں اور کچھ نئے انداز میں کہنا چاہتے ہیں۔ روح اور جسم کی آویزش اور تشکیک و اعتقاد کی کشمکش کو حسن نعیم نے غزل کی زبان دی ہے۔ انھوں نے اپنی غزل میں کچھ ایسے تیور پیدا کر لیے ہیں جو انھیں ایک انفرادی شان عطا کرتے ہیں۔ حسن نعیم کی غزل کو صرف و محض دورِ حاضر کی غزل کے

تناظر میں دیکھنے کی بجائے پوری اُردو غزل کو سامنے رکھ کر دیکھنا چاہیے، تب ہی اس کے اصلی جوہر کھُل سکتے ہیں!

احمد کفیل ایک نوجوان لکھنے والے ہیں۔ انھوں نے اس مقالے میں حسن نعیم کی زندگی کے احوال و آثار کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی شاعری کے محرکات اور ان کے فنی عوامل کا جائزہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ لیا ہے اور ان کی غزل کی انفرادی دلآویزی کو اُجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ احمد کفیل نے شعر فہمی بلکہ غزل شناسی کے مراحل خوش اسلوبی سے طے کیے ہیں۔ وہ تجزیہ، تنقید، تبصرہ سبھی کے آداب سے واقف ہیں۔

یہ حسن نعیم پر پہلا کام ہے۔ خدا کرے یہ ان کی فن شناسی اور تعیین قدر کے سلسلے میں اور بہت سے محاکموں کا پیش خیمہ ثابت ہو!

(دہلی، ۲۶/اگست ۲۰۰۲ء اشاعت کتاب: ۲۰۰۲ء)

اشرف قادری — دیوان

اشرف قادری اس تہذیبی روایت کے امین ہیں، جس سے اُردو غزل عبارت ہے۔ ایک ہی وقت میں شاعری کے مختلف رنگ جلوہ ریز ہو سکتے ہیں۔ جو رنگ سب سے روشن ہوتا ہے، وہ اپنے وقت کا رنگ کہلاتا ہے۔ اشرف قادری کی شاعری میں، ممکن ہے اپنے وقت کا سب سے نمایاں رنگ نہ ہو، لیکن اس سے ان کے کلام کی دلآویزی پر حرف نہیں آتا اور نہ اُن کی شاعری کو اگلے وقتوں کی چیز کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے۔ زبان و بیان پر اشرف قادری کی گرفت مضبوط ہے اور وہ اظہار کے آداب سے واقف ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جن محسوسات اور تجربات کو پیش کیا ہے وہ ہماری روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور پیش پا افتادہ نہیں ہوتے۔

اشرف قادری کی شاعری ہمارے شعری ذوق کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ اسے مہمیز بھی دیتی ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا وصف ہے۔

(اشاعت کتاب: ۱۹۸۳ء)

انور مینائی

روشنی کے پھول

انور مینائی اُن تازہ دَم اور تازہ کار شاعروں میں ہیں جو اپنی سُبک جولانی کے باعث شعروادب کی رہ گزار کو نت نئی منزلوں سے آشنا کرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اُن کا تعلق اُردو زبان کی پھیلی ہوئی وسیع دُنیا کے ایک ایسے دُور اُفتادہ علاقہ سے ہے، جہاں شعروادب کا کوئی دبستان قائم نہیں، لیکن انور مینائی کی انفرادی تخلیقی لگن نے اس گوشہ گیر فضا میں بھی نہ صرف یہ کہ ادبی روایات کی زندہ قدروں کے چراغ روشن کیے ہیں، بلکہ جدید سے جدید تر شعری تجربات مثلاً آزاد غزل کی شمعیں بھی فروزاں کی ہیں۔ انھیں مشکل اور نامانوس قافیوں میں طبع آزمائی کا خاص شوق ہے۔ ان کے برتے ہوئے الفاظ میں نرمی اور ملائمت بھی ہے اور ایک طرح کا کس بل اور سختی بھی۔ انور مینائی کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے نئی تنقید کا والہانہ رویّہ بھی نہیں اپنایا جاسکتا کہ ان کی شاعری میں زندگی کی ناآسودگی اور بے یقینی کا اظہار ہوا ہے، کیونکہ ان کے یہاں حیات کی آرزومندی کے کئی رنگ جلوہ ریز ہیں۔ جدید شاعری کی مروّجہ اور نامانوس لفظیات سے بھی ان کی شاعری کا دامن آلودہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی غزلوں کے موضوعات اور ڈِکشن دونوں کے انتخاب میں انھوں نے شعوری طور پر انبوہ سے الگ ہونے کی کوشش کی ہے تاکہ وہ اپنی علیحدہ شناخت بناسکیں اور غزل کو ایک نئے تخلیقی لمس سے آشنا کراسکیں۔ مجھے یقین ہے کہ انور مینائی کا پہلا مجموعۂ غزل ''روشنی کے پھول'' میرے اس بیان کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرے گا۔

(سری نگر، ۲۷ دسمبر ۱۹۸۵ء، اشاعت کتاب: ۱۹۸۶ء)

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

وحدت الوجود اور اقبال

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی وادیٔ کشمیر کے وہ ہونہار نوجوان ہیں جن کے علمی اور ذہنی اکتسابات سے اُردو زبان وادب کو بڑی توقعات ہیں۔ وہ تحریر وتقریر دونوں میں فکر وخیال کے گل بوٹے کِھلاتے ہیں۔ ان

کی دلچسپیاں متنوّع ہیں۔ اسلامی فکر اور تاریخ پر ان کی نظر ہے۔ سیاسیات اور عمرانیات ان کی توجہ کے مرکز ہیں۔ اقبالؔ سے عشق کی حد تک شغف ہے۔ اُن کا تقریباً سارا کلام حفظ ہے۔ اُردو بھی، فارسی بھی۔ اقبالؔ کے علاوہ بھی کئی شعراء کی طویل نظمیں وہ بے تکلفی سے سنا سکتے ہیں۔ جوشؔ کی، احسان دانش کی، ظفر علی خاں کی، شورش کاشمیری کی۔ کشمیری اور انگریزی شعراء کا کلام بھی یاد کر رکھا ہے، حتیٰ کہ بعض انشا پردازوں کی نثر کے ٹکڑے بھی وہ بلا ترمیم پیش کر سکتے ہیں۔ اس سے ان کے حافظے کی قوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بشیر احمد نحوی کے یہاں علم و آگہی کی صلابت بھی ہے اور خلوص و محبت کی نرمی بھی۔ وہ ایک فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ حوصلہ، عزم اور یقین کی بے بہا دولت بھی انھیں بہ حد وافر ودیعت ہوئی ہے۔ وہ اخلاقی قدروں کے امین اور گفتار و کردار دونوں کی تہذیب کے قائل ہیں۔

نحوی، اقبالؔ کا نورِ بصیرت عام کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ہمارا معاشرہ جو پستی اور ذلّت کی جانب گامزن ہے، پھر سے اپنی اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو بحال کر سکے۔ وحدت الوجود کے حوالے سے اقبالؔ کی فکر کا مطالعہ بشیر احمد نحوی کے اسی جذبے کی شدّت کا اظہار ہے۔

(سری نگر، ۲۷ر جون ۱۹۸۹ء، اشاعت کتاب: ۱۹۹۳ء)

پروین کمار اشک

چاندنی کے خطوط

پروین کمار اشک کی شاعری سکّہ بند اصطلاحوں میں اسیر نہیں ہو سکتی۔ ان کا شعری مزاج سمندر کی سر پٹکتی موجوں کی ضرب سے نمو پذیر ہوا ہے اور ان کے طرزِ اظہار نے صحرا کے لالۂ خودرَو کی طرح کنواری مٹی کے لمس سے پرورش پائی ہے۔

پروین کمار اشک کو حیات و کائنات کی معنی خیزیوں کا عرفان ہے۔ وہ سرد و گرم چشیدہ اور تلخابہ وانگبیں کے ذائقہ شناس ہیں۔ اشیاء سے اُن کا رشتہ رسمی علیک سلیک کا نہیں، بلکہ اس رِشتے میں ہمدمی اور ہم قدمی کا خلوص اور وفور بھی شامل ہے۔ اُن کی شاعری گریزاں لمحے کی پیداوار نہیں بلکہ فنی ریاض اور تجربے کی آگ میں تپ کر نکھری ہے۔ ان کی آزاد غزلوں میں بھی ایک تخلیقی بے ساختگی ہے!

پروین کمار اشک زندگی کے کیف وکم کو جذبہ واحساس کے نقرئی پیکروں میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ میں اس وصف کو اُن کے شعری بانکپن کی دلیل سمجھتا ہوں۔

(اشاعت کتاب: ۱۹۹۳ء)

پریمی رومانی

سنگِ میل

ڈاکٹر پریمی رومانی (سبھاش ایمہ) جموں وکشمیر کے اُن باصلاحیت ادیبوں اور شاعروں میں ہیں جن کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ اب ان کی ادبی کاوشوں کی عمر پچیس سال سے تجاوز کر چکی ہے اور اس دوران میں اُن کے کئی ادبی کام منظرِ عام پر آ کر خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ پریمی رومانی کی پہلی محبت حسینہ شاعری سے ہے۔ صنفِ غزل کو وہ زیادہ عزیز رکھتے ہیں لیکن انھوں نے چند قابلِ لحاظ نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو ذہن ودل کو دیر تک متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''سنگِ میل'' میرے اس بیان کی تصدیق کرے گا۔ ان کی شاعری نئے امکانات کا واضح اشاریہ ہے اور اسی بنا پر میں اس مجموعے کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

(دہلی، ۲۶ر فروری ۲۰۰۱ء، اشاعت کتاب: ۲۰۰۱ء)

پورن سنگھ ہُنر

متاعِ درد

پورن سنگھ ہُنؔر ہمارے اُن بزرگ شاعروں میں سے ہیں جنھیں اپنے جذبات ومحسوسات کو ہنرمندی سے پیش کرنے کا غیر معمولی سلیقہ ہے۔ اُن کا طرزِ اظہار نہایت سنجیدہ، پاکیزہ اور مؤدب ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں ایک ایسی روانی، بے تکلفی اور بے ساختگی ہے کہ ان کے اشعار پڑھتے یا سنتے ہی بے اختیار منہ سے واہ نکلتی ہے۔

پورن سنگھ ہنرؔ کے محرکاتِ شعری کے بارے میں جب بھی مَیں نے سوچا ہے، مجھے ایک ایسے دردمند دِل کی گداختگی کا خیال آیا ہے جو ساری کائنات کے دُکھوں کو اپنے دُکھوں میں سمیٹ لینے پر قادر ہو۔

پورن سنگھ ہنر کی شاعری کو جدید اصطلاحوں کی روشنی میں پرکھنا مناسب نہ ہوگا، لیکن ان کا کلام اِن تجربات سے عاری نہیں جن کا تعلق آج کی عصری زندگی سے ہے۔ ہنر کی شاعری کلاسیکی روایات سے جڑی ہوئی ہے، اس لیے یہ لہجہ ہمیں مانوس لگتا ہے۔ اُن کے سیدھے سادے الفاظ میں بھی ایک رکھ رکھاؤ ہے، جو ہماری موجودہ شاعری میں خال خال ملتا ہے۔

پورن سنگھ ہنرؔ کا کلام ایسے دلکش اشعار پر مشتمل ہے:

جاری سفر ہے اپنا سفر کے بغیر بھی
ہم چل رہے ہیں راہ گزر کے بغیر بھی

پھر بھی چہرے سے ترے غم کی خراشیں نہ گئیں
زندگی ہم نے بہت کچھ تری آرائش کی!!

ڈوبنا ہی ہے تو کیوں ڈوبوں نہ اپنے دِل میں
ہر سمندر سے ہے گہرا یہ سمندر میرا

جاتے جاتے ذرا دیکھنا دوستو!
آتے آتے کہاں روشنی رہ گئی

(اشاعت کتاب: ۱۹۸۹ء)

پی پی سری واستو رِندؔ ساغری — طنابیں دُھوپ کی

میں ایسی غزل کا قائل نہیں جو اپنے محسوسات اور لفظیات کے اعتبار سے پڑھنے والوں کو تشویش واضطراب میں مبتلا تو کرے لیکن ساتھ ہی ایک سکر آمیز نشاط سے ہمکنار نہ کرے۔ خیال اور معنی کا پردہ

خواہ کتنا ہی دبیز کیوں نہ ہو، اُسے الفاظ کے گورکھ دھندوں سے مزید گہرا بنانے کا عمل کبھی ذوق لطیف کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ رِند ساغری کی غزل میں بہت سے ایسے اوصاف ہیں جو اُن کے اشعار کی طرف فوراً متوجہ کرتے ہیں۔ اُنھیں نئے خیال اور نئے پیرایۂ اظہار کی تلاش رہتی ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو اُنھیں روایتی شاعروں کی بھیڑ سے الگ کرتی ہے۔ وہ شعر کے ضروری وصف ''خوش آہنگی'' کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتے۔ مثالیں بہت سی ہو سکتی ہیں، لیکن سر دست صرف یہی ایک شعر دیکھئے جس سے میری اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے:

بے اماں رات میں جگنو کی خریداری کو
کچھ اُجالے بھی اندھیروں کی دُکان تک پہنچے

رِند ساغری ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جن کی شخصیت اور شاعری ہماری تہذیبی زندگی کو منور کرتی ہے، یعنی وہ اُردو تہذیب جو اَب تیزی سے معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ اس ورثے کا تحفظ ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ رِند ساغری اس فریضے کو بہ طرزِ احسن پورا کر رہے ہیں۔

(اشاعت کتاب: ۲۰۰۳ء، یہ رائے مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ کتاب ''رِند ساغری: دُھوپ کا مسافر'' اشاعت: ۲۰۰۱ء میں بھی شامل ہے)

ترنّم ریاض

ابابیلیں لوٹ آئیں گی

ترنّم ریاض کے افسانے مانوس فضا میں سانس لیتے ہیں۔ یہ ہماری دیکھی بھالی دُنیا ہے، مگر افسانہ نگار کا وسیع تجربہ اور گہرا مشاہدہ اس دیکھی بھالی دُنیا کے تضادات کو ایک نئی جہت سے روشناس کراتا ہے۔

ترنم ریاض کے اظہار میں کوئی تصنع آمیز صناعی نہیں۔ وہ نہایت صفائی اور شستگی سے اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتی ہیں۔ ان کے اُسلوب میں وہ مقناطیسیت ہے جو پڑھنے والے کے ذہن کو کہیں بھٹکنے نہیں دیتی۔ ان کی سادہ بے تکلفی اور پُرکار بے ساختگی میں ان کی دردمندی اور دل سوزی بھی شامل ہے۔

(شاعت کتاب: ۲۰۰۰ء، یہ رائے 'یمبرزل' اور ''مورتی'' ۲۰۰۴ء، میں بھی شامل ہے)

حرمت الاکرام

اُجالوں کے گیت

حرمت الاکرام کا قصرِ سخن دراصل ایک کارگہِ شیشہ گراں ہے، جہاں سے نازک اور سجل اشعار ترشے ترشائے، ڈھلے ڈھلائے برآمد ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں فکر کی سنجیدگی اور توانائی کے ساتھ ساتھ اُسلوب کا رچاؤ، گداز، نرمی اور تیکھا پن ہے۔ حرمت الاکرام نے زندگی کی صحت مند اقدار کو اپنایا ہے، لیکن وہ کسی مخصوص سیاسی یا معاشی نظریہ حیات سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کرتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ زندگی نظریے کی نہیں، بلکہ نظریہ زندگی کا پابند ہے۔ اُن کی تخئیل حال و آئندہ کی پہنائیوں کا احاطہ کرتی ہے اور اپنے شعری پیکر کو اُن جاندار عناصر سے ترتیب دیتی ہے جن کے پریشان ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔

(اشاعت کتاب: ۱۹۵۷ء)

حرمت الاکرام

شہپر

حرمت الاکرام ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جنھوں نے مروّجہ اور مسلّمہ اسالیب سے رشتہ مستحکم رکھنے کے باوجود اپنی تازہ کاری کا احساس دلایا ہے۔ ان کا لہجہ نہ سپاٹ ہے، نہ گنجلک۔ ابلاغ کی ناکامی ان کے لیے المیہ ہے نہ مسئلہ۔

حرمت الاکرام کے اسلوب میں ایک جچا تُلا توازن اور لہجے میں ایک اچھوتی قطعیت ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کی شاعری انسان کے داخلی اور خارجی تصادم کا آئینہ خانہ ہے۔ یہ شاعری ایک ایسے ذہن کی پیداوار ہے جو اس کرب ناک عصر کے تلخ حقائق کو شہد آگیں بنانے اور افراد کے درمیان شکست ہوتے ہوئے رشتوں کو آمیز کرنے کا فن جانتا ہے۔

حرمت الاکرام کی شاعری فکر و احساس اور تفکّر و وِجدان کا خوبصورت اتصال ہے۔ فلسفیانہ آمیزش کے باوجود ان کے شعری پیکروں کا خمیر لطیف و نازک، سجل اور شیتل ہے۔ ان کا شعری مزاج

نرم رو اور بُردبار، مگر پُر تکلف ہے — پُر تکلف، مگر پُر تصنّع نہیں۔ بے جا آرائش نہیں۔ اتنی سادگی بھی نہیں کہ بے نمک ہو جائے: (اشاعت کتاب: ۱۹۷۴ء)

📖

حفیظ شاہد

سفر روشنی کا

حفیظ شاہد کی غزلیں پڑھ کر مجھے ایسا لگا کہ شاعر ایک ایسے اَن دیکھے سفر پر نکلا ہے جس کا نشانِ منزل روشنی کی وہ لکیر ہے جو جلتی بجھتی رہتی ہے۔ مجموعہ کے نام پر توجہ کی تو اپنی رائے پر شاعر کی مہرِ تصدیق ثبت دیکھی۔ یہاں یہ عرض کردوں کہ حفیظ شاہد کا سفر اپنی جگہ اہم سہی، لیکن اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ اس سفر میں الفاظ کو کس طرح ہم قدم بناتے ہیں۔ وہ پیکر نگاری یا تصویر سازی کے اتنے رسیا نہیں ہیں۔ ان کی علامتوں کا رشتہ بھی خارجی دُنیا سے پیوست ہے۔

حفیظ شاہد کی غزلوں کی دُھلی دُھلی ہوائیں داخل کے نہاں خانوں سے بھی گزرتی ہیں اور خارج کے کشادہ میدانوں میں بھی سفر کرتی ہیں۔ (۱۹۸۵ء)

📖

حکیم رازی ادیبی

''اسباق'' پونا

حکیم رازی کو میں اُردو کے محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔ اُردو زبان و ادب کے بے لوث خدمت گزاروں میں آج جن معدودے چند شخصیتوں کا نام محبت اور احترام کے ساتھ لیا جاسکتا ہے اُن میں بلاشبہ ایک نام حکیم رازی ادیبی کا بھی ہے۔

حکیم رازی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انھیں خدا نے علم کی دولت بھی دی ہے اور ذہنِ رسا بھی ودیعت کیا ہے۔ لیکن فروغِ طبع خداداد کے باوجود انھوں نے کسبِ فن کے لیے ریاض میں کوئی کمی نہیں کی۔ انھوں نے ادیب مالیگانوی جیسے اُستادِ فن کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اور اُن سے عروض و بلاغت کے نکات سیکھے۔ جناب رازی کو اپنے اُستاد سے جو والہانہ وابستگی اور شیفتگی ہے، اس کا اظہار

انھوں نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔

حکیم رازی کی شاعری میں ایک حساس اور بیدار مغز شخصیت کی جھلک صاف دِکھائی دیتی ہے۔ ان کا دل درد آشنا ہے اور اپنے گردو پیش پھیلی ہوئی ناانصافی اور بے راہ روی کو دیکھ کر ان کے احساس کو جو کچو کے لگتے ہیں ان کا اظہار انھوں نے شاعرانہ دیانت داری سے کیا ہے۔ مسائلِ حیات پر ان کی نظر گہری ہے، لیکن وہ مطالباتِ محبت سے بھی نا آشنا نہیں ہیں۔ انھیں فن کی عظمت و حرمت عزیز ہے اور ان کا شاعرانہ وقار انھیں زمانے کی تاجرانہ ذہنیت کی دہلیز پر جھکنے نہیں دیتا۔

حکیم رازی کے یہاں عمدہ اشعار کی کمی نہیں۔ ان کے رنگِ سخن کا اندازہ لگانے کے لیے محض ایک غزل کی مثال کافی ہے:

جادہ جادہ منزل ہم   طوفاں طوفاں ساحل ہم
دُور کریں گے مل جل کر   انسانوں کی مشکل ہم
وہ تو نشانِ منزل تھا   جس کو سمجھے منزل ہم
کیسی تھکن ، کیا ناکامی   رستہ ہم ہیں ، منزل ہم
اُس نے نظریں یوں ڈالیں   کہتے رہ گئے دل دل ہم
کیسے ڈوبے اپنی ناؤ   ہم ہی طوفاں ، ساحل ہم
رازی کیوں کر ہم کہہ دیں   اپنے فن میں کامل ہم

(گوشۂ حکیم رازی ادیبی، ''اسباق'' جنوری تا مارچ ۲۰۰۵ء، پہلی اشاعت: ''اسباق'' شمارہ ۱۱-۱۲، ۱۹۸۲ء)

حنیف ترین سنبھلی

ربابِ صحرا

ڈاکٹر حنیف ترین پیشے کے اعتبار سے معالج ہیں اور وجدانی و وہبی طور پر شاعر۔ اس لیے وہ انسان کی نبض پر ہی نہیں، انسانیت کی نبض پر بھی ہاتھ رکھتے ہیں۔ شاعری، ڈاکٹر حنیف ترین کے لیے گہرے ذوق و شوق بلکہ جنون کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ شعر کہتے ہی نہیں، شعر جیتے بھی ہیں۔ شاعری ان کے لیے محض خیال آرائی اور لفظی بازی گری نہیں۔ وہ خواب کے نہیں، بیداری کے شاعر ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں پر ان کی نظر گہری ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے عالمگیر پیمانے پر پھیلی ہوئی بربریت،

ناانصافی اور استحصال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انسانیت کی محرومی اور دل شکستگی کا مداوا ڈھونڈتے ہیں۔ان کے کلام میں وقت کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔انھوں نے اپنے اشعار کے لب و رخسار کو مقصدیت اور افادیت کے غازہ سے سنوارا ہے۔وہ مہالکشمی پُل کے اس طرف ہیں جہاں مجبوروں اور مقہوروں کی دنیا آباد ہے۔اس طرح کی شاعری اپنی حدود رکھتی ہے اور اس کا مطالعہ انھیں حدود کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔ابھی ڈاکٹر حنیف ترین کو عشق کے کئی امتحانوں سے گزرنا ہے، کیونکہ ان کا فن ان کے دل کا مزید لہو چاہتا ہے!

(پٹنہ،۲۲ر نومبر ۱۹۹۱ء، اشاعت کتاب: مارچ ۱۹۹۲ء)

رضا اشک

پتّھر کی رہگذر

رضا اشک کی شاعری دورِ حال کے کرب اور انتشار کی آئینہ داری کرتی ہے، مگر ایک بہتر مستقبل کی بشارت بھی دیتی ہے۔ان کا کلام انقطاعِ حیات کی دھواں دھواں فضاؤں میں اسیر نہیں بلکہ اس سے زندگی کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے جدوجہد کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔عہد شناسی اور حالات فہمی نے رضا اشک کو دردمندانہ احساس عطا کیا ہے، جو انسانیت کے مجروح دل کی ذمہ دارانہ ترجمانی کرنے پر قادر ہے۔یہی دردمندانہ احساس ان کی شاعری کو توانائی اور صلابت بخشتا ہے۔ان کے یہاں فروغِ طبع خداداد تو ہے ہی، کسبِ فن کے لیے ریاض کا سلسلہ بھی جاری ہے، اور اسی لیے ان کی شاعری ہماری توقعات کو مہمیز دیتی ہے۔

(اشاعت کتاب: ۱۹۹۰ء)

ڈاکٹر رفعت اختر

ہائیکو: تنقیدی جائزہ

ہائیکو کی صنف پچھلے ایک دہے سے اُردو میں بہت مقبول ہوئی ہے، لیکن اس نام سے اب تک جو کچھ پیش کیا جاتا رہا ہے، وہ سب کا سب ہائیکو کہلانے کا مستحق نہیں۔اس سے قطع نظر کہ جاپان والے اسے جس طرح برتتے ہیں، اُردو میں بالکل اُسی طرح برتنا ممکن ہے بھی یا نہیں، کم از کم اتنا تو خیال رکھنا

ہی چاہیے کہ تین مصرعوں میں بالترتیب ۵-۷-۵ Syllables (رُکن) استعمال کیے جائیں۔اب اس طرح کی پابندی کی جانب ڈاکٹر رفعت اختر کے مضامین کے بعد زیادہ دھیان دیا جانے لگا ہے۔ مجھے یقین ہے ان کی کتاب ”ہائیکو: تنقیدی جائزہ“ ہائیکو کی تکنیک اور اس کے مضمرات کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگی۔

(اشاعت کتاب: جولائی ۱۹۹۳ء)

رونق شہری

سبز آتش

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ صرف اظہارِ حقیقت کا نام شاعری نہیں۔خشک استدلالی منطقی انداز میں کہی ہوئی کوئی بات خواہ وہ حقیقی ہو شاعری کے زمرے میں شامل نہیں ہوسکتی۔فکر محسوس کے بغیر شعر بے اثر ہے۔رونق شہری نے تجربات کو جُزوِ احساس بنائے بغیر اشعار نہیں کہے۔وہ جانتے ہیں کہ شعر کیا ہے اور خود ان کی شاعری کا جواز کیا ہے؟ وہ بے ارادہ شعر نہیں کہتے۔اُن کا شعر ہے:

الفاظ مودب سے کھڑے ہیں پسِ معنی
اور میرے لیے ہی درِ وجدان کُھلا ہے

رونق شہری کے اشعار داخلی اور خارجی دونوں طرح کے محرکات سے عبارت ہیں۔وہ دوستوں اور زمانے سے شکوے شکایات ختم کر کے ذہن صاف کرنے کے لیے اپنے ہی خلاف ”معاہدہ“ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ماضی وحال دونوں سے ان کا رشتہ استوار ہے۔غزل کے مطالبات کا احترام کرنے کے باوصف انھوں نے نہ صرف رسمی اور روایتی خیالات سے اجتناب برتا ہے بلکہ نئے طرزِ احساس کو اپنی شاعری کا حاوی رنگ قرار دینے میں کسی تامل سے کام نہیں لیا۔لیکن یہ نیاپن کسی فیشن زدگی کا نتیجہ نہیں اس لیے ان کے یہاں غیر ضروری ابہام یا تجریدیت نہیں۔ان کے اظہار میں ایک سلیقہ، ایک نفاست، ایک شائستگی ہے جو فی زمانہ معدوم ہوتی جارہی ہے۔اس زاویے سے شعر کہنا ہر کس وناکس کی قسمت میں نہیں:

ایسا کہاں ستارۂ قسمت کسی کا ہے — کم ہو غروب اور زیادہ طلوع ہو

عصری شعری منظرنامے میں رونق شہری کی آواز ایسی نہیں جس پر عمومیت کی مہر لگائی جاسکے۔

(۱۹۹۶ء، اشاعت کتاب: ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر سجّاد سیّد

درد کو لفظ کیا ہے

سجّاد سیّد بنیادی طور پر حرفِ دل کے شاعر ہیں۔ جو دل پہ گزرتی ہے، اسے رقم کرنا اور کرتے رہنا ان کا وظیفہ شاعری ہے۔ لیکن ان کے موضوعات محدود نہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک بانکپن ہے جو ان کے حاصل کردہ متنوّع تجربات سے عبارت ہے۔ زندگی کے مدّ و جزر، سرد و گرم، زہر اور انگبیں، فراق و وصال، دُھوپ اور چاندنی کی الگ الگ کیفیتیں ان کے کلام میں جلوہ ریز ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبے کا گداز بھی ہے اور فکر کی صلابت بھی۔ ان کی غزلوں کی فضا مانوس لیکن تازہ کار ہے۔ ان کے طرزِ اظہار کا زاویہ دوسرے، بہت سے شاعروں سے مختلف نظر آتا ہے۔

سجّاد سیّد کی غزلیں اپنی نفاست، شستگی اور دردمندی کے اعتبار سے خصوصی توجہ کا تقاضہ کرتی ہیں۔ ان میں داخلی اور خارجی واردات و محسوسات کا اظہار خوش اُسلوبی سے تغزل کے لوازمات کے ساتھ ہوا ہے۔

سجّاد سیّد نے بعض غیر متداول بحروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے، مگر نغمگی اور شعری آہنگ کو کہیں مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کی شاعری میں ایک فطری نرمی، توازن اور شیرینی ہے جو زندگی کی تلخیوں کے اظہار کے باوجود برقرار رہتی ہے۔

(اشاعت کتاب: مئی ۲۰۰۰ء)

سلیم آغا قزلباش

جانچ پرکھ

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی کتاب ''جدید اُردو افسانے کے رجحانات'' ایک وقیع کارنامہ ہے۔ چونکہ شاعری کے مقابلے میں اُردو افسانے کے مختلف ادوار کے تجزیاتی مطالعے سے مجھے زیادہ دلچسپی رہی ہے، اس لیے میں اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں رائے ظاہر کرنے کا اہل ہوں۔ ایسا نہیں

ہے کہ اُردو افسانے پر تنقیدی کتابیں معدوم ہوں، لیکن یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی تعداد بہت کم ہے، اور غالباً مرزا حامد بیگ کی کتاب ''افسانے کا منظر نامہ'' کے علاوہ کوئی اور کتاب ایسی نہیں ہے جس میں اُردو افسانے کے ارتقائی سفر اور اس کے عہد بہ عہد بدلتے رجحانات اور افسانہ نگاروں کی انفرادی خصوصیات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہو۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے اُردو افسانے کے حوالے سے شائع شدہ بلکہ غیر شائع شدہ کتابوں کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے اور اُردو افسانے کے محض جدید رجحانات ہی کو نہیں، بلکہ آغاز سے لے کر اب تک کے تمام رجحانات کا کمال خوبی سے محاکمہ کیا ہے اور تازہ ترین فکری اور نظریاتی مباحث اور نئے اُردو افسانے پر اُن کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس طرح اُردو افسانے کی سو سالہ تاریخ کا پورا منظر نامہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ایسی کتابیں روز روز معرضِ وجود میں نہیں آتیں۔

(دہلی، ۱۱ رمئی ۲۰۰۱ء۔ مجموعہ مضامین، مرتبہ: شاہد شیدائی، لاہور، مئی ۲۰۰۲)

سیّد احمد شمیم

بے در و دیوار

سیّد احمد شمیم کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب ''...... مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر'' پھر وہ شعر کہنے لگے، نثر بھی لکھنے لگے۔ ان کی بالکل ابتدائی تحریریں دیکھنے کے بعد ہی مجھے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اب ان کی شاعری کی عمر چالیس سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ان کا کلام برِ صغیر کے مقتدر رسالوں میں باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ لیکن کچھ حالات کی نامساعدت، جوان لختِ جگر کا سانحہ، کچھ اپنی افتادِ طبع، کچھ مذاقِ طرب آگیں کی مجبوریاں اور مصروفیتیں — ان کی شعر گوئی کی رفتار مدّھم ہو گئی، یا کم از کم رسالوں میں وہ کم کم دِکھائی دینے لگے۔ ادبی اُفق پر جس تیزی سے وہ نمودار ہوئے تھے، کم و بیش اسی تیزی سے وہ شعری منظر نامے سے دُور ہو گئے۔ اب جبکہ زوالِ عمر میں ان کا مجموعہ ''بے در و دیوار'' کے نام سے منظرِ عام پر آ رہا ہے، مجھے خوشی ہے کہ اس جلوہ آرائی میں میرے اصرار کو بھی خاصا دخل ہے۔

میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ کچھ لوگ شعر کہتے ہیں، کچھ لوگ مشہور ہو جاتے ہیں۔ سیّد احمد شمیم کی

جگہ اوّل الذکر صف میں ہے۔ وہ شعر کہتے ہیں اور شعر کہنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں شاعری کے وہ بنیادی اوصاف موجود ہیں جن سے اچھی شاعری عبارت ہے، یا کم از کم جنھیں میں اچھی شاعری میں تلاش کرتا ہوں۔

سیّد احمد شمیم جدیدیت کی ابتدا اور اس کے عروج کے زمانے کے شاعر ہیں۔ انھوں نے، شمس فریدی کے اشتراک سے، ۱۹۶۰ء کے بعد کے شاعروں کا ایک بہت عمدہ انتخاب ''گلوب'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا تھا، اور شاید یہ اُس وقت کی شاعری کا سب سے معتبر انتخاب تھا۔ یہ رسمی انتخاب نہیں ہے۔ یہ سیّد احمد شمیم کی سخن فہمی اور عصری تقاضوں سے ان کی آگہی کا ثبوت بھی ہے!

سیّد احمد شمیم زندگی کے بہت سے نشیب و فراز سے گزرے ہیں۔ ان کے تجربات متنوّع ہیں، اور انھوں نے اشتراکیت سے تصوّف تک کا سفر منزل بہ منزل طے کیا ہے۔ ان کے محسوسات ان کے اپنے ہیں، ان کے سوچنے کا زاویہ ان کا اپنا ہے۔ ان کے طرزِ اظہار میں جو نرمی اور گھلاوٹ ہے، وہ ان کی اپنی ہے۔

سیّد احمد شمیم نے بعض نہایت خوبصورت تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اختصار میں صراحت اور بے باکیٔ اظہار میں لطافت ان کی نثر کے امتیازی اوصاف ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کی تنقیدی نگاہ نے ان کی شاعری کو کبھی ایک قابلِ لحاظ معیار سے گرنے نہیں دیا۔

میں سیّد احمد شمیم کو بنیادی طور پر نظم کا شاعر سمجھتا ہوں۔ یہ شکایت عام ہے کہ ہمارے یہاں اچھے نظم نگار گذشتہ بیس پچیس سال کے دوران میں سامنے نہیں آئے۔ اس شکایت کی تردید میں سیّد احمد شمیم کی نظمیں بلا تکلف پورے اعتماد کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان کی طویل فکری نظم ''آئینہ کہ جمال دارد'' میں ایک سبک خرام ندی کی سی روانی ہے۔ لفظیات کا دلکش آہنگ، لہجے کا اچھوتا پن اور جذبے کا نظم و ضبط ان کی مختصر نظموں کو روشن اور منوّر کرتا ہے۔ ان کی غزلیں بھی اپنے رچاؤ، کیف و اثر، نغمگی اور ربودگی کے باعث ایک اہتزازی کیفیت سے ہم کنار کرتی ہیں۔ یہ سانس لیتی ہوئی گوشت پوست کی شاعری ہے جس کے خدوخال میں معصومیت بھی ہے اور شوخی بھی۔

اُنھوں نے اپنے نوخیز بیٹے عُرفی کی یاد میں جو نظمیں اور غزلیں کہی ہیں وہ ایسی الم انگیز داستان سناتی ہیں کہ ان کا درد رگ و پے میں اُترتا محسوس ہوتا ہے۔

چالیس سالہ تخلیقی کاوشوں کا یہ انتخاب آج کی ادبی دنیا کو ایک گراں قدر تحفہ ہے!

(دہلی - ۱۳؍جون ۲۰۰۰ء، اشاعت کتاب: ۲۰۰۰ء)

شاکر خلیق

اعترافِ جنوں

شاکر خلیق کی غزلوں کے عقب سے ایک ایسے شاعر کا کردار اُبھرتا ہے جس کے سینے میں قلبِ گداز اور دلِ درمند ہے، جسے زندگی اور اس کی حسین قدریں عزیز ہیں، جو انسانی محبت اور ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہے۔

شاکر خلیق روایت کے باب میں وفاداری بہ شرطِ استواری کے قائل ہیں۔غزل کے بنیادی معنی سے اُن کا رشتہ گہرا اور پائیدار ہے۔وہ کسی تحریک یار جحان کے زائیدہ یا پروردہ نہیں۔ان کے اثرات قبول کرنے میں بھی انھوں نے تامل سے کام لیا ہے۔وہ فکر و فلسفہ کی دبیز چادر کے نیچے اپنے خیال کی دُھند کو نہیں چھپاتے۔انھوں نے ایک سادہ اور بے تکلف اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ان کے یہاں معنی آفرینی یا خیال بندی کا غیر ضروری عمل دخل نہیں۔وہ مانوس محسوسات کو مانوس لب ولہجہ میں پیش کرنے کا فن جانتے ہیں۔انھوں نے عام فہم ہندی الفاظ مثلاً آبھاری، گن گان، سوئیکار، سبھاؤ وغیرہ کو بھی اپنے اشعار میں خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔وہ ایسی غیر انسانی قوتوں سے جنھوں نے ہمارے معاشرے میں نفرت کا زہر گھول دیا ہے، اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے یہ طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہیں:

نہ برہمن کے لیے ہے نہ پارسا کے لیے
مرا کلام نہیں ذہنِ نارسا کے لیے

(اشاعت کتاب: ۱۹۹۴ء)

شاہد ساگری

عکس در عکس

تضمین گوئی ایک مشکل فن ہے۔ایک تو خود تضمین نگار کے پاس الفاظ کا وافر ذخیرہ ہونا چاہیے، پھر اس میں اتنی شعری بصیرت بھی ہونی چاہیے کہ وہ شاعر کے اصل شعر، جس پر اُس کے تضمین کی

اساس ہے، کی معنوی تہوں تک پہنچ سکے اور اپنے تخلیق کردہ مصرعوں سے اس کے خیال کی توسیع کر سکے۔ اس کے علاوہ تضمین کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ اصل شاعر کے رنگِ سخن اور معیارِ سخن دونوں سے پوری طرح ہم آہنگ اور ہم قدم ہو۔

شاہد ساگری خود ایک خوش کلام شاعر ہیں اور عرصے سے فکرِ سخن میں مصروف ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا بیش قیمت خزانہ بھی ہے، بصیرتِ شعری بھی اور اظہار کا سلیقہ بھی۔ انھوں نے تضمین کو اپنی خلاّقانہ قوت سے ایک صنف کا درجہ دے دیا ہے اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

(اشاعت کتاب: ۱۹۸۶ء)

شاہد کلیم

جب پھول کھِلتے ہیں

شاہد کلیم بحیثیت مجموعی رجا و نشاط اور انسانی خلوص و ہمدردی کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں زندگی کی گرمی اور تاب و توانائی ہے۔ وہ اپنے آنگن میں کوئی نہ کوئی پیڑ اُگاتے رہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تا کہ آتے جاتے موسموں کا پتہ ملتا رہے۔ ان کے احساسِ زوال میں ان کی شخصیت کے لازوال ہونے کا ولولہ شامل ہے۔ وہ بجھ کر بھی روشنی دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے یہاں کھنڈر بنتی ہوئی حویلی کی قندیل بھی اپنی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ یہ ان قدروں پر ہمارا ایمان تازہ کرتی ہے، جن سے زندگی کا حسن و نور عبارت ہے۔

شاہد کلیم کو اپنے فن پر اعتماد ہے، جس سے دوسرے بھی کسبِ ضیا کرتے ہیں۔ ان کے مکان تک ہر شخص کی رسائی ہوسکتی ہے اور مخصوص رہگذار پر شاہراہِ عام ہونے کا گمان ہوسکتا ہے مگر اس رہگذار کی اپنی انفرادیت برقرار رہتی ہے۔

شاہد کلیم غزل اور نظم دونوں ہی سلیقے سے کہتے ہیں۔ پیش پا افتادہ افکار و خیالات سے بچنے اور اپنے لیے الگ راستہ نکالنے کی کوشش ان کا نمایاں وصف ہے، ان کے طرزِ اظہار میں ایک خاص نوع کی نفاست، بے ساختگی اور نغمگی ہے جو آج کی شاعری میں کم کم پائی جاتی ہے۔

(اشاعت کتاب: ۱۹۹۶ء)

شاہد ماہلی

سنہری اُداسیاں

شاہد ماہلی نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام "منظر پس منظر" (۱۹۷۶ء) سے ہی شاعروں کی صف میں نمایاں اور معتبر جگہ بنالی تھی۔ قریباً بیس سال کے طویل وقفے کے بعد صرف غزلوں پر مشتمل اُن کا تازہ مجموعہ "سنہری اُداسیاں" ایک نئے ذائقے سے آشنا کراتا ہے۔ غزل ایک فریب کار صنفِ سخن ہے۔ یہ اچھے اچھوں کو آنکھ نہیں لگاتی اور ہما شما کو شاعروں کی محفل میں لا بٹھاتی ہے۔ اس فریب کار سے آشنائی آسان سہی، لیکن یہ وفا اسی سے کرتی ہے جو اس فن کی سخت اور سنگلاخ راہوں سے گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ شاہد ماہلی ان راہوں سے گزرنے، اس صنف کے ناز اُٹھانے، اس کے مطالبات سے عہدہ برآ ہونے اور اسے رام کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ الفاظ کے در و بست اور اُن کی لطافت و صلابت دونوں کی اہمیت سے آشنا ہیں۔ دور از کار علامتوں اور بندھے ٹکے استعاروں سے اجتناب کرتے ہیں اور اپنے اظہار کی بے ساختگی کو اپنی فکر محسوس کی تہہ داری پر اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔

حقیقت اور افسانہ، یافت اور نایافت، حاصل اور لاحاصل اس حیرت خانۂ زندگی کا مقدر ہیں۔ شاہد ماہلی کا سماجی اور ثقافتی شعور، حیات و کائنات کے سفید و سیاہ کی ماہیت کو شعری لباس عطا کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں ان کی شعری شخصیت کا بے محابا اظہار ہوا ہے۔ وہ کسی پسندیدہ شاعر یا معروف رجحان کا اتباع نہیں کرتے بلکہ روش عام سے الگ ہو کر اپنی غزلوں کو ایک انفرادی جہت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

شاہد ماہلی اپنی سُرمئی شام کے کوہ شب سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے کے نتیجے میں اُداس تو ہوتے ہیں، لیکن اُن کی اُداسی کا رنگ سنہرا ہوتا ہے ـــ شاداب اور تابناک، جو دُور دُور تک پھیل جاتا ہے۔ لہٰذا اُن کے غم کو بھی ایک وسیع تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

شاہد ماہلی کا ایک شعر ہے:

حقیقتوں سے اُلجھتا رہا فسانہ مرا　　گزر گیا ہے مجھے روند کر زمانہ مرا

جب میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو مجھے شاعر سے ایک خاص نوع کی قربت، یگانگت اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے اُس نے میرے ہی المیہ کو شعر کی زبان دے دی ہے!

اُداسی کو قبائے زر پہنانا آسان کام نہیں۔ شاہد ماہلی نے اپنی غزلوں میں یہ کارِ محال کر دکھایا ہے!

(اشاعت کتاب: جولائی ۱۹۹۵ء)

شمس رمزی

غبارِ شمس

شمس رمزی سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ان کی شاعری محض ابھرے جذبے کا اظہار نہیں۔اس میں ان کی فکر کی رنگارنگی بھی شامل ہے۔ وہ اپنی غزلوں کے لیے نئی اور اکثر مشکل ردیفیں تلاش کرتے ہیں اور ان زمینوں میں بے تکلفی اور روانی کے ساتھ ایسے اشعار نکالتے ہیں جو دل و دماغ دونوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ان کی پُرگوئی کی بھی داد دینی پڑتی ہے کہ ایسی ردیفوں میں بھی ان کی دس دس گیارہ گیارہ اشعار کی غزلیں ہیں۔ان کی بعض ردیفیں (مع قافیہ) دیکھئے:

منظر گُمشدہ	جوہر گُمشدہ	ذہن دانستہ	چبھن دانستہ
تمنا متروک	ارادا متروک	غم متواتر	عالم متواتر
زندگی کی خوش فہمی	روشنی کی خوش فہمی	رضا کا استقبال	خدا کا استقبال

شمس رمزی کا ذوقِ شعری ابر احسنی کی قربت سے بیدار ہوا اور رمز آفاقی کی رہنمائی سے اس ذوق کو جلا ملی۔اس لیے وہ زبان و بیان کے رمز سے آشنا ہیں۔ان کے کلام کی غیر پیچیدگی اور روایت چشیدگی بھی اسے ایک خاص طرح کی صلابت عطا کرتی ہے۔زندگی کے تعلق سے ان کا دردمندانہ رویّہ ان کے اشعار میں نرمی اور لطافت کے ساتھ منعکس ہوا ہے۔

(دہلی۔۵راپریل ۱۹۹۷ء، اشاعت کتاب: ۱۹۹۷ء)

شہریار

شام ہونے والی ہے

شہریار ہمارے عہد کے نہایت مقتدر اور سرکردہ شاعر ہیں۔ان کا حساس ذہن زندگی کی آرزوؤں اور اُمنگوں اور اس کی ناکامیوں اور محرومیوں دونوں کا یکساں عرفان رکھتا ہے۔ روحانی قربتوں اور فاصلوں کا جیسا حسی اظہار شہریار کے یہاں ملتا ہے، وہ اُردو کی نئی شاعری میں شاذ ہی ملے گا۔ اگر خواب کا در بند بھی ہو تو وہ نومیدی کی دیوار میں کوئی روزن نکال لیتے ہیں۔ وہ نیند کی کرچیوں سے

خوابوں کولہولہان نہیں ہونے دیتے۔ان کی شاعری اس سمندر کی طرح ہے جواوپر پرُسکون دِکھائی دیتا ہے،لیکن جس کی گہرائیاں پُرشور طوفان کا پتہ دیتی ہیں۔ان کے تازہ اورزندہ موضوعات ہمارے عہد کی معنویت کواُجاگر کرتے ہیں۔

شہریارزبان کے تخلیقی استعمال کا ہُنر جانتے ہیں۔اس لیے ان کے برتتے ہوئے لفظوں میں ایک خاص طرح کی چمک پیدا ہوگئی ہے۔ان کی شاعری نئے شعوراور نئے مزاج کی مصوری کا حق ادا کرتی ہے۔

شہریارکواپنے ہم عصروں سے الگ ہوکر قدم بڑھانے اور قدم جمانے کا حوصلہ اپنی شعرگوئی کے اوائل سے ہی تھا۔اوراپنی پینتالیس سالہ مشقِ سخن کے باوصف ان کی تخلیقی توانائی آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔

(دہلی-۲۰رجولائی ۲۰۰۴ءاشاعت کتاب:اگست ۲۰۰۴ء)

شہود عالم آفاقی

دشتِ بے کراں

شہود عالم آفاقی میرے اُن عزیز شاعروں میں ہیں جن کا ارتقائی سفر ہمیشہ میری نگاہ میں رہا ہے۔شعرگوئی کی صلاحیت مبداءِ فیض نے انھیں ابتدائے عمر سے ہی دیعت کردی تھی۔ان کا کلام جب میں نے پہلے پہل دیکھا تو اُن کی ذہنی اُپج،ان کی خلاّقی اوران کی جسارت آمیز شگفتہ بیانی کا قائل ہوگیا۔مجھے یہ دیکھ کر برابر خوشی ہوتی رہی ہے کہ وہ اپنے آپ کودُہراتے نہیں۔ان کے قدم تازہ کاری کی سمت بڑھتے ہیں۔وہ تجربے اور مشاہدے کے شاعر ہیں،اپنے ذہن ودل اور چشم وگوش کے دروازے وارکھتے ہیں،پیش پاافتادہ خیالات سے اجتناب برتتے ہیں اور اظہار کے لیے ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں جوان کی فکرِ محسوس کو نہ صرف قاری یا سامع تک منتقل کردے بلکہ اپنے لہجے کی کاٹ کے باعث بے اختیار دادوتحسین بھی حاصل کرے۔یہ چند شعر دیکھئے:

چڑھنے دو ابھی اور ذرا وقت کا سورج
ہوجائیں گے چھوٹے،یہی سائے جو بڑے ہیں

اس کو کیا کہیے مرا قتل کیا ہے جس نے
سب سے آگے ہے وہی پھوٹ کے رونے والا

کاغذ کا یہ لباس بدن سے اُتار دے
بادل برس گیا تو کسے منہ دِکھائے گا

شہود عالم آفاقی عصرِ حاضر کے مسائل اور زندگی کے سامنے کے مظاہر کا اظہار دلکش شعری پیرائے میں کرتے ہیں۔ ان کی طبّاعی ہمیں بہ اِک نظر متوجہ کرتی ہے۔ ان کے اکثر اشعار اپنی بے ساختگی اور بے محابا صاف گوئی کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں:

اپنی بلندی پر نازاں ہے ‏ ‏ ‏ ‏ وہ جو مرے چولھے کا دُھواں ہے

افسرِ اعلیٰ اللہ اللہ ‏ ‏ ‏ ‏ آنکھ نہیں ہے، کان نہیں ہے

آپ کہاں کچھ بول رہے ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ آپ کا عہدہ بول رہا ہے

ہم شہودؔ آج کا تازہ اخبار ہیں
ہم کو مت پڑھیے، چہرے اُتر جائیں گے

غیر مرئی اور غیر ذی روح اشیاء اور مظاہر کی تجسیم کاری سے شہود عالم آفاقی کو خاص دلچسپی ہے اور یہی صفت ان کے اکثر اشعار کو ایک خاص نوع کی اہتزازی کیفیت سے آشنا کرتی ہے۔ مثلاً:

ساحل پہ یہ ٹوٹے ہوئے تختے جو پڑے ہیں
ٹکرائے ہیں طوفاں سے تلاطم سے لڑے ہیں

برسات کا اُدھر ہے دماغ آسمان پر
چھپّر اِدھر نہیں ہے ہمارے مکان پر

سورج بھی اعتماد کے قابل نہیں رہا ‏ ‏ ‏ ‏ آیا جو وقتِ شام تو بے نور ہوگیا

نالہ جو بہہ رہا تھا مرے گاؤں میں شہودؔ ‏ ‏ ‏ ‏ دریا سے مل گیا ہے تو مغرور ہوگیا

چلتے رہو اے راہ گزارو! ‏ ‏ ‏ ‏ رُک جانا مرنے کا نشاں ہے

ایک مقطع دیکھئے:

ہیں غزل میں شہودؔ! اپنے تیور ‏ ‏ ‏ ‏ سُر کسی سے ملاتے نہیں ہیں

یہ تعلی نہیں، بیانِ واقعہ ہے۔ شہود عالم آفاقی کے یہاں دوسروں سے الگ ہونے کی شعوری کوشش نمایاں ہے!

(اشاعت کتاب: ۲۰۰۰ء)

ظہیر غازی پوری، نعمان ہاشمی، مختار احمد عاصی

تثلیثِ فن

اس وقت ادب میں جدیدیت کے حاوی رُجحان کے ساتھ ساتھ دوسرے رجحانات بھی سرگرم عمل ہیں، اور یہ توقع غیر مناسب ہوگی کہ آج کا ہر فن کار اس حاوی رجحان کا ہمنوا بن جائے۔ ظہیر غازی پوری، نعمان ہاشمی اور مختار احمد عاصی کا تعلق اس نئی نسل سے ہے جس نے روایت سے کلّی انحراف کو اپنی تخلیقی سرگرمیوں کے لیے شرطِ اوّل قرار نہیں دیا۔ ابھی یہ فنکار نوجوان ہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا آئندہ سفر کون سی سمت اختیار کرے گا۔ البتہ اتنا اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان فنکاروں کو زبان و بیان کے رموز سے آگاہی ہے اور انھیں اظہار کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ نظم ہو، یا افسانہ، یا غزل — ان میں فکر و اظہار کی صلابت خواہ بہ حدِ وافر نہ ہو، لیکن خوش فکری اور خوش اظہاریت کے نمونے ہر جگہ ملیں گے۔ اور یہی اوصاف ان تینوں فن کاروں کے خوش آئند امکانات کی نشان دہی کرتے ہیں۔

(اشاعت کتاب: اگست ۱۹۷۲ء)

عبدالعلیم آسی

مولانا عبدالعلیم آسی: تعارف و کلام

عبدالعلیم آسی کا شمار شہرِ دربھنگا ہی نہیں، بلکہ اطراف و جوانب کے ذی علم لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کی دلچسپی کی کئی جہتیں تھیں — ادب، سیاست اور مذہب۔ اُردو کے کلاسیکی ادب کا ہی نہیں، بلکہ بیسویں صدی کے نصف اوّل کے تمام بڑے شاعروں کا مطالعہ انھوں نے بڑی دلجمعی سے کیا تھا۔

اقبالؔ، جوشؔ، سیمابؔ، حفیظؔ، احسان دانشؔ ان کے پسندیدہ شعراء تھے۔ اقبالؔ اور جوشؔ کے رنگ میں بے تکلفی سے شعر کہتے۔ وہ مشاعروں کی روایتی شاعری سے اجتناب کرتے تھے، اس لیے اس زمانے میں ان کا نیا رنگ و آہنگ ہم جیسے نوجوانوں کو زیادہ پسند آتا تھا۔ اُس رنگ میں شعر کہنے والا اُن دِنوں دربھنگے میں کوئی اور نہیں تھا۔

مجھے اپنی ادبی دلچسپیوں کے ابتدائی دِنوں میں ہی عبدالعلیم آسیؔ سے قربت کے مواقع میسّر آئے۔ نانیہالی رشتے سے ان سے قرابت بھی تھی اور ان کا مکان بھی نزدیک ہی تھا۔ وہ تقریباً روزانہ ہی گھومتے گھامتے میرے گھر ''امیر منزل'' آنکلتے۔ بے حد زود گو شاعر تھے۔ میں اکثر انھیں کوئی مصرعہ یا کوئی عنوان دے دیتا کہ وہ اس پر غزل یا نظم کہیں۔ ان کی بہت ساری غزلیں اور نظمیں اسی طرح ''امیر منزل'' میں تخلیق ہوئیں۔

عبدالعلیم آسیؔ کانگریس سے وابستہ تھے اور سبھاش چندر بوس کے انقلابی اور جے پرکاش نرائن کے سوشلسٹ خیالات سے متاثر تھے، حالانکہ اس زمانے میں مسلم لیگ کا زور تھا۔ ۱۹۴۲ء کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک میں ''زیرِ زمین'' رہ کر انگریزوں کے خلاف کام کرتے رہے۔ مقامی مسلم ہائی اسکول سے بھی اپنے سیاسی نظریات کے باعث الگ کر دیئے گئے تھے جہاں وہ ہیڈ مولوی تھے۔

مذہب کے معاملے میں عبدالعلیم آسیؔ خاصے روشن خیال تھے۔ انھوں نے مدرسہ شمس الہدیٰ سے فاضل کی سند حاصل کی تھی۔ چھوٹی سی داڑھی بھی رکھتے تھے۔ مگر ان میں آج کے زمانے والی مولویت یا ملّائیت مطلق نہ تھی۔ منطق سے ان کی خاص دلچسپی تھی اور وہ ہر معاملے اور مسئلے پر منطقی اعتبار سے بحث و تمحیص کے قائل تھے۔ مولانا آزاد کے افکار کو حرزِ جاں بناتے تھے اور ان سے قربت کا اظہار بھی کرتے تھے۔ نہایت اچھے مقرر تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد اور مولانا آزاد سبحانی کے اندازِ خطابت کو اپنایا تھا۔ سیاسی اور ادبی جلسوں کے علاوہ مذہبی خصوصاً سیرت کے جلسوں میں ان کی تقریریں اپنی جامعیت کے باعث متاثر کرتیں۔ نعت کہنے کا خاص ملکہ تھا اور سیرت کے جلسوں کا آغاز عموماً انھیں کی نعت سے ہوتا تھا۔

عبدالعلیم آسیؔ کو اُردو، فارسی اور عربی تینوں پر دسترس تھی۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، کبھی کبھی عربی میں بھی۔ قرآن کی تفسیروں پر عالمانہ نظر رکھتے تھے۔ اُنھوں نے کتابوں اور رسائل کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا تھا اور اپنے کلام کا بھی۔ معلوم نہیں ان میں سے کیا کچھ محفوظ رہ سکا ہے۔ ان کے لائق فرزند عبدالقادر اگر ان کے کلام کی بازیافت کرسکیں اور انھیں منظرِ عام پر لاسکیں تو یہ بڑا کام ہوگا۔ ان کے دوسرے فرزند اقبال اور جاوید بھی اس کام میں مدد کر سکتے ہیں۔

نوجوان شاعر، ادیب اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مولانا آسی کے انتقال کے تقریباً بیس سال بعد ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے ایک کتابچے کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ جس میں مرحوم کے حالات و کوائف بھی ہیں اور ان کے کلام کا ایک انتخاب بھی۔ انھوں نے ''عبدالعلیم آسی ایوارڈ'' کا اعلان بھی کیا ہے۔ اس طرح کے کام کرنے کی ضرورت ہے!

(مرتبہ: ڈاکٹر امام اعظم، اشاعت کتاب: اگست ۲۰۰۳ء)

غوث محمد غوثی

حُسن ہزار شیوہ

کچھ شاعر، شعر کہنے کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں، کچھ شاعر مشہور ہونے یا حصولِ زر کو اپنی منزل قرار دیتے ہیں۔ غوث محمد غوثی کا تعلق شاعروں کے پہلے قبیلے سے ہے۔ ان کے کلام کا آمیزہ برجستگی، روانی، نفاست اور شائستگی سے تیاّر ہوا ہے۔ فکر، جذبے اور احساس کا اتنا خوبصورت امتزاج آج کی غزل میں کم کم ملتا ہے۔ ان کے انفرادی محسوسات میں کچھ ایسی دلکش ایمائیت ہے کہ ہم ایک خاص نوع کی اہتزازی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان کا بالواسطہ اظہار معانی کی گہرائی اور بیان کی تہہ داری کو روشن کرتا ہے۔ شاعر کے نام پر نہ جایئے، یہ معروف شاعر نہیں ہیں۔ ان کا کلام دیکھیے، ان کے شعری مجموعے ''عکس آئینہ'' اور ''دھنک لہجے کی'' دیکھیے!

غوث محمد غوثی میرے ہم عصر ہیں، لیکن میں ان سے بہت دیر سے متعارف ہوا۔ ان کی گوشہ نشینی اور ان کی درویشانہ بے نیازی ان کی شہرت کے راستے میں حائل رہی۔ لیکن ایک شاعر کی اصل پہچان تو اس کا کلام ہے۔ نہ رسالوں کی چمک دمک، نہ مشاعروں کی تڑک بھڑک۔ غوث محمد غوثی کے کلام میں پختہ مشقی ہے، مگر اُستادانہ پینترے بازی نہیں۔ اُن کے کلام میں سادگی بھی ہے، صناعی بھی۔ روایت چشیدگی بھی ہے، تازہ کاری بھی!

آج ہر شاعر ممتاز شاعر ہے، ہر مجموعۂ کلام اُردو شاعری میں ایک اضافہ ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو غوث محمد غوثی اور ان کے مجموعوں کے بارے میں کیا کہا جائے۔ میں اسی قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر توفیق ہو تو ان کا کلام دیکھیے اور خدا لگتی کہیے کہ ایسی سچّی اور کھری شاعری کرنے والے اس وقت کتنے ہیں!

(۲۴؍ جولائی ۱۹۹۶ء، اشاعت کتاب: ۱۹۹۷ء)

قوس حمزہ پوری

قرینہ ٔ غزل
(مرتبہ: ناوک حمزہ پوری)

کچھ شعراء شعر کم کہتے ہیں، شہرت زیادہ حاصل کرتے ہیں، لیکن ایسے سچے شعراء بھی ہیں جو شہرت اور تعریف وتوصیف سے بے نیاز ہوکر اپنے محسوسات اور تجربات کو شعری پیکر عطا کرتے رہتے ہیں اور تخلیقِ شعر کو ہی اپنا انعام سمجھتے ہیں۔ علاّمہ قوس حمزہ پوری کی جگہ ایسے ہی (ثانی الذکر) شعرا کی صف میں ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں ہی شبلی نعمانی، نذیر احمد اور حالؔی جیسے اکابرین سے اپنے ذوقِ فن کی داد حاصل کر لی تھی۔

قوس حمزہ پوری کو الفاظ کے در و بست پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کے یہاں ایک فنّی شائستگی، رچاؤ اور جذبے کا گداز ہے۔ اندازِ بیان کی بے ساختگی اور وارفتگی نے ان کے کلام میں ایک خاص کیف و لطف پیدا کر دیا ہے۔

(سری نگر، یکم جون ۱۹۸۳ء، اشاعت کتاب: دسمبر ۱۹۸۳ء)

قیصر شمیم

دستخط: قیصر شمیم نمبر

قیصر شمیم کو میں ایسے شاعروں میں شمار کرتا ہوں جو شعر کہتے ہیں اور شعر کہنے کا حق رکھتے ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا کرتے ہیں نہ صلے کی پروا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے سچے تخلیق کاروں کے مقدر میں محرومی ہی آتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شہرت طلبی کی ہوس اچھے اچھوں کو کاسہ لیسی پر مجبور کرتی ہے، اور فاقہ مستوں کی غیرت گداگری کو گوارا نہیں کرتی۔

میں قیصر شمیم کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میں در بھنگا جیسے قصبہ نما شہر سے کلکتہ جیسے بڑے شہر میں نیا نیا آیا تھا، اور یہاں اپنے پاؤں جمانے کی جد و جہد کر رہا تھا۔ میں نے ۲۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کو اس

شہر میں قدم رکھا، اور ایک ڈیڑھ سال تک یہاں کے ادبی اور سماجی حلقوں میں اپنے آپ کو متعارف کرانے کی کوشش کرتا رہا۔ ان دِنوں کلکتہ میں ادبی معاشرے سے اپنی شناخت کا سب سے بڑا ذریعہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی اُردو ہندی کی مشترکہ شاخ تھی جس کے جلسے ہر ہفتے باقاعدگی کے ساتھ سوترکن اسٹریٹ میں ہوا کرتے تھے۔ یاد آتا ہے کہ قیصر شمیم سے میری پہلی ملاقات انجمن ہی کے کسی جلسے میں ہوئی تھی۔ ان دِنوں وہ عمید انگسی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ یہ نام مجھے بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ خیر یہ تو انھوں نے بتایا کہ وہ انگس ضلع ہگلی کے رہنے والے ہیں۔ لیکن ''عمید'' کی غرابت مجھے برابر کھلتی رہی۔ کچھ عرصہ بعد ''شاہراہ'' میں ان کی ایک غزل شائع ہوئی جس کا مقطع اس زمانے سے اب تک میرے حافظے میں محفوظ ہے:

رُک گئی شاعری کی مشق عمید
ہائے کم بخت امتحاں نہ رُکا

پتہ چلا کہ ان ہی دنوں انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا تھا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد ہندوستان سے شائع ہونے والے رسالوں میں ''شاہراہ'' کا مقام سب سے بلند تھا، اور اس میں شائع ہونا شاعر یا ادیب کی شناخت کا باعث ہوتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب ''ساقی''، ''ادبی دنیا'' اور ''ادبِ لطیف'' میں چھپنا ادیب اور شاعر کو راتوں رات مشہور کر دیتا تھا۔ ''شاہراہ'' اس حد تک نہ سہی، لیکن اپنی اشاعت کے پہلے چند برسوں میں بڑی حد تک ایسی ہی ساکھ رکھتا تھا۔

اُن دنوں عمید انگسی کی کئی غزلیں مختلف رسائل میں شائع ہوئیں، جو اپنے سادہ لیکن تاثر آمیز لہجے کے باعث مجھے پسند آتی رہیں۔ ان سے قربت کا سبب یہی شاعری تھی اور آہستہ آہستہ یہ قربت دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ شاید اسی دوستی کے زیر اثر انھوں نے میرے مشورے پر اپنا قلمی نام قیصرِ شمیم رکھنا پسند کیا۔ اور جلد ہی ان کی شہرت مغربی بنگال کی حدود کو پار کر گئی۔ ان کلام اُردو اور ہندی کے کئی انتخابات میں نظر آنے لگا۔

قیصر شمیم سے میری دوستی کی عمر کی نصف صدی کو مکمل ہونے میں بہ مشکل چار پانچ سال باقی ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت قبول کرنے کے بعد مجھے کلکتہ کو خیرباد کہنا پڑا۔ کٹک کے قیام کے دوران تو خیر ان سے کبھی کبھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک بار میری درخواست پر وہ کٹک کے ایک مشاعرے میں بھی تشریف لائے تھے، اور انھوں نے میرے یہاں قیام فرمایا تھا۔ بہت عرصہ بعد میں نے دوردرشن سری نگر کے مجوزہ مشاعرے میں بھی انھیں زحمت دینی چاہی تھی، مگر وہ مشاعرہ بوجوہ ملتوی ہوگیا۔ ایک زمانے میں، میں نے انھیں طول طویل خط لکھے تھے، جنھیں اب دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ غالباً میں نے اتنے تفصیلی اور بے تکلف خط کسی اور کو نہیں لکھے۔

پھر میں اپنی منصبی اور گھریلو ذمہ داریوں میں اُلجھ گیا۔ مکروہاتِ زمانہ بڑھتے گئے، اور قیصر شمیم اپنی ملاقاتوں میں تو نہیں، میری یادوں میں قریب رہے۔ ستم ہائے روزگار اور غم ہائے جاناں نے ان کی یادوں سے کبھی غافل نہیں ہونے دیا۔ اور ان کے بارے میں وقفے وقفے سے سہی، اطلاعات ملتی رہیں۔ ان کی مسرّت اور ان کے رنج میں دل برابر شریک رہا۔

خلوص و محبت کا دوسرا نام قیصر شمیم ہے۔ ان کی خوش اخلاقی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اپنا نقصان کر کے دوسروں کو فائدہ یا فیض پہنچانا ان کا وطیرہ ہے۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی ذات سے کسی کا نقصان ہوا ہو یا کسی کو تکلیف پہنچی ہو۔ رشید احمد صدیقی کا یہ بیان کہ اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے، یا اسے ہونا چاہیے قیصر شمیم پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

قیصر شمیم کے کلام کی نمایاں خصوصیت اس کی خوش آہنگی ہے جو آج کی اُکھڑی اُکھڑی، بے رنگ اور سپاٹ شاعری کے دور میں اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ گیت سے ان کے مزاج کو خاص مناسبت ہے۔ گیت بنیادی طور پر گائے جانے والی صنف ہے۔ اس کا اثر ان کی غزلوں اور نظموں پر بھی پڑا ہے۔ یہی وہ اثر ہے جسے میں نغمگی سے تعبیر کرتا ہوں۔

قیصر شمیم کے یہاں خیال کی تازگی بھی ہے اور اسلوب کی نادرہ کاری بھی۔ انگریزی، ہندی اور بنگلہ ادبیات پر ان کی گہری نگاہ ہے اور ان زبانوں کی اعلیٰ ادبی اقدار سے انھوں نے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے غزلیں، نظمیں، گیت سب ہی لکھے ہیں۔ گیتوں میں ایک خاص لوچ اور نرمی ہے۔ انھیں مغربی بنگال کا واحد گیت کار سمجھنا چاہیے۔ زندگی کی ناکامیوں کے باوجود ان کے اشعار میں رجائیت ہے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ہے:

بتا کہ میرے لیے تیرا حکم کیا ہوگا　　　کوئی سزا بھی اگر میرا سر جھکا نہ سکے

قیصر شمیم کا پہلا مجموعۂ کلام ''ساعتوں کا سمندر'' ۱۹۷۱ء میں اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں شائع ہوا تھا۔ مجموعہ مختصر تھا لیکن اس نے اہلِ نظر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور مجموعے کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ موقر ادبی جریدوں نے بڑے حوصلہ افزا تبصرے شائع کیے۔

قیصر شمیم غزل کے ہی نہیں، نظم کے بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ ''ساعتوں کا سمندر'' میں شامل ان کی نظمیں ''آئینۂ آب''، ''تاش کے پتے''، ''اسپ تازی شدہ مجروح''، ''امکانات کا قتل'' مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں۔ اپنی ایک نظم ''بتیسویں پہاڑ کٹنے کے بعد'' میں وہ کہتے ہیں:

لیکن وہ آرزو ، وہ طرح دار آرزو
بتیسویں پہاڑ کے کٹنے کے بعد ہی

گھبرا کے پوچھتی ہے کہ کیا آگے جاؤ گے؟
کیا دوسرے پہاڑ پہ تیشہ چلاؤ گے؟
کب تک سیہ پہاڑوں سے پنجے لڑاؤ گے؟
فرہاد کا یہ فرض کہاں تک نبھاؤ گے
جس نہر کی تلاش ہے، وہ نہر پاؤ گے؟

ان ناگہاں سوالوں پہ پل بھر رُکا ہوں میں
پھر مسکرا کے تیشہ لیے چل پڑا ہوں میں

قیصر شمیم تیشہ بدست آج بھی فرہاد کا فرض نبھا رہے ہیں — کامیابی یا ناکامی کے انجام سے بے پروا۔ قیصر شمیم کی غزلوں کے اشعار کی تازہ کاری ان کے اپنے تجربے، مشاہدے اور احساس کی پروردہ ہے۔ وہ انسانی زندگی کے رمز آشنا اور انسانی تجربات کے مزاج شناس ہیں۔ طرزِ اظہار میں وہ زبان و بیان کی لطافت، شستگی اور دل آسائی کا پورا خیال رکھتے ہیں:

سامنا سرد ہوا کا ہوگا	دھوپ اوڑھے ہوئے چلنا ہوگا
ناؤ ٹوٹی ہے تو تختہ لے لے	راہ میں پھر کوئی دریا ہوگا
زندگی ان دنوں کیا ہے قیصر	جھیلنے والا سمجھتا ہوگا

اب تقریباً ستائیس سال کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ ''سانس کی دھار'' شائع ہوا ہے، یہ وقفہ بہت طویل ہے، اور شاعر جب تک ادبی منظرنامے پر مستقل اپنے وجود کا ثبوت نہ دیتا رہے، اس کی طرف توجہ کم ہو جاتی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۹۶ء تک یعنی چھیالیس سال کی سَو غزلوں پر مشتمل ہے۔ گیتوں اور نظموں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ قیصر شمیم سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ کمیت سے زیادہ کیفیت کے قائل ہیں، اس لیے ان کا شعری سرمایہ جو ہم تک پہنچا ہے، بہت زیادہ نہیں ہے، مگر جو ہے وہ منتخب ہے اور ان کی تعیینِ قدر کے لیے کافی ہے۔

مغربی بنگال میں جدید رنگِ سخن اختیار کرنے والوں میں قیصر شمیم کو اوّلیت حاصل ہے۔ انھوں نے بنگال کی نئی نسل کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ ان کی تربیت میں بھی اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔

''سانس کی دھار'' سے اچھے اشعار کا انتخاب ایک مشکل کام ہے۔ قیصر شمیم نے یہ انتخاب سختی سے کیا ہے۔ تمام غزلیں ایک مخصوص معیار کی حامل ہیں۔ چند اشعار میرے اس بیان کی ہم نوائی کریں گے۔

پہلے عمید انگسی کے نام سے شائع ہونے والی ابتدائی دَور کی غزلوں کے کچھ شعر دیکھئے۔ ان میں بھی ایک خاص نوع کا چٹیلا پن ہے:

دھیمے سروں میں گاتا ہوں　　جی کو یونہی بہلاتا ہوں
سب سے چھپا کر اشکوں کو　　ہنستا ہوں یا گاتا ہوں

اے غمِ دہر مری راہ نہ روک　　جانے وہ کب سے انتظار میں ہے

جس کو کبھی دیکھا ہی نہیں ہے، وہ ہے اپنے دل کے قریب
ہم تم برسوں ساتھ رہے ہیں پھر بھی کتنی دُوری ہے

اور پھر بعد کے اشعار:

ہم کو بھی کبھی حسرتِ آزار بہت تھی
افسوس کہ اب اس پہ بھی دھوکے کا گماں ہے

اس کے کوچے میں رہ کر بھی ناشائستہ ہیں یہ لوگ
اب بھی قیصرؔ دست و گریباں دیوانے آپس میں ہیں

چلوں زمانے کے ہمراہ کس طرح قیصرؔ　　ہمیشہ رہتا ہے میرا ضمیر میرے ساتھ

آپ زمانے کے ہمراہ نہ چل سکیں تو آپ زندگی کی دَوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں، مگر ہر باضمیر شخص کا یہی مقدر ہے۔ قیصر شمیم جو کہتے ہیں، برملا کہتے ہیں، لفظوں کو شیریں بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ انھوں نے "رس گلّے" کے لفظ کو کس خوبصورتی سے ہماری غزل کا حصہ بنایا ہے:

لفظوں کے رس گلّے میرے پاس نہیں
تلخ اگر لہجہ ہے بابا ، تیرا کیا

اس غزل کا یہ شعر بھی دیکھئے:

اس کا ہنسنا رونے سے تو بہتر ہے
وہ مجھ پر ہنستا ہے بابا ، تیرا کیا

ہنسنا زہر خند ہی سہی، لیکن ماتم گساری سے تو بہتر ہے۔ قیصر شمیم 'رہِ خاص' کے نہیں 'رہِ عام' کے شاعر ہیں۔ آج کے ادیب و شاعر جب "اشرافیہ" میں شامل ہونے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں، قیصر شمیم کا یہ شعر خاص توجہ کا مطالبہ کرتا ہے:

کوئی ہم خیالِ قیصر ہو مری طرح تو سیکھے
رہِ خاص بھول جانا ، رہِ عام یاد رکھنا

ان کی خوش شناسی اور خودداری بھی طرح دار ہے:

ہاتھ اٹھاتا ہوں تو یہ سوچ کے رُک جاتا ہوں
کچھ بھی ہو دستِ دُعا کاسہ نما ہوتا ہے

قیصر شیم نے اپنی سانسوں کی دھار تیز رکھی ہے۔ یہی ان کے نئے شعری مجموعے کا جواز ہے۔

(مرتب: فراغ روہوی، اشاعت: ۲۰۰۵ء، پہلی اشاعت: ہفتہ وار ''اُجالا'' کلکتہ، ۲۱ر دسمبر ۱۹۹۷ء)

قیصر عثمانی

یادوں کا سفر

قیصر عثمانی عنفوانِ شباب سے ہی فلمی دُنیا کے شہری ہیں۔ اس شہریت کے اختیار کرنے سے قبل ہی انھوں نے اپنے آپ کو شاعر، افسانہ نگار اور ایک معیاری ادبی جریدے کے مدیر کی حیثیت سے متعارف کرالیا تھا۔ افسانہ نگاری سے، عرصہ ہوا تائب ہو چکے ہیں، ہر چند ان کی افسانہ نگاری امکانات کی حامل تھی۔ بہ حیثیت شاعر، ان کی طویل نظم ''پرچھائیوں کا دیس'' نے انھیں زندہ رکھا۔ فلمی دنیا کے ظاہر و باطن یعنی اس کی چمک دمک کے عقب میں پوشیدہ کثافتوں کا اظہار انھوں نے مؤثر شعری پیرایہ میں کیا ہے۔ اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کا سہارا لے کر، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گھر کا بھیدی ہونے کے باعث انھوں نے اپنی نظم کو حقیقت نگاری کا ایک دلکش مرقع بنا دیا ہے۔

شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ قیصر عثمانی کے ترکش میں اور بھی تیر ہیں، جن میں سے ایک ان کی خاکہ نگاری ہے۔ انھوں نے اپنی یادوں کا نگار خانہ اس طور پر سجایا ہے کہ متعلقہ شخصیتوں کے خدوخال پوری طرح روشن ہو گئے ہیں۔ ان کی تیز عقابی آنکھوں اور ذہن و دل کی سفاکی نے ادبی اور فلمی شخصیتوں کے خارجی اور داخلی کوائف کو بڑی گہرائی سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ شخصیتوں کی یہ تصویریں بڑی دل پذیر ہیں —— زندگی کی طرح گرم اور متحرک، اور حسن کی طرح لمس آفریں اور درخشاں!

(اشاعت کتاب: ۱۹۹۱ء)

کفیل آزر

آسمان خوابوں کا

کفیل آزر سے میرا پہلا با قاعدہ تعارف "نئے نام" کے توسط سے ہوا۔ "نئے نام" کو جدیدیت کے نمائندہ شاعروں کے انتخاب کے طور پر شمس الرحمٰن فاروقی اور حامد حسین حامد نے "شب خون" کے ادارے سے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔ کفیل آزر کا کلام ان دِنوں "شب خون" میں شائع بھی ہوتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک بقول خود "جم کر شاعری کی"۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام "دھوپ کا دریچہ" میں اُن کے لکھے ہوئے اپنے سوانحی حالات کا مطالعہ ان کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ وہ فلمی دُنیا سے متعلق ہو کر بہت دِنوں کمال امروہوی کے ادارے سے وابستہ رہے۔ ۱۹۶۰ء میں مینا کماری کے سکریٹری باقر نے ایک فلم "تاروں کی چھاؤں میں" شروع کی اور اس کے لیے کفیل آزر کو پہلی بار گیت لکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔ یہ فلم مکمل نہ ہو سکی، لیکن اس کے بعد انھوں نے تقریباً پینتالیس فلموں کے لیے گانے اور/ مکالمے لکھے جن میں سے کچھ ریلیز ہوئیں، کچھ نہیں ہوئیں۔

کفیل آزر نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ تلاشِ رزق میں وہ ایک آستانے سے دوسرے آستانے کی گرد اپنی جبیں پر سجاتے رہے۔ وہ بڑے جاں گسل سخت مراحل سے گزرے ہیں۔ زندگی کی انھیں خاردار راہوں سے گزرنے کے بعد انھوں نے جینے کا فن سیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے گزرے ہوئے شب و روز کے پس منظر کو جانے بغیر ان کے شعری محرکات تک رسائی نہیں حاصل ہو سکتی۔ ان کی زندگی ہی نہیں، ان کا شعری اثاثہ بھی نقصان وزیاں سے دوچار ہوا ہے۔ ان کا ابتدائی اور عنفوانِ شباب کا کلام کسی عزیز کی کرم فرمائی کا شکار ہوا۔

دُنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں کفیل آزر کو جو کچھ دیا ہے، اسے انھوں نے اپنے کلام کے ذریعے لوٹانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے فاقے بھی کیے، دوسروں کے محتاج بھی رہے، مگر اپنی غیرت اور عزتِ نفس کا سودا نہیں کیا۔ زندگی کے حادثات نے ان کے لب ولہجہ میں ایک تلخی اور اشتعال کی سی کیفیت ضرور پیدا کی ہے جو فطری ہے، مگر ان کے کلام پر تشائم اور کلبیت تو دُور کی بات ہے، یاسیت اور مردم بیزاری کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔ وہ ماضی کی یادوں کے شاعر ہیں۔ ماضی ان کی فکر اور ان کے احساس پر مستولی ہے، اور اسی نے ان کے کلام میں ایک نوع کی کسک اور چبھن پیدا کی ہے۔

یہ چند اشعار دیکھئے:

کام ہی کیا ہے جنوں کو اور اب اس کے سوا
بار بار اِک نام لکھنا اور لکھ کر کاٹنا

چلو کہ شہر کی سڑکیں کہیں نہ سو جائیں
اب اس اُجاڑ حویلی میں کیا رکھا ہوگا

پھول جب روز کتابوں میں کھلا کرتے تھے
وہ زمانہ نہیں اب لوٹ کے آنے والا

ماضی کی گلرنگ سڑک پر لاش پڑی تھی یادوں کی
مستقبل چپکے سے بولا تم اس سے بے کار ملے

فرقہ واریت نے ہمارے معاشرے میں زہر گھول دیا ہے۔ آئے دن کے انسانیت سوز فسادات نے ہماری روح کو پگھلا دیا ہے۔ کفیل آزر کا یہ شعر کتنی جگر ریش کہانیاں سموئے ہوئے ہے:

اب فسادوں کی خبر سُن کے لرز جاتا ہوں
گھر میں بس ایک ہی بیٹا تھا کمانے والا

کفیل آزر نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام "دھوپ کا دریچہ" میں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے: "میں نے عشق بہت کیے، بہت لڑکیاں آئیں زندگی میں"۔ بس یہ دو مختصر سے جملے، مگر دونوں میں "بہت" کے استعمال پر غور کیجیے۔ یہ بہت طویل داستان کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں احساسِ جمال، گداختگیٔ دل اور نفاستِ نفس کے بغیر انسان میں جذبۂ عشق پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ان اوصاف نے کفیل آزر کو زندگی، انسان اور انسانیت سے محبت کرنا سکھایا ہے۔

کفیل آزر نے نظمیں بھی اچھی خاصی تعداد میں کہی ہیں۔ ان میں وہ نظمیں زیادہ ہیں جن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ شاعر نے "بہت عشق" کیے ہیں، مثلاً "اندیشہ"، "سرِ راہ"، "بھول جاؤ گی"، "خواب"، "دوراہا"، "خیال" وغیرہ۔ اس نوع کی نظموں میں "اندیشہ" نے بڑی مقبولیت حاصل کی، جس کا پہلا مصرع تھا — "بات نکلے گی تو پھر دُور تلک جائے گی"۔ یہ "شمع" کے عروج کے زمانے میں چھپی تھی اور جگجیت سنگھ کی آواز نے اسے دُور دُور تک پہنچایا۔ پھر ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں عورت کی بے بسی، مجبوری اور اس کے استحصال کو موضوعِ اظہار بنایا گیا ہے، جیسے "تنہائی" اور "تعجب"۔ اِدھر

انھوں نے تین مصرعوں کی نظمیں بھی کہی ہیں جنھیں ''ثلاثی'' کہہ لیجیے۔ ایسی نظموں میں ''عادت''، ''خودکشی''، ''بدصورتی''، ''خوش فہمی''، ''جھوٹا سچ'' اور ''بیٹا'' مجھے زیادہ پسند آئیں۔

کفیل آزر فنِ شاعری کے آداب سے واقف ہیں۔ سلاست، روانی اور خوش آہنگی ان کے کلام کی خاص خوبیاں ہیں۔ ان کی شاعری عموماً براہِ راست اظہار کی حامل ہے، لیکن وہ تشبیہ، استعارہ، پیکر اور علامت کا استعمال بھی جا بجا خوبی سے کرتے ہیں اور بیان کے نئے زاویے بھی تلاش کرتے ہیں۔ یہ چند اشعار اس کی تصدیق کریں گے:

میں اپنے آپ سے ہر دم خفا رہتا ہوں یوں آزر
پرانی دشمنی ہو جس طرح دو خاندانوں میں

بھرے بازار میں چلنے سے پہلے سوچ لو آزر
نہ کوئی ہاتھ تھامے گا نہ کوئی راستہ دے گا

خواب بچّوں کے کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں
خواب دیکھا نہ کرو، خواب دِکھایا نہ کرو

میں نے دیکھا ہے سمندر کی خموشی کا سماں
میری آواز کا ساحل کوئی نکلے تو سہی!

(دہلی۔ ۲۸ردسمبر ۱۹۹۹ء، اشاعت کتاب: ۲۰۰۲ء)

کلدیپ گوہر — نوائے احساس

کلدیپ گوہر کا شعری مزاج نفاست کا پروردہ ہے۔ وہ روایت کے آداب سے بہرہ ور ہیں لیکن اُن کی شاعری روایتی نہیں ہے۔ اُن کے یہاں فکر کی صلابت بھی ہے اور جذبہ واحساس کی لطافت بھی۔ کلدیپ گوہر مانوس اور جانے پہچانے مضامین کو اپنے اظہار کے تیور سے تازہ کار بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔

(اشاعت کتاب: ۲۰۰۱ء)

محسن رضا رضوی

فن ہمارا

شاعری اپنے منصب سے گر جاتی ہے، اگر اسے شہرت اندوزی کا وسیلہ بنایا جائے یا اسے جاہ و حشمت کے حصول کے لیے نردبان کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ ایک ایسا نازک آبگینہ ہے جو مادّی طمع کی ہلکی سی ٹھیس کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ محسن رضا رضوی اس آبگینے کے تقدس اور حرمت کی حفاظت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آج کے دَور میں شعر گوئی ایک کارِ زیاں ہے، وہ اسے حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں، کیونکہ یہ کاروبارِ شوق ان کی باطنی آسودگی کا ذریعہ ہے۔ وہ عمر کی جس منزل میں ہیں وہاں ''سارا سودا اس چہرے کے نام'' کرنا ہی دلیلِ سرخروئی ہے۔ لہٰذا جہاں جہاں وہ اپنی شاعری میں فکر و فلسفہ کی لَے تیز کرتے ہیں، وہاں وہاں وہ اپنے مزاج کے فطری آہنگ کو مجروح کرتے نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے ابھی ان کی شاعری میں ثمرِ نورستہ کا کسیلا پن بھی ملے، لیکن اس کا بھی ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ اس نوعمری میں وہ اپنا مجموعۂ غزل شائع کر رہے ہیں۔ شاید اُن کا مقصد ہی اس ذائقے سے اپنے قاری کو لذت یاب کرنا ہے!

(اشاعت کتاب: ۱۹۹۰ء)

مناظر عاشق ہرگانوی

مناظر عاشق ہرگانوی: شخصیت

مناظر عاشق ہرگانوی اس وقت برِصغیر کے فعّال ترین ادیبوں میں ہیں۔ ''کوہسار'' ان کا اپنا رسالہ ہے۔ اس نے ادیبوں، شاعروں اور پڑھنے والوں کے ذہنوں پر گہرے نقوش مُرتسم کیے ہیں۔ ''کوہسار'' نے آزاد غزل کو ایک رجحان ہی نہیں، بلکہ ایک تحریک بنا ڈالا۔ اگر مجھ سے کہا جائے کہ آزاد غزل کی صنف کو ایک رجحان بلکہ ایک تحریک کی شکل دینے والی اہم ترین شخصیت کا نام لیجیے تو میں بلاتکلف ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا نام لوں گا۔ وہ دُھن کے پکّے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ شاعروں، پروفیسروں، ناقدوں، طالب علموں، ادب پڑھنے والوں اور نئے رجحانات کی بابت اظہارِ خیال کرنے

والوں تک آزاد غزل کی رسائی مناظر عاشق ہرگانوی کی مساعی کے ذریعہ ہی ہوئی ہے۔ "سوزِ دروں" اور "ذوقِ جنوں" کی متاعِ بے بہا انھیں حاصل ہے۔ اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ جو کام وہ سنجیدگی سے کرتے ہیں اور جہاں جہاں وہ پاسبانِ عقل کو دل کے ساتھ رکھتے ہیں، وہاں کامیابی ان کے ہمرکاب ہوتی ہے۔ اور اس طرح کے کام کا اثر و نفوذ بعض مستقل رجحانات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

(مرتب: پروفیسر فردوس خاں رومی، اشاعت کتاب: ۲۰۰۵ء)

منصور عمر

مخدوم محی الدین کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

تخلیق کار کا مرتبہ اس کی تخلیقات سے متعین ہوتا ہے، کسی تحریک یا رجحان سے وابستگی کی بنا پر نہیں۔ کچھ شاعر اور ادیب ایسے بھی ہیں جن کی شناخت کے لیے کسی تحریک یا رجحان کا حوالہ ناگزیر ہے۔ مخدوم محی الدین ایسے ہی شاعروں میں ہیں، لیکن یہ شناخت ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستگی کی بنا پر کم ہے۔ اس بنا پر زیادہ ہے کہ وہ شروع سے ہی کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن رہے اور پھر انھیں اسی جماعت میں رہنمایانہ درجہ بھی حاصل ہوا۔ یہ سب کچھ درست، مگر مخدومؔ کی شاعرانہ اور فنکارانہ حیثیت ان سب پر مقدم ہے۔

میں مخدومؔ کو بنیادی طور پر ایک غنائی شاعر سمجھتا ہوں۔ ان کی شاعری میں نرمی اور حلاوت ہے، برہنہ گفتاری کے بجائے انھیں علامتی طرزِ اظہار مرغوب ہے، ان کے کلام میں خون اور آگ کی یورش نہیں، انقلاب کا نغمہ ہے:

گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے!

یہ انتظار مخدومؔ کے جذبے کے خلوص اور سوزِ قلب کا آئینہ دار ہے۔ ان کے دلِ گداختہ نے ان کی شاعری کو نہایت لطیف احساسی کیفیت عطا کی ہے۔

ڈاکٹر منصور عمر نے مخدوم محی الدین کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا ناقدانہ محاسبہ کیا ہے، اور اپنے طور پر نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان کے بیان میں صفائی اور شگفتگی ہے، اور انھوں نے کسی نظریاتی عصبیت کو اپنے محاکمے میں حارج نہیں ہونے دیا۔ دراصل وہ مخدومؔ کی محفلِ شعر میں آپ کو ایک بے تکلف سخن فہم دوست کی طرح شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس مقالے کا یہی خاص وصف ہے۔

(نئی دہلی۔ ۱۰ر دسمبر ۱۹۹۰ء، اشاعت کتاب: ۱۹۹۱ء)

ڈاکٹر منظر حسین — جگن ناتھ آزاد: ایک کثیر الجہت فن کار

جگن ناتھ آزاد ان سربرآوردہ شخصیات میں ہیں جن کے بارے میں مزید کچھ لکھنا اپنے ذخیرۂ الفاظ کا منہ چڑانا ہے۔ ان کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب جو کچھ بھی معرضِ تحریر میں آئے گا وہ کسی نہ کسی طور پر انھیں باتوں کا اعادہ ہوگا۔ ان کی شخصیت کی کئی جہتیں اور کئی تہیں ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی بنیادی شناخت ایک شاعر کی ہے۔ گذشتہ نصف صدی کے معروف ترین قادرالکلام شاعروں کی مختصر سے مختصر فہرست میں بھی ان کے نام کی شمولیت ناگزیر ہے۔ ہاں، ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب بہ لحاظ ماہرِ اقبالیات ان کی شخصیت ترجیحی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اقبال پر جتنا اور جیسا کام جگن ناتھ آزاد نے کیا ہے، اس نے انھیں ایک نہایت بلند مقام پر فائز کیا ہے۔ اقبال شناسی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جو جگن ناتھ آزاد کی نگاہِ دُور رس سے پوشیدہ رہا ہو۔ لیکن میں پھر اپنی اس بات کو دُہرانا چاہوں گا کہ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر، ایک تخلیقی فن کار ہیں اور اقبال، محرومؔ اور جوشؔ کی شاعری کی اعلیٰ قدروں کے امین اور پاسبان ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں، شخصیتوں کے خاکے بھی۔ اور ہر ایک میں ایک نقّاد اور ایک خاکہ نگار کے منصب کا وقار قائم رکھا ہے۔ ان کے سفرناموں کا خصوصی ذکر بھی ضروری ہے، جو اپنی جزئیات نگاری، معلومات کی فراوانی اور طرزِ نگارش کی دلکشی کے باعث فوراً متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے ایک سفرنامے ''پشکن کے دیس میں'' پر میں نے بھی ایک مضمون لکھا تھا۔ جگن ناتھ آزاد کے شعری مجموعے ''بوئے رمیدہ'' کے حوالے سے ان کی شاعری پر بھی میری تفصیلی تحریر شائع ہو چکی ہے۔ یہ ذکر صرف یہ بتانے کے لیے کر رہا ہوں کہ ان کے کام کی داد وقتاً فوقتاً میں بھی دیتا رہا ہوں۔

شخصی طور پر جگن ناتھ آزاد سے مجھے جو ربط و تعلق ہے، اس کا اظہار انھوں نے ایک جگہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ مظہر امام اور میرا (جگن ناتھ آزاد کا) رشتہ جان و دل کا رشتہ ہے۔ لہٰذا اب میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ''ظرف تنگنائے نثر'' میرے لیے ''بہ قدرِ ذوق'' نہیں ہے اور جگن ناتھ آزاد کے سلسلے میں ''بیانِ مدح'' کے لیے کچھ اور ''وسعت'' کی ضرورت ہے!

ڈاکٹر منظر حسین ایک ذمہ دار قلم کار ہیں جس کا ثبوت ان کی کتاب ''اقبال اور دانتے'' سے ملتا ہے۔ انھوں نے جگن ناتھ آزاد کی شعری، ادبی اور علمی کاوشوں کا معروضی انداز میں بڑی خوبی کے

ساتھ محاکمہ کیا ہے اور ہر چند آزاد کی تحریروں کے مثبت پہلوؤں پر ہی ان کی نظر رہی ہے، جو ہونی چاہیے تھی، تاہم وہ کہیں جانب داری کا احساس نہیں ہونے دیتے اور غیر ضروری تفصیل سے اجتناب کرتے ہیں۔ یہی ان کی تحریر کی خوبی ہے۔ میں ڈاکٹر منظر حسین کی تازہ تصنیف ''جگن ناتھ آزاد: ایک کثیرالجہت فن کار'' کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ (رانچی، یکم مئی ۲۰۰۲ء، اشاعت کتاب: ۲۰۰۳ء)

منظور عثمانی

درد و درماں

منظور عثمانی کی حسِّ مزاح تیز ہے۔ انھوں نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد گذشتہ پانچ چھ سال کے دوران میں کئی عمدہ مزاحیہ مضامین سپردِ قلم کیے ہیں۔ ان مضامین کے دو مجموعے ''ریٹائر ہوئے ہم'' اور ''کتاب کا نکاحِ ثانی'' شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ مضامین تیکھے لیکن شائستہ طنز و مزاح کے عمدہ نمونے ہیں۔ منظور عثمانی کا شعری ذوق بھی بہت بالیدہ ہے۔ انھوں نے اُردو کے پسندیدہ، مشہور اور خوبصورت اشعار کے دو مجموعے ''چمن در چمن'' اور ''صد گلستاں'' مرتب کر کے شائع کرائے ہیں۔

''چمن در چمن'' کا ابتدائی حصہ ''معینِ بیت بازی'' کے عنوان سے ہے، اور ان اشعار کی ترتیب حرفِ تہجی کے اعتبار سے ہوئی ہے تاکہ ''بیت بازی'' میں مقابلہ کرنے والے طلباء آسانی سے اپنی ضرورت کے اشعار تلاش کر سکیں، یا اپنے حافظے میں محفوظ رکھ سکیں۔ اس مجموعے میں غالبؔ کے تقریباً سو شگفتہ اشعار کا انتخاب بھی ہے اور اکبر کے سو سوا سو ''تیر و نشتر'' کا بھی۔ اور ان پر مستزاد، ایک حصہ زاہد، ناصح، شیخ وغیرہ سے متعلق طنزیہ اشعار کے لیے مختص ہے، جس کا ایک بڑا موزوں عنوان ''...... کے اڑیں گے پُرزے'' رکھا گیا ہے۔ دوسرا مجموعہ ''صد گلستاں'' مختلف موضوعات پر کم و بیش ساڑھے چار ہزار اشعار کا انتخاب ہے۔ بہاء الدین احمد کی مشہور تالیف ''گلستاں ہزار رنگ'' اب نایاب ہے۔ اس نوعیت کی کسی اور کتاب کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ منظور عثمانی کی تالیف ''صد گلستاں'' اس خلا کو بہ طرزِ احسن پُر کرتی ہے۔

اب منظور عثمانی نے ''درد و درماں'' کے نام سے مرزا جعفر زٹلی سے لے کر سیّد ضمیر جعفری تک اُردو کے سربرآوردہ مزاح نگار شعراء کا کلام منتخب کر کے یکجا کیا ہے۔ یہ ایک وقیع کام ہے۔ اُردو میں مزاح نگار شعراء کی کمی کبھی نہیں رہی۔ مزاحیہ شاعری کا وقار ماضی میں اکبر الہ آبادی اور موجودہ دور میں رضا نقوی واہی جیسے شعراء کے دَم سے قائم ہے۔ اُردو میں مزاح نگار شعراء کے کلام کا کوئی معقول

انتخاب دستیاب نہیں ہے۔ اب سے کم و بیش ساٹھ سال پہلے عبدالباری آسی نے "خندۂ گل" کے نام سے اچھے بُرے مزاحیہ کلام کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔ پھر کسی انتخاب کی خبر نہیں ملی۔ منظور عثمانی نے یہ مجموعہ مرتب کر کے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب ہر ممکن پذیرائی کی مستحق ہے!

(اشاعت کتاب: ۲۰۰۱ء)

نادم بلخی

ذکرِ نادم بلخی

نادم بلخی میرے ہم عصر اور ہم عمر ہیں۔ ہم دونوں نے لگ بھگ ایک ہی زمانے میں لکھنے پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ انھیں ایک نہایت معزز علمی خاندان ملا۔ ان کے والد جناب فصیح الدین بلخی کے علم و فضل کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے محقق ہونے کے علاوہ علمِ عروض کے نبض شناس بھی تھے۔ ان سے مجھے صرف ایک بار ۱۹۵۷ء میں پٹنہ سٹی میں ان کے دولت کدے پر شرفِ نیاز حاصل ہوا ہے۔ ان کے تبحرِ علمی کا نقش اب بھی قائم ہے۔ انھوں نے اپنی مشہور اور وقیع کتاب "تذکرۂ نسوانِ ہند" اپنے دستخط کے ساتھ مجھے عنایت کی تھی، جو آج بھی میرا قیمتی سرمایہ ہے۔ میں نے "سہیل" گیا کے ستمبر ۱۹۵۷ء کے شمارے میں اس پر ایک تبصرہ بھی لکھا تھا۔

فصیح الدین بلخی کے زیر سایہ نادم بلخی کے فکر و شعور کی تربیت ہوئی۔ مشقِ سخن ایسی کہ باید و شاید اور فن عروض پر ایسی دسترس کہ بڑے بڑے ماہرین عروض کو ان پر رشک آئے۔ نادم بلخی کو ڈالٹن گنج میں کالج کی ملازمت ملی۔ انھوں نے پٹنہ کو بادلِ ناخواستہ خیر باد کہا اور ایک چھوٹی سی دُور اُفتادہ جگہ کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا۔ اس سے اہلِ ڈالٹن گنج کا فائدہ ضرور ہوا اور ان کے علم و آگہی سے بہتوں نے فیض اُٹھایا، لیکن وہ خود اُردو کی مین اسٹریم (mainstream) سے دور ہو گئے۔ اور میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ صلاحیتوں کی جلا اور ان کے اعتراف کے لیے مین اسٹریم میں ہونا ضروری ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ساٹھ سال اُردو کی mainsteam اور فوری شہرت بخشنے والے علاقوں سے دُور رہ کر گذارے ہیں، اور اس کا خمیازہ ہر سطح پر اُٹھانا پڑا ہے۔ نادم بلخی ایسے دُور دراز علاقے میں جا کر بسے کہ وہ اپنوں سے بھی دُور ہو گئے، لیکن ان کے عزم و حوصلے کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے ہر حال میں علم و ادب کا چراغ جلائے رکھا۔ نامساعد حالات اور نشر و اشاعت کی عدم سہولت

کے باوجود انھوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا اور ان کے اندر کا شاعر ہمیشہ زندہ رہا۔ ان کے کئی شعری مجموعے مقبولیت حاصل کر چکے ہیں اور کئی اشاعت کے منتظر ہیں۔

نادم بلخی نے آزاد غزل کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے، جس نے ہم دونوں کے ذاتی اور ادبی دونوں رشتوں کو مزید مستحکم کیا ہے۔ فنِ عروض پر ان کی کتاب ''تفہیم العروض'' استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں ایک باب آزاد غزل کے لیے بھی مختص ہے۔ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'شعاعِ نقد'' میں ظفر ہاشمی، رشید اعجاز، شارق جمال ناگپوری اور عتیق احمد عتیق کی آزاد غزلوں پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ نادم بلخی کی آزاد غزلوں کا ایک مجموعہ مرتب ہو کر اشاعت کے لیے تیار ہے۔ کاش اس کی اشاعت کی کوئی صورت نکلے، کیونکہ نادم بلخی کی آزاد غزلیں اپنی فنکارانہ صلابت کی وجہ سے خاص توجہ کا تقاضہ کرتی ہیں۔ میں آزاد غزل کی آزادی سے زیادہ اس کی پابندی کا قائل ہوں، اس لیے نادم بلخی سے ایک آدھ بار میرا اختلاف بھی رہا ہے۔ ہم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہر بحر آزاد غزل کے لیے مناسب نہیں۔ (آزاد نظم کے لیے بھی نہیں۔) مگر نادم بلخی نے ''مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن'' میں آزاد غزل کہی ہے اور اس کے لیے عروضی جواز بھی پیش کیا ہے۔ نادم بلخی ماہرِ عروض ہیں، لہٰذا ان سے بحث کرنا میرے لیے ممکن نہیں، لیکن میرا اختلاف اپنی جگہ قائم ہے۔ ادب کے معاملات میں اختلاف رائے نہ ہو تو فکر و تامّل کے دروازے کیسے کھلیں۔

نادم بلخی ایک نہایت عمدہ شاعر، نہایت عمدہ انسان اور نہایت عمدہ دوست ہیں۔ ادبی اور عروضی معاملات میں اپنے بعض شکوک رفع کرنے کے لیے میں نے اکثر ان سے رجوع کیا ہے!

(مرتب: ڈاکٹر سید حسن عباس، ۲۰۰۵ء)

ناشآد اورنگ آبادی

پروازِ سخن

ناشآد اورنگ آبادی کا نام اور کلام محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ مانوس لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل نئی شعری فضا کی زائیدہ نہ سہی، لیکن وہ روایت کی پاسدار ہوتے ہوئے بھی روحِ عصر کی ترجمانی کرتے ہوئے نہیں جھجکتی۔ ناشآد اورنگ آبادی ایک دردمند دل رکھتے ہیں، اس لیے ان کی غزل سماجی زندگی کے نشیب و فراز اور انسان کے خوابوں، آرزوؤں، محرومیوں اور حسرتوں کی آئینہ دار

ہے۔ ناشاد اورنگ آبادی شعری اظہار کے لیے نرم اور سبک الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے شاعر کے اندر کی شکست کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ ساتھ ہی ہمارے کان مقصدی لَے سے بھی آشنا ہوتے ہیں۔ انھوں نے شخصی کوائف و واردات کے اظہار کو اولیت دی ہے، مگر ان کی غزل میں دوسروں کے دل کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں۔ اُمید ہے اپنے شعری سفر کے اس سنگ میل پر وہ رکیں گے نہیں، کیونکہ آگے کئی منزلیں ان کی منتظر ہیں۔

(سری نگر، ۲۷ نومبر ۱۹۸۷ء، اشاعت کتاب: ۱۹۹۰ء)

نذیر فتح پوری

لمحوں کا سفر

نذیر فتح پوری کی شاعری خارج اور باطن کے نزاع باہم سے بے تعلق ہو کر ان کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے جن کا رشتہ ہماری دونوں دنیاؤں سے جڑا ہوا ہے۔ نذیر فتح پوری موضوعات اور لفظیات کے انتخاب میں رسمِ زمانہ کی تقلید نہیں کرتے۔ انھیں اس کی بھی پروا نہیں کہ انھیں کس قبیلے سے منسوب کیا جائے گا، کیونکہ انھوں نے اپنے تجربات اور محسوسات کے اظہار کے لیے جو وسیلہ اختیار کیا ہے، وہ کسی کا مقروض نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کرنا چاہیے کہ انھوں نے روایت کی زنجیر نہیں توڑی۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ وہ زنجیر ہے جو ایک فطری شاعر کو مقید نہیں کرتی بلکہ اس کے افکار و خیالات کو ایک ایسے سلسلے سے جوڑتی ہے جسے ہم بجا طور پر تہذیبی تسلسل کی کہکشاں کہہ سکتے ہیں۔ نذیر فتح پوری کی آزاد غزلیں بھی اس کہکشاں کا حصہ ہیں۔ (اشاعت کتاب: ستمبر ۱۹۸۴ء)

نو بہار صابر

دھنک رنگ

نو بہار صابر ہمارے عہد کے اُن معدودے چند خوش فکر شاعروں میں ہیں، جو نہ صرف ادب کی بہترین روایات کا عرفان رکھتے ہیں، بلکہ اپنے زمانے کے بدلتے ہوئے مزاج، تقاضوں اور مطالبات

سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔ گذشتہ چالیس سال کے دوران میں ہماری قومی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں جو نشیب و فراز آئے ہیں، ان کی عکاسی اور مصوری فنکارانہ صلابت اور شاعرانہ دلکشی کے ساتھ نو بہار صابر نے کی ہے۔ یہ صلابت اور دلکشی اس انہماک، ارتکاز اور ریاض کی عطا کردہ ہیں، جو نو بہار صابر کی شخصیت کا جزو ہیں۔ نظمیں ہوں یا غزلیں، ان کے یہاں موضوعات اور فکر و خیال کا تنوع ہے۔ یہ جان دار، گوشت پوست کی شاعری ہے، جس کے خد و خال میں تازگی بھی ہے اور رعنائی بھی۔

(سری نگر، یکم نومبر ۱۹۸۲ء)

وکیل اختر

شہابِ ثاقب

وکیل اختر سے میرا تعارف ان دِنوں ہوا جب ان کی عمر یہی کوئی بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ کالج کے طالب علم تھے اور کبھی کبھی ادبی محفل یا مشاعرے میں نظر آ جاتے تھے۔ میں نے انھیں ایک لا ابالی اور ہنس مکھ نوجوان کی حیثیت سے جانا۔ بعد میں جب انھوں نے اپنی ایک دو غزلیں سنائیں تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ اس عمر کے نوجوانوں سے میں خالص روایت پسند شاعری کی توقع نہ کرتا تھا البتہ ان کی روایتی بلکہ قدامت پسندانہ شاعری میں بھی زبان و بیان کے تیور لطف دے جاتے تھے۔ ان دِنوں کلکتہ میں ترقی پسند شاعری کا دور دورہ تھا لیکن پروفیسر عباس علی خاں بیخود کے زیرِ اثر رہنے والا کالج کے طالب علموں کا ایک حلقہ اب بھی ترقی پسند تحریک کی لہروں سے بہت دُور تھا۔ ان نوجوانوں میں وہاب اشرفی اور وکیل اختر ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں کافی حصہ لیتے تھے۔ یہ دونوں کالج کے رفیق تھے اور انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے کے باوجود روایتی شاعری کیا کرتے تھے۔ غزلیں آنچل اور زلف کے سائے سے کبھی باہر نہ نکلتی تھیں۔ وہاب اشرفی نے تو خیر بہت پہلے ہی شاعری چھوڑ دی تھی اور افسانہ نگاری کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ وکیل اختر حسبِ معمول اپنے رنگ کی غزلیں لکھتے رہے۔

میں نے ۱۹۵۸ء کے اواخر میں کلکتہ کو خیر باد کہا لیکن کلکتہ کی ادبی سرگرمیوں سے میری دلچسپی برقرار رہی۔ کسی نے بتایا کہ وکیل اختر ترقی پسندی کے اثر میں آ گئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسندی کا رنگ و روغن چھوٹنے لگا تھا۔ ایسے زمانے میں وکیل اختر کی ترقی پسندی سے قربت مجھے بے محل معلوم ہوئی۔ پھر میں کافی دِنوں تک کلکتہ نہ جا پایا۔ کئی سال بعد ۱۹۶۹ء میں محمد علی لائبریری کے ایک مشاعرے

میں شرکت کے سلسلے میں کلکتہ جانا ہوا۔ دوسرے دن ایک اور مشاعرے میں وکیل اختر کی غزل سنی تو مجھے یک گونہ حیرت اور مسرت ہوئی۔ ان کے کلام میں اسلوب اور اندازِ فکر کے اعتبار سے بڑی تازگی تھی اور وہ عصری حسیت سے اچھی طرح شناسا معلوم ہوتے تھے۔

وکیل اختر کو چھپنے چھپانے سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ مزاجاً بوہیمین اور لااُبالی تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے بے حد غیر مطمئن تھے۔ ان کی بیوی کو دماغی مرض لاحق تھا۔ انتقال سے دو سال پہلے علاج کے سلسلے میں انھیں رانچی لے گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر انھوں نے وہاب اشرفی کو اپنی بیوی کی کیفیت بتائی تو وہاب اشرفی نے اپنی فطری شوخی کو بروئے کار لاتے ہوئے کہا "تم خوش نصیب ہو کہ تمھاری بیوی کے مرض کی تشخیص ہو گئی۔"

وکیل اختر ۳۶ سال سے زیادہ زندہ نہ رہے۔ انھوں نے انتقال سے دس ماہ پہلے دوسری شادی کی تھی۔ یہ شادی جذبات کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ وکیل اختر کے ذاتی حالات ایسے نہ ہوتے تو شاید روایتی شاعری کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔ زندگی کی آگ میں تپنے کے بعد ہی وہ عصری آگہی کی منزل سے گزرے اور انھوں نے ایسے اشعار کہے جو کسی بھی شاعر کے لیے سرمایۂ افتخار بن سکتے ہیں:

آپ سے جھک کے جو ملتا ہوگا
اُس کا قد آپ سے اُونچا ہوگا

اس شخص کے غم کا کوئی اندازہ لگائے
جس کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے

ہنس رہا تھا ابھی وہ ابھی مر گیا
موت اور زیست کا فاصلہ دیکھیے

عجب خامشی اس کے ہونٹوں پہ تھی
عجب شور اس کی نگاہوں میں تھا

وہ آ بھی جائے تو اس کو کہاں بٹھاؤں گا
میں اپنے گھر میں بھی رہتا ہوں بے گھروں کی طرح

شاعری کے باب میں وکیل اختر اس راہ پر چل پڑے تھے جو صحیح سمت کو جاتی ہے۔ ان کی آخری عمر کی غزلوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلد ہی اپنا انفرادی مقام حاصل کرلیں گے مگر موت ان کی راہ میں حائل ہو گئی۔

وکیل اختر کا قابلِ توجہ شعری سرمایہ بہت مختصر ہے۔ لیکن شعراء کی بھیڑ کے شوروشغب میں بھی ان کی آواز دبی دبی نہیں رہ سکتی۔

(مرتب: شہود عالم آفاقی، جولائی ۱۹۷۵ء)

وحید عرشی

یادوں کا زنداں

وحید عرشی اس جواں مرگ شاعر کا نام ہے، جو تمام عمر صلیب پر لٹکا رہا، کیونکہ غم حیات کی کیلیں اس کے دست و پا میں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ یادوں کے زنداں سے نکل بھاگنے کے ارادے کرتا رہا، لیکن اس کے گرد ایک اونچی دیوار ایستادہ تھی، اور وہاں سے باہر آنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ سوال الگ ہے کہ یہ دیوار معاشرے نے بلند کی تھی یا خود اس نے، یا اس کی ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب اپنے اپنے غموں میں اُلجھے ہوئے ہیں، وہ اپنی داستانِ درد انھیں سناتا رہا۔ کیونکہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ان سے بھی رجوع کرنا پڑتا ہے جو گراں گوش ہیں۔

وحید عرشی نے ۴۳ سال کی عمر میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے موند لیں۔ یہ عمر دنیا سے رخصت ہونے کی نہیں ہوتی، لیکن زندگی جھیلنے کی اذیت بذاتِ خود جاں گسل ہے۔ شاعر خود لہولہان ہو، لیکن اگر اس کی شاعری دوسروں کے زخموں کا مرہم نہیں بنتی تو بے توقیر ہو جاتی ہے۔ وحید عرشی کی شاعری میں فرد کا ہی نہیں، انجمن کا غم بھی شامل ہے۔ ان کے فن کے لمس سے دِلوں میں تازگی اور توانائی کے چراغ جل اُٹھتے ہیں۔

کمال جعفری ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ وہ وحید عرشی کا مجموعۂ کلام "یادوں کا زنداں" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ مجموعے کا نام خیال انگیز اور معنی خیز ہے:

(نئی دہلی، ۲۳ دسمبر ۱۹۹۰ء، اشاعت کتاب: ۱۹۹۱ء)

○○

کچھ اور رائیں

۱ آزاد گلاٹی

۲ احمد کمال پروازی

۳ اسعد بدایونی

۴ انور سدید

۵ بدیع الزماں خاور

۶ جمال اویسی

۷ حسنین عظیم آبادی

۸ حلیمہ فردوس

۹ دیپک بُدکی

۱۰ رشید امجد

۱۱ ساغر کرناٹکی

۱۲ سعید الظفر وسیم

۱۳ شاد باگل کوٹی

۱۴ شاہد جمیل

۱۵ شمیم انور

۱۶ ظفر گورکھ پوری

۱۷ عبدالاحد ساز

۱۸ عبدالصمد تپش

۱۹ عبید الرحمٰن

۲۰ عروج زیدی

۲۱ عثمان شاہد

۲۲ علیم صبا نویدی

۲۳ غلامْ رضوی گردش

۲۴ غلام مرتضی راہی

۲۵ غوث محمد غوثی

۲۶ فضا ابن فیضی

۲۷ قاضی مشتاق احمد

۲۸ کمال احمد صدّیقی

۲۹ کوثر صدیقی

۳۰ مبین صدّیقی

۳۱ مدحت الاختر

۳۲ مصوّر سبزواری

۳۳ مصرہ مریم

۳۴ نصیر احمد ناصر

۳۵ نعیم کوثر

۳۶ نور مُنیری

۳۷ ہمّت رائے شرما

آزاد گُلاٹی

"جسموں کا بن باس" کے مطالعے سے جو پہلا تاثر اُبھرا وہ یہ کہ آپ میرے احساس اور طرزِ احساس سے بہت قریب ہیں۔ آپ کا اسلوب جداگانہ ہے اور یہ ہونا ہی چاہیے۔ آپ کو اپنی ذات سے جو محبت ہے، اس کا اظہار کئی اشعار میں ہوا ہے۔ اسے عاشقانہ محبوبیت کہہ لیجیے ـــــ یعنی وہ کیفیت جو نرگسیت اور انانیت دونوں سے مختلف ہے:

اے دوست! پڑھ بھی لے، ترے دل کی کتاب پر
اپنے لہو کی بوند سے لکھا ہوا ہوں میں

بن کر ترے بدن کی مہک ہم بکھر گئے
تو جس طرف گیا، ہمیں ہم رہ گذر میں تھے

ترے جمال کی رعنائیاں نکھر آئیں
ترے خیال سے کچھ اس طرح بھی گذرا ہوں

آپ کے یہاں تازگی اور ندرت کے ساتھ احساس کی سچائی بھی ہے، اور اس کے پس پردہ گہرا فکر و شعور بھی۔ اس طرح کے اشعار محض طباعی یا روانیٔ طبع کے باعث نہیں کہے جاسکتے، جیسے آپ نے کہے ہیں۔ آپ کے کلام سے ایک ایسے شاعر کی تصویر اُبھرتی ہے جس نے نہ صرف چاہا ہے، بلکہ جسے چاہا بھی گیا ہے۔ محبت میں اگر ناکامی بھی ہوئی ہے تو شاعر کو زندگی کے وسیع تر مسائل پر غور کرنے اور اسے سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ اس سے اس کے دِل کو گداختگی ملی ہے اور اس کا احساسِ جمال اور نکھرا ہے:

تجھے گنوایا تو کتنے حسین شعر کہے
نہ راس آیا زیاں کوئی اس زیاں کی طرح

ہنسا ہوں آج تو مجبور تھا کہ تیرے حضور
مجھے یہ ڈر تھا اگر چپ رہا تو رو نہ پڑوں

اشعار پیش کرنے لگوں تو اُن کی تعداد بہت ہو جائے گی۔ طبیعت خوش ہوئی کہ اس مجموعے کے ذریعے صحیح معنوں میں ایک خوش کلام شاعر سے ملاقات ہوئی۔ آپ کی غزلیں رسائل میں باقاعدگی سے پڑھتا رہتا تھا۔ اُن میں اکثر اس مجموعے میں دوبارہ پڑھنے کا موقع ملا۔ لیکن مجموعے سے جو مجموعی تاثر اُبھرا ہے، وہ زیادہ خوش گوار اور پُر کیف ہے۔

آپ نے بعض فنی التزامات سے بڑا فائدہ اُٹھایا ہے۔ الفاظ کا اس طرح استعمال کہ وہ ایک خاص معنی میں استعمال ہو اور پھر تضاد بھی پیدا ہو جائے۔ کہیں یہ کہ وہ لفظ ہم معنی ہو، کہیں یہ تضاد معنوی نہیں بلکہ "بصری" ہو:

لہرا رہا ہے خون میں اب خواہشوں کا سانپ
زندہ کیا ہے تو اسے اب آ کے مار بھی

کندن بنا ہے سونا سا دل غم کی آنچ سے
اور آ گئے ہیں بالوں میں چاندی کے تار بھی

مجھے یقین ہے کہ آپ کی شاعری روز بروز ترقی کرتی جائے گی اور یہ ارتقا مجھے ہمیشہ مسرت سے ہمکنار کرتا رہے گا۔

(مجموعۂ کلام "جسموں کا بن باس" پر رائے۔ مکتوب، پٹنہ، ۱۰ ار دسمبر ۱۹۷۳ء)

○

آزاد گلاٹی غزل کے مطالبات و مسائل سے واقف ہیں۔ ان کا لہجہ نئی غزل کی تیزی اور تیز رفتاری سے آشنا ہونے کے باوجود کسی ناہموار راستے پر گامزن ہونے کا احساس نہیں دلاتا۔ ان کے یہاں جرأتِ اظہار ہی نہیں ندرتِ اظہار بھی ہے۔ افکار کے ساتھ ساتھ لفظیات کی تازہ دمی بھی ان کے کلام کو نکھارتی ہے۔ ان کے اشعار ہمیں نئی معنوی جہتوں سے آشنا کرتے ہیں۔

(مجموعۂ کلام "دشتِ صدا" پر رائے۔ مشمولہ "اذکار"، مجموعہ مضامین، ۱۹۸۷ء)

احمد کمال پروازی

آپ کا کلام پہلے بھی نظر سے گزرتا رہا ہے۔ اب یکجا دیکھ کر ایک مجموعی تاثر قائم کرنے میں مدد ملی۔ آپ نے کئی اچھے، زندہ، متحرک، توانا اشعار کی تخلیق کی ہے۔

آپ غزل کے رمز سے واقف ہیں، یہ بڑی بات ہے۔ ورنہ آج کل غزل کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے، غزل نہیں ہے۔

(پہلے مجموعۂ کلام "مختلف" پر رائے۔ مکتوب دہلی، مشمولہ "برقرار" مجموعۂ غزل، ۲۰۰۵ء)

اسعد بدایونی

میں آپ کی غزل گوئی کا قائل ہوں۔ اس کا برملا اور بے محابا اظہار کرنے میں مجھے کوئی باک یا تکلف نہیں۔ گزشتہ دس سال میں جو نئے غزل گو اعتبار کی منزلیں تیزی سے طے کر رہے ہیں، اُن میں تین چار ہی نام ہیں اور اُن میں سے ایک بلاشبہ آپ ہیں۔ آپ کی غزلوں میں تازگی، طرحداری اور رسیلا پن ہے جو آج کی غزل میں معدوم ہوتا جا رہا ہے۔

(مکتوب، سری نگر، ۲۸ر اپریل ۱۹۸۵ء، مشمولہ "جنوں کا کنارا"، مجموعۂ غزل ۱۹۹۲ء)

انور سدید

میں نے جب اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ یہ رواں دواں تحریر — ڈاکٹر وزیر آغا کی متنوع تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا اتنا خوبصورت جائزہ — میں تو پڑھتے پڑھتے مشاعروں کی داد کی طرح "واہ وا"، "سبحان اللہ" کرنے / کہنے لگا۔

("وزیر آغا: ایک مطالعہ" کے مصنف انور سدید کے بارے میں تاثر، مشمولہ "وزیر آغا کے خطوط، انور سدید کے نام"، ۱۹۸۵ء)

بدیع الزماں خاور

"موتی، پھول، ستارے" ایک عمدہ انتخاب ہے اور آپ کے کلام کی ہمہ جہتی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ادبی اور شعری محاذ پر آپ کی فعالیت کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔

خدا آپ کو مزید توفیق دے۔

(مجموعۂ کلام "موتی، پھول، ستارے" پر رائے۔ مکتوب، سری نگر، ۲۰ رمئی ۱۹۸۵ء،
مشمولہ "بدیع الزماں خاور: سات سمندر کا شاعر" مرتبہ: ساحر شیوی، جنوری ۱۹۸۸ء)

○

آپ کا تازہ مجموعہ بھرپور تازگی لیے ہوئے ہے۔ آپ نے مختلف شعری اصناف میں بڑی کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے، اس سے آپ کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

نثری نظم اور آزاد غزل دونوں اصناف میں اپنے احساسات اور تجربات کا اظہار کر کے آپ نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ آپ کا ذہن جدید سے جدید تر ہیئتوں کو قبول کرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتا۔

آزاد غزل کے ساتھ تو آپ کا نام شروع ہی سے وابستہ ہے۔

تازہ مجموعے میں آپ نے یہ بھی جدت کی ہے کہ ہر صنف کے تعلق سے اپنی شاعری پر بعض ناقدین سے اظہارِ خیال کرایا ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ان میں سے بیشتر تبصرے محنت سے لکھے گئے ہیں۔

یہ مجموعہ آپ کے شعری سفر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

(مجموعۂ کلام "سبز و تازہ نہالوں کے انبوہ میں"، مطبوعہ جون ۱۹۸۶ء پر رائے۔ مکتوب، سری نگر، ۱۲ رمئی ۱۹۸۷ء،
مشمولہ "بدیع الزماں خاور: سات سمندر کا شاعر" مرتبہ: ساحر شیوی، جنوری ۱۹۸۸ء)

جمال اویسی

اُردو کی موجودہ نسل کے شاعروں میں مجھے جمال اویسی بہت عزیز ہیں۔ اُن کی شاعری ایسے نقوش کی نشان دہی کرتی ہے، جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ شاعری اور تنقید دونوں کے ساتھ ان کا نیاز مندانہ اور بے نیازانہ رویّہ انھیں معتبر بناتا ہے۔

شعر میں تہہ داری کیا ہوتی ہے اور خیال کی پیچیدگی کو سادہ متغزلانہ اسلوب میں انفرادی تیور کے ساتھ کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے، اس کا نمونہ جمال اویسی کا یہ شعر ہے جو خاصا مشہور ہو چکا ہے:

بولتے بولتے چُپ ہو جانا
اور کہنا کہ نہیں کچھ بھی نہیں

ان کی نظم بھی موجود شعری منظر نامے میں بالکل الگ ذائقہ رکھتی ہے۔ نظم کا وہ مزاج، اور رنگ و آہنگ جسے راشد، میرا جی، مجید امجد اور اختر الایمان جیسے اکابر نظم نگاروں نے قائم کیا تھا، اُن کا کامیاب

تسلسل جمال اویسی کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں کو ان کے بطون میں پوشیدہ فکر و احساس کی روشنی میں مروّجہ تنقیدی اصطلاحوں اور رویوں سے الگ ہو کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ موضوعات کی نیرنگی اور اسلوب کی بوقلمونی ان کی نظموں کی خاص پہچان ہیں۔

حسنین عظیم آبادی (سیّد محمد حسنین)

"نوائے دید" کا گراں قدر تحفہ موصول ہوا۔ اندازِ بیان اتنا دلچسپ اور زبان اتنی رواں دواں ہے کہ اسے ایک ہی نشست میں پڑھ گیا۔ مرشد آباد کی کئی سو سال پرانی تاریخ نگاہوں کے سامنے پھر گئی۔
آپ سولہ کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ ادب سے یہ شغف اور لگن بڑی بات ہے۔
آپ نے تین ادبی نام کیوں اختیار کیے ـــــ ح۔م۔ اسلم عظیم آبادی، سیّد محمد حسنین اور حسنین عظیم آبادی؟

(مکتوب، دہلی، ۲۱ر جنوری ۱۹۹۴ء، مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی، یکم جولائی ۱۹۹۵ء)

حلیمہ فردوس

ماشاء اللہ! آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ سارے ہی مضامین دلچسپ ہیں۔ طرزِ تحریر شگفتہ ہے۔ طنز و مزاح کے پیرائے میں آپ نے کئی جگہ سماجی اور معاشرتی مسائل پر نشتر زنی کی ہے، اور اس پلِ صراط سے بحُسن و خوبی ("بخیر و خوبی" نہیں) گزری ہیں۔

(مکتوب بہ سلسلہ مجموعہ مضامین "ماشاء اللہ"،
مطبوعہ ۱۹۸۵ء، مشمولہ مجموعہ مضامین "بہر کیف" دسمبر ۲۰۰۲ء)

دیپک بُدکی

اپنی منصبی ذمہ داریوں کے باوجود آپ ادبی محاذ پر خاصے فعال ہیں اور آپ کے افسانے مختلف رسائل میں باقاعدگی سے دِکھائی دے رہے ہیں۔ ان افسانوں کا مجموعی معیار بلند ہے اور وہ معتبر سے معتبر رسالے میں جگہ پا سکتے ہیں۔ آپ کو کہانی کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ آپ کا بیانیہ چُست ہوتا ہے، مکالمے جاندار ہوتے ہیں اور کرداروں کی تصویر کشی چابک دستانہ ہوتی ہے۔

(مکتوب، ۷ر اگست ۲۰۰۳ء، مشمولہ "شاعر" ممبئی، "گوشۂ دیپک بُدکی" ستمبر ۲۰۰۴ء)

رشید امجد

رشید امجد نے ہماری جدید افسانہ نگاری کو نئے ڈائمنشنز (Dimensions) دیئے ہیں۔

(افسانوی مجموعہ "ریت پر گرفت" کے فلیپ پر رائے، اشاعت: راولپنڈی، جنوری ۱۹۷۸ء)

ساغر کرناٹکی

آپ کے دوہوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اچھے فن پاروں میں ہوتی ہیں۔ آپ کو دوہے کے فن سے فطری موانست اور قربت ہے۔ اس کا احساس آپ کے دوہوں کے مطالعے کے دوران قدم قدم پر ہوتا ہے۔

(دوہوں کے مجموعے "لہو شب" کے اشتہار میں، مطبوعہ "شاعر" ممبئی، اکتوبر ۲۰۰۳ء)

سعید الظفر وسیم

آپ کا کلام پاکیزگیٔ خیال اور نفاستِ اظہار کا آمیزہ ہے۔ آپ کے اکثر اشعار سہلِ ممتنع کا دلکش نمونہ ہیں۔

(مجموعۂ کلام "ریگِ رواں" پر رائے، مشمولہ "حرفِ رواں" شاعر کا تیسرا مجموعہ، دسمبر ۲۰۰۲ء)

شاد باگل کوٹی

سچ جانئے آپ کے دوہے پڑھ کر دِل کو ایک نیا سرور حاصل ہوا۔ واقعی اُردو کا کوئی خاص علاقہ نہیں۔ جو لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں وہ اُردو کے دوست نہیں۔ کرناٹک کے ایک غیر معروف علاقے میں آپ اُردو شعر و ادب سے اس قدر شغف رکھتے ہیں، یہ بذاتِ خود قابلِ قدر ہے۔ آپ کو دوہے کے آہنگ پر پوری دسترس ہے اور اس صنف کے لوازمات کو آپ نے خوبی سے برتا ہے۔ کئی دوہے کئی بار پڑھے۔

(مشمولہ "اعتراف": شاد باگل کوٹی کے دوہوں کا فنی جائزہ
مرتب: ڈاکٹر سید شاہ عقیل، نومبر ۲۰۰۱ء)

شاہد جمیل

''خوابوں کے ہمسائے'' ہر اعتبار سے پسند آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک قابلِ رشک شعری مجموعہ ہے۔ میں نے اپنے بہت سے عزیزوں اور دوستوں کو دکھایا کہ:

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

جو شعراء گذشتہ پندرہ بیس سال میں منظرِ عام پر آئے ہیں، ان میں آپ میرے معدودے چند پسندیدہ شاعروں میں ہیں۔ خصوصاً نظم نگاری کا آپ کو خاص ملکہ ہے اور غزلوں کی بھیڑ میں آپ کی نظمیں آج کی اُردو شاعری میں نمایاں ہیں۔

'جنوری' سے 'دسمبر' والی غزل اُردو میں بالکل نئی چیز ہے۔ طبیعت خوش ہوئی!

(مشمولہ: ''شاہد جمیل: شخص اور شاعر''
مرتب: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ۲۰۰۵ء)

شمیم انور

آپ بھیڑ سے الگ ہیں، یہ بڑی بات ہے۔ ابھی آپ کی شاعری کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کن رائے نہیں دی جاسکتی، لیکن مجھے آپ کی شاعری میں بڑے امکانات نظر آئے۔ برہمی، نفرت اور حقارت، جو آپ کے مزاج کے شناختی نشان ہیں، آپ کے کلام میں نمایاں ہیں۔ آپ نے بحر اور زبان کے مروّجہ اصولوں سے کہیں کہیں انحراف کیا ہے۔ اگر یہ ارادی اور شعوری ہے تو میں آپ کی پیٹھ تھپتھپاؤں گا۔ اگر غیر شعوری ہے تو خطرات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھوں گا۔ میں شاید خود نہ لکھوں لیکن مجھے ''پُرتھکن'' جیسی ترکیبوں پر کوئی اعتراض نہیں۔

آپ نے کلیم الدین احمد کی طرح نظموں کے عنوانات سے گریز کیا ہے، حتیٰ کہ کتاب میں صفحہ نمبر بھی نہیں ہے۔ نیا پن پیدا کرنے کی یہ سب کوششیں غیر مستحسن نہیں ہیں۔

پیش کش کے اعتبار سے بھی کتاب دیدہ زیب ہے۔ سچ جانئے، بحیثیت مجموعی آپ سے قربت کا احساس ہوا۔

(پٹنہ۔ ۲۹ نومبر ۱۹۷۴ء، مجلّہ اُردو سوسائٹی ضیا برج،
شمیم انور نمبر، جون ۱۹۷۵ء)

ظفر گورکھپوری

آپ کا ارسال کردہ گراں قدر تحفہ ''گوکھرو کے پھول'' موصول ہوا۔ اس توجہ کے لیے شکر گزار ہوں۔ مجروح بھائی کا دیباچہ ''کتاب نما'' میں پڑھ چکا تھا اور یہ مجموعہ دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

آپ کے کلام کا نقش گذشتہ تیس سال سے ذہن پر مرتسم ہے۔ آپ کی غزلوں کا عمومی رنگ داخلیت اور خارجیت کے امتزاج کا پروردہ ہے اور اس لیے اس میں ذات اور کائنات کی بوقلمونی جلوہ ریز ہے۔ آپ کا کلام آپ کی سماجی اور سیاسی بصیرت کا آئینہ ہے۔ یہ شاعری ہمارے ذہن کے تاروں کو مرتعش کرتی ہے اور ہماری جوابی صلاحیتوں کو چھوتی ہے۔

(مکتوب، سری نگر، ۳ راگست ۱۹۸۶ء، مشمولہ سہ ماہی ''انتساب'' سرونج، ظفر گورکھپوری نمبر، ۱۹۹۷ء)

عبدالاحد ساز

بمبئی میں آپ نے اپنی شعری تصنیف ''خموشی بول اٹھی ہے'' مرحمت فرمائی۔ اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ بمبئی سے واپس آتے ہوئے سفر کے دوران ہی مجموعہ شروع سے آخر تک دیکھ گیا تھا۔ مجموعی تاثر بہت اچھا ہے۔ آپ کا اسلوب عصری شاعری کے عمومی لب ولہجہ سے مختلف نظر آتا ہے، جو بذاتِ خود لائقِ تحسین ہے۔ آپ کی غزلیہ شاعری کا سلسلۂ نسب کہیں کہیں غالبؔ سے ملتا ہے۔ ایک تو آپ نے غالبؔ کی کئی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں، دوسرے کہیں کہیں آپ کی ترکیبیں بھی اسی نوعیت کی ہیں۔ ''حاجتِ رفو کیا ہے'' والی غزل پر تو غالبؔ کا اثر بہت واضح ہے۔ خدا کرے غالبؔ سے یہ قربت آپ کی شاعری کو مزید صلابت عطا کرے۔ آپ کی نظمیں آپ کی قدرتِ شعر گوئی کا بے محابا اظہار ہیں۔ یہ مجموعہ قرار واقعی پذیرائی کا مستحق ہے، لیکن مجھے ناقدوں پر بھروسہ نہیں، اور قاری صفحۂ ہستی سے نابود ہوتا جارہا ہے۔

(مکتوب، دہلی، ۱۳ رفروری ۱۹۹۱ء، مشمولہ سہ ماہی ''تکمیل'' بھیونڈی، اپریل تا جون ۱۹۹۶ء)

عبدالصمد تپش

آپ کے اشعار کی دلنوازی سے متاثر ہوتا رہا ہوں۔ آپ کے تازہ کلام سے ارتقا پذیری کا اندازہ

ہوتا ہے۔ اس میں ایک تابناکی اور تازگی ہے اور کہیں سے شاعر کی تھکن کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔

(مشمولہ اشتہار مجموعہ غزل "متاعِ آئندہ"، "شاعر" ممبئی، جنوری ۲۰۰۲ء)

عبید الرحمٰن

مجھے اعتراف کرنے دیجئے کہ میں آپ کے کلام سے زیادہ آشنا نہ تھا۔ مجموعہ دیکھا تو طبیعت خوش ہوگئی۔ آپ کے کلام کی خوش آہنگی اور نفاست بہ یک نظر متوجہ کرتی ہے۔ آپ کو اظہار کا جو سلیقہ ودیعت ہوا ہے، وہ آپ کے روشن مستقبل کا ضامن ہے۔ میں عمر کی ایسی منزل میں ہوں جب دعائیں دینے کا حق مجھے حاصل ہوگیا ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ اسی طرح اپنے محسوسات، مشاہدات اور تجربات کو شعری پیکر میں ڈھالتے رہیں اور زیادہ سے زیادہ تخلیقی کامرانیوں سے ہمکنار ہوں۔

(مکتوب، دہلی، ۱۰ اراگست ۲۰۰۱ء)

عروج زیدی

عروج زیدی کی شاعری فنی استقامت اور فکری صلابت کی تابندہ مثال ہے۔ ان کے کلام میں زندگی کے تجربات اور حادثات کا پُر اثر اظہار ہوا ہے۔ اُن کے لہجے میں ایک خاص شائستگی اور دل آسائی ہے۔ مگر وہ نثر کے بھی مزاج داں ہیں۔ عروج زیدی کی کتاب "زندہ کتبے" کو میں ایک وقیع تصنیف شمار کرتا ہوں۔ جن شخصیتوں پر انھوں نے قلم اُٹھایا ہے، ان کے کردار کی تمام خوبیوں کو شگفتہ، دلچسپ اور رواں دواں نثر کے ذریعہ کمال خوبی سے پیش کیا ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ ہمارے یہاں اُردو میں لکھنے والے بہت ہیں، لیکن اُردو لکھنے والے خال خال ہیں۔ عروج زیدی جیسی اُردو لکھنے والے اب باقیات الصالحات میں ہیں۔

(ماہ نامہ "سہیل" گیا، جلد ۵۶، شمارہ ۱۲، اشاعت: مارچ ۱۹۹۹ء)

عثمان شاہد

آپ کی مرتب کردہ یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ دھارواڑ میں آپ نے علم وادب اور تہذیب کی جو شمع جلا رکھی ہے خدا کرے اس کی لَو ہمیشہ اُونچی رہے۔

(نظموں کے انتخاب "قومی یکجہتی" کا اشتہار، مطبوعہ "شاعر" ممبئی، جنوری ۲۰۰۴ء)

علیم صبانویدی

علیم صبانویدی کا احساس اور طرزِ احساس نئی حسیت سے ہم آہنگ ہے۔

(مجموعۂ کلام "فکر بر" مطبوعہ ۱۹۸۱ء پر رائے، مشمولہ "غزل زاد" آزاد غزلوں کا مجموعہ، ۲۰۰۵ء)

O

علیم صبانویدی نے آزاد غزل کی مروّجہ تکنیک سے انحراف کیا ہے۔ ان کی آزاد غزلوں کو ہم پابند آزاد غزلیں کہہ سکتے ہیں۔

(آزاد غزلوں کے پہلے مجموعے "رد کفر" مطبوعہ ۱۹۷۹ء کے بارے میں رائے۔

مشمولہ "غزل زاد" آزاد غزلوں کا مجموعہ، ۲۰۰۵ء)

O

ہائیکو تین مصرعوں/سطروں کی چھوٹی چھوٹی نظمیں ایک الگ ذائقہ رکھتی ہیں۔ بعض نظموں کا تاثر مخصوص کیفیت کا حامل ہے۔ تنگ نائے سخن کو نئے آفاق سے آشنا کرانے کے سلسلہ میں آپ کی مساعی جمیلہ بھی ہیں اور جلیلہ بھی۔

(ہائیکو نظموں کے مجموعے "ترسیلے" مطبوعہ ۱۹۸۶ء کے بارے میں رائے۔ مشمولہ "شعاعِ مشرق" ہائیکو نظموں کا مجموعہ، مارچ ۱۹۸۷ء اور "مطالعہ علیم صبانویدی" مرتبہ: کاظم نائطی، ۲۰۰۵ء)

غلام رضوی گردش

آپ کو خاکے لکھنے کا ایک خاص سلیقہ ہے جو میرے لیے قابلِ رشک ہے، کیونکہ میں نے بھی شخصی خاکے لکھنے کی چند ایک کوششیں کی ہیں۔

(فلیپ "دیارِ خوش نفساں"، ۲۰۰۲ء)

غلام مرتضیٰ راہی

آپ کی شاعری کا مطالعہ میں بڑے ذوق و شوق سے کرتا ہوں۔ مجھے اپنی شاعری کی بابت کوئی

خوش فہمی نہیں، لیکن اگر میری پسند کی کوئی وقعت ہوسکتی ہے تو یہ عرض کرنے دیجیے کہ میں گزشتہ چھ سال میں نمایاں ہونے والے غزل گوشاعروں میں سب سے زیادہ آپ کو اور مصوّر سبزواری کو پسند کرتا ہوں۔

(مشمولہ مجموعہ غزل "حرفِ مکرر"، "لامکاں" اور "لاریب" کی غزلیں، فروری ۱۹۹۷ء)

غوث محمد غوثی

آپ کا کلام دیکھا تو اپنی کم علمی پر شرمندگی ہوئی کہ آپ جیسے پختہ مشق اور خوش گو شاعر کے نام اور کام سے اب تک ناواقف رہا۔ علی گڑھ یا اس کے آس پاس ہوتا تو ہرگز اتنا کم علم نہ ہوتا، لیکن اگر اجازت ہو تو عرض کروں کہ مجھ جیسوں کو بے خبر رکھنے میں آپ کا بھی قصور ہے۔ آپ نے اپنے کلام کو مناسب طور پر شائع ہونے کا موقع ہی نہیں دیا اور اپنی شہرت کی جانب سے قطعی بے نیاز رہے۔ ضرورت ہے کہ آپ کا کلام زیادہ سے زیادہ ادب دوستوں تک پہنچے اور "ناقدینِ ادب" آپ کی شاعری کی جانب پوری توجہ فرمائیں۔

رسمی تعریف نہیں کرتا، میں واقعی آپ کی شاعری سے بہت متاثر ہوا۔ آپ نے مشکل زمینوں اور قافیوں میں بھی بڑے شگفتہ اشعار نکالے ہیں۔ میں آپ کو اپنا ہم عصر سمجھتا ہوں۔ آپ مجھ سے صرف دو تین سال بڑے ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے، آپ نے اپنا مجموعہ "عکسِ آئینہ" بھجوا کر مجھے خوش کیا۔ دوسرے مجموعۂ کلام کا منتظر رہوں گا۔

(مکتوب سری نگر، مشمولہ مجموعہ غزل "دھنک لہجے کی"، ۱۹۹۱ء)

فضا ابن فیضی

آپ کی شاعری کا پُروقار لہجہ مجھے ہمیشہ متاثر کرتا رہا ہے۔ کم و بیش پچیس سال سے آپ کو باقاعدگی کے ساتھ پڑھ رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں، ان سے پوری طرح باخبر ہوں۔ دراصل ہماری تنقید افراد کے گرد گھومتی رہی ہے۔ تخلیقات کی پرکھ عموماً ہمارے تنقید نگاروں کا شیوہ نہیں رہا ہے۔ آپ کی طرح گہرائی، گیرائی، وسعتِ تفکّر اور معنوی بصیرت کتنوں کے کلام میں ہے! مگر آپ تو کسی حلقے سے وابستہ نہیں ہیں۔ تنقید نگاروں کو آپ سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے! لیکن وقت سب سے بڑا منصف ہے، وہ کھرے اور کھوٹے دونوں کو ایک دن الگ کردے گا اور تب لوگ کہیں گے کہ آج کا تنقید نگار سچے فن کاروں سے کتنا دُور تھا۔

(مکتوب سری نگر، مشمولہ "توازن" مالیگاؤں، فضا ابن فیضی نمبر، اشاعت: نومبر ۱۹۹۰ء)

قاضی مشتاق احمد

آپ کی کتاب "اُردو شاعری: کل، آج اور ہمیشہ" میں نے شروع سے آخر تک دیکھی۔ آپ کی محنت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ۲۶۲ صفحات میں پوری اُردو شاعری کی جھلک دِکھانا آسان نہیں۔ آپ فکشن کی ایک معتبر شخصیت ہیں اور اب اُردو شاعری کو اپنے مطالعے کا محور بنا رہے ہیں۔ آپ نے بڑے انکسار کے ساتھ "پہلا ورق" میں اپنے اس انتخاب کے ضروری نکات بیان کیے ہیں۔ آپ کے پس منظر اور آپ کے نئے ذوق وشوق کے پیش منظر کو دیکھتے ہوئے آپ کی کاوش مستحسن ہے۔ چند باتوں کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں:

- رام پرساد بسمؔل کے نام سے جو اشعار منسوب ہیں خصوصاً "سرفروشی کی تمنا......" وہ ان کے نہیں ہیں۔ وہ شعر کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ ایک تخلص اختیار کر رکھا تھا اور دوسروں کے اشعار اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتے تھے۔ پھانسی پر جانے سے پہلے یہ اشعار ان کی زبان پر تھے۔ دراصل یہ اشعار بسمؔل عظیم آبادی کے ہیں جو شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ سردار جعفری نے اپنی کتاب "سرمایۂ سخن" میں بھی اس مطلع کو بسمؔل عظیم آبادی سے ہی منسوب کیا ہے۔ اس عام غلطی کی تصحیح ہونی چاہیے۔
- گلشن کھنہؔ کا مطلع پورے کا پورا سرقہ ہے۔ سلطان اخترؔ کی مشہور غزل ہے اور اس کا مطلع بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ گلشن کھنہؔ نے معمولی سی تبدیلی کر دی ہے۔ اصل شعر یہ ہے:

ہرا شجر نہ سہی، خشک گھاس رہنے دے
زمیں کے جسم پر کوئی لباس رہنے دے

یہ غزل کم وبیش ۲۵ سال پرانی ہے اور "شب خون" میں چھپ چکی ہے۔ سلطان اخترؔ کے مجموعے میں بھی شامل ہے۔

مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنی کتاب میں "آزاد غزل" کو اچھی خاصی Coverage دی۔ میری آزاد غزل کے تین شعر بطور نمونہ اور اسے پابند کرنے کی کوشش (رؤف خیر)، نذیر فتح پوری کی آزاد غزل کی تضمین، مجروحؔ سلطان پوری کا آزاد غزل کا تصوّر (جو ہر چند صحیح نہیں ہے)، زرینہ ثانی کی آزاد غزل اور آزاد غزل کے بارے میں میری اور کرامت علی کرامت کی رائیں۔ اور کیا چاہیے!

(مکتوب دہلی، مشمولہ سہ ماہی "رنگ" دھنباد، "گوشۂ قاضی مشتاق احمد" اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۰۲ء)

کمال احمد صدیقی

میں نے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کی کتاب "کشمیر ایک منظر نامہ" کا مسودہ شروع سے آخر تک پوری توجہ کے ساتھ پڑھا، اور حق یہ ہے کہ بہت متاثر ہوا۔ کمال احمد صدیقی ۱۹۵۱ء سے ہی کشمیر میں رہے، کم وبیش پچیس سال، اور انھوں نے وہاں کی سیاسی اُتھل پتھل، نشیب وفراز اور مدّوجزر کا براہِ راست مشاہدہ کیا، اور بعض معاملات میں وہ خود بھی دخیل رہے، اس لیے ان کے بیانات ایک طرح استنادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اہلِ سیاست کی مصلحتیں ہوتی ہیں، اور وہ سچائیوں کو کبھی پوری طرح منظرِ عام پر آنے نہیں دیتے، خصوصاً جب ان کی بہت سی کارروائیاں اور فیصلے اُن کی ضمیر کی آواز کے مطابق نہ ہوں۔ کمال احمد صدیقی کی ایسی مصلحتیں نہیں ہیں، اس لیے انھوں نے شیخ محمد عبداللہ کی خودنوشت "آتشِ چنار" کی روشنی میں کشمیر کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ نہایت معروضی انداز میں کیا ہے۔

کتاب کی نثر بے حد سلیس، رواں دواں اور دلکش ہے۔ اسلوب شگفتہ اور دلچسپ۔ کتاب ایک بار شروع کی جائے تو آخر تک چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں خود بھی کشمیر میں چودہ پندرہ سال رہا ہوں۔ شیخ محمد عبداللہ کی وزاتِ عظمیٰ کے چھ سال دیکھے ہیں۔ پھر ان کے صاحبزادے ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور داماد غلام محمد شاہ کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے کا براہِ راست شاہد رہا ہوں۔ ان سب کے یہاں باریابی کی سعادت بھی حاصل رہی ہے، اس لیے میں کمال احمد صدیقی کی کتاب میں پیش کردہ واقعات کو زیادہ حقیقی ماننے پر مجبور ہوں۔

(دہلی، ۲۶ردسمبر ۱۹۹۴ء)

کوثر صدیقی

ثلاثی سے حمایت علی شاعر کا نام وابستہ ہے۔ ہندوستان میں کسی شاعر کے ثلاثی کا مجموعہ، میرے خیال میں، شائع نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے "جیب میں پتھر" آپ کی پہلی کاوش ہے۔ میں ذاتی طور پر ان تین مصرعوں والی اصناف ہائیکو، ماہیا، ثلاثی وغیرہ سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہوں۔ ان خیالات کو غزل کے دو مصرعوں میں شاید مناسب طور پر ادا کیا جاسکتا ہے۔ شاعر کو آزادی حاصل ہونی چاہیے، اس لیے ہر صنف کی قدر و قیمت ہے۔ مگر ان اصناف کے سلسلے میں (یعنی ہائیکو اور ماہیا کے

سلسلے میں) جو "بھیڑ چال" ہے، اس سے مجھے تکدر ہوتا ہے۔ ثلاثی ایسی صنف ہے جس کی طرف ہمارے شاعروں کی توجہ تقریباً نہیں ہے۔ اس لیے آپ کے مجموعے کی شناخت قائم ہونی چاہیے۔ آٹھ سو سے زیادہ ثلاثی کہنا آپ کی اعلیٰ قوتِ شعری کا ثبوت ہے۔

(مکتوب دہلی، مشمولہ "اعتراف" کوثر صدیقی: فن اور شخصیت، مرتبین: صباحت سلمان، روی جعفری، ۲۰۰۳ء)

مبین صدیقی

تمھیں ڈرامے کی صنف سے خاص تعلقِ خاطر ہے، اور تم اس میں اپنے طور پر تجربے کرتے رہتے ہو۔ خدا کرے تمھارا یہ ذوق وشوق برقرار رہے، اور تم اپنے امکانات کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہو۔

(تجرباتی ڈراموں کے مجموعے "سائنٹسٹ" پر رائے، مکتوب دہلی، ۳۰ر جون ۱۹۹۸ء، مشمولہ "سحرِ مبین" تصوراتی ڈرامے، ۲۰۰۴ء)

مدحت الاختر

مدحت الاختر موجودہ دَور کے ایک قابلِ قدر شاعر ہیں۔ بیان کی ایسی بے تکلفی آج کی شاعری میں شاذ ہی دِکھائی دیتی ہے۔ ایسا مانوس لہجہ، ایسی جانی پہچانی فضا اور ہر شعر آنکھ ملا کے بات کرتا ہوا۔ شروع سے آخر تک یکساں رفتار سے سفر طے کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے بڑی ذہنی ریاضت اور جذباتی طہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

(دہلی، ۳ر جون ۲۰۰۴ء)

مصوّر سبزواری

آپ کا کلام رسائل میں بڑی توجہ اور اشتیاق سے پڑھتا رہا ہوں۔ اس وقت کے نئے غزل گویوں میں آپ کا مقام معتبر اور محفوظ ہے۔

(مکتوب سری نگر، مشمولہ "برگ آتش سوار"، غزلیں، فروری ۱۹۸۳ء)

مصرہ مریم

آپ کا ارسال کردہ گراں قدر تحفہ "حامدی کاشمیری: حیات اور شاعری" موصول ہو گیا تھا۔ آپ نے ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔ حامدی کاشمیری کے خاندانی حالات اور خود ان کی زندگی کے احوال و کوائف کا اتنا پُر خلوص، دیانت دارانہ اور دردمندانہ بیان کسی اور سے ممکن نہ تھا۔ آپ نے یہ حصہ اتنی خوبی سے قلم بند کیا ہے کہ کشمیر کی پوری تاریخ بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، اور یہ سب کچھ اتنے دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے کہ ایک بار پڑھنا شروع کیجیے تو پھر تحریر کے بہاؤ میں بہتے ہی جائیے۔

حامدی کی شاعری کا ایسا خوبصورت اور دلنواز محاکمہ اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزرا تھا، اور اتنی باریک بینی کے ساتھ اس تجزیاتی انداز میں لکھنا شاید کسی اور کے لیے ممکن بھی نہیں۔ آپ کی نثر ایسی شائستہ اور رشتہ، نوک پلک سے درست بلکہ سادگی سے سنواری ہوئی ہے کہ بے اختیار منہ سے واہ نکلتی ہے۔ میں تو ایسی شفاف، رواں نثر کو اب ترس گیا ہوں۔

مجھے شرمندگی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنے دیجیے کہ میں آپ کی اتنی اعلیٰ ادبی صلاحیت سے واقف نہ تھا۔ اس کتاب کی اشاعت پر بہت بہت مبارک باد۔ دونوں ابواب کو اس پاکیزگی کے ساتھ الگ الگ رکھا گیا ہے کہ انھیں علیحدہ علیحدہ بھی کتابی صورت میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ محبی حامدی کو بھی مبارک باد کہ انھیں آپ جیسا رفیقِ حیات ملا۔

(مکتوب دہلی، مشمولہ سہ ماہی "جہات" کشمیر، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۳ء)

نصیر احمد ناصر

آپ کے یہاں جو فنی ضبط، توانائی اور تازگی ہے وہ آج کے نظم نگاروں کے یہاں خال خال ہی دِکھائی دیتی ہے۔

(فلیپ، مجموعہ کلام "پانی میں گم خواب"، جنوری ۲۰۰۲ء)

نعیم کوثر

میں آپ کا پرانا قاری ہوں۔ زبان و بیان کے علاوہ مسائلِ حیات پر آپ کی گرفت مضبوط

ہے۔آپ کے یہاں ایک ایسی دردمندی ہے جو آج کی کہانیوں میں معدوم ہوتی جارہی ہے۔

(مکتوب مشمولہ گوشۂ نعیم کوثر "شاعر" ممبئی، اگست ۲۰۰۵ء)

نور مُنیری

مجھے افسوس ہے کہ آپ کے کلام سے زیادہ واقف نہ تھا۔آپ تو خاصے سینئر شاعر ہیں، بلکہ میرے قریب العمر ہیں۔آپ کے کلام سے آپ کی کہنہ مشقی اور پختگی عیاں ہے۔اس مجموعے کو کافی پہلے آجانا چاہیے تھا۔اس کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

(مکتوب دہلی، ۲۴ر جولائی ۱۹۹۹ء، مجموعۂ کلام "یادوں کے زخم" ۱۹۹۹ء کے بارے میں رائے،
مشمولہ مجموعۂ کلام "شہر کی فصیلوں سے" اشاعت: اپریل ۲۰۰۲ء)

ہمّت رائے شرما

"شہابِ ثاقب" ایک ایسے شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جس کی آنکھیں گرد و پیش کے احوال کو اچھی طرح دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ہمّت رائے شرما نہ صرف لہجے کے اعتبار سے پختہ کار ہیں، بلکہ وہ زندگی کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کا براہِ راست تجربہ بھی رکھتے ہیں۔عہد شناسی اور حالات فہمی نے انھیں دردمندانہ احساس بخشا ہے جو مجروح دل کی ترجمانی کرنے پر قادر ہے۔ ہمت رائے شرما کے یہاں جذبہ و احساس کی ترتیب و ترسیل کے سلسلے میں نیاپن اور تازگی ملتی ہے۔ان کا کلام فنی اسقام سے پاک، غیر پیچیدہ اور روایت چشیدہ ہے۔

("سہیل" گیا، جلد ۵۶، شمارہ ۱۲، اشاعت: مارچ ۱۹۹۷ء)

OO

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کی اہم مطبوعات ایک نظر میں

ادب و تنقید

کتاب	مصنف
تاریخ ادب اردو (آغاز سے انیسویں صدی نصف تک) (چار جلدوں پر مشتمل)	جمیل جالبی
مثنوی کدم راؤ، پدم راؤ	جمیل جالبی
ارسطو سے ایلیٹ تک	جمیل جالبی
نئی تنقید	جمیل جالبی
ادب، کلچر اور مسائل	جمیل جالبی
محمد تقی میر	جمیل جالبی
معاصر ادب	جمیل جالبی
ادبی تحقیق	جمیل جالبی
میراجی ایک مطالعہ	جمیل جالبی
تنقید و تجربہ	جمیل جالبی
قومی ڈکشنری (انگلش، اردو)	جمیل جالبی
ایلیٹ کے مضامین	جمیل جالبی
بوطیقا (تصنیف ارسطو) ترجمہ	جمیل جالبی
نہ ہوئی قرولی (طنز و مزاح)	جمیل جالبی
بارہ کہانیاں (بچوں کا ادب)	جمیل جالبی
حیرت ناک کہانیاں (//)	جمیل جالبی
ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ	گوہر نوشاہی
شاہ عالم ثانی آفتاب احوال و ادبی خدمات	ڈاکٹر خاور جمیل
گوپی چند نارنگ حیات و خدمات	ڈاکٹر سید حامد علی
اسلوبیات میر	پروفیسر گوپی چند نارنگ
اقبال کا فن	پروفیسر گوپی چند نارنگ
انیس شناسی	پروفیسر گوپی چند نارنگ
سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ
ادبی تنقید اور اسلوبیات	پروفیسر گوپی چند نارنگ
امیر خسرو کا ہندوی کلام	پروفیسر گوپی چند نارنگ
اردو افسانہ روایت اور مسائل	پروفیسر گوپی چند نارنگ
سفر آشنا	پروفیسر گوپی چند نارنگ
جدیدیت کے بعد	پروفیسر گوپی چند نارنگ
دیدہ ور نقاد: گوپی چند نارنگ	ڈاکٹر شہزاد انجم
تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ	شمیم حنفی
اردو کی ظریفانہ شاعری اور اسکے نمائندے	فرمان فتح پوری
اردو نثر کا فنی ارتقاء	فرمان فتح پوری
اردو شاعری کا فنی ارتقاء	فرمان فتح پوری
اقبال سب کے لئے	فرمان فتح پوری
تاریخ ادب اردو (ابتداء سے ۲۰۰۰ تک) (تین جلدوں پر مشتمل)	وہاب اشرفی
تاریخ ادبیات عالم (سات جلدوں پر مشتمل مکمل سیٹ)	وہاب اشرفی
قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ	وہاب اشرفی
معنی کی تلاش	وہاب اشرفی
آگہی کا منظر نامہ	وہاب اشرفی
راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری	وہاب اشرفی
شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری	وہاب اشرفی
حرف حرف آشنا	وہاب اشرفی
اردو فکشن اور تیسری آنکھ	وہاب اشرفی
تفہیم البلاغت	وہاب اشرفی
کاشف الحقائق	وہاب اشرفی
میر اور مثنویات میر	وہاب اشرفی
مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات	وہاب اشرفی
معنی سے مصافحہ	وہاب اشرفی
وہاب اشرفی شخصیت اور فن	ڈاکٹر مناظر حسن
وہاب اشرفی: منفرد نقاد اور دانشور	ڈاکٹر ہمایوں اشرف
نکتہ نکتہ تعارف (پروفیسر وہاب اشرفی کے تبصرے اور تقاریظ)	مرتب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف
وہاب اشرفی: منفرد نقاد و دانشور	مرتب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف
مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات (ایک جائزہ)	منصور عمر
اردو صحافت: مسائل اور امکانات	ڈاکٹر ہمایوں اشرف
منٹو ایک لیجنڈ	ڈاکٹر ہمایوں اشرف
منظوم جائزے (پروفیسر وہاب اشرفی کی تصنیفات و تالیفات)	ڈاکٹر عبدالمنان طرزی
ہندوستانی محاورے	محمد حسن
ہندوستانی شاعری	محمد حسن
ہندی ادب کی تاریخ	محمد حسن

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 091-011-23211540
E-mail : ephdelhi@yahoo.com